سیرت اشرف

منشی عبدالرحمٰن خانؒ

شیخ اکیڈمی۔ بل روڈ۔ لاہور

سیرتِ اشرف

کہیں مدّت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

سیرتِ اشرف

یعنی

سوانعمری حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح

جلد دوم

مؤلفہ

منشی عبدالرّحمان خاں

ناشر

شیخ اکیڈمی، ۶، بل روڈ ○ لاہور

بار اوّل .... ستمبر ۱۹۷۹ء

ناشر ..... محمد طارق

مطبع .... ندیم یونس پرنٹرز لاہور

کتابت ... محمد شریف منیر رقم (میرووالی)

قیمت -/۳۳ روپے

ترتیب

حصّہ سوم ـــــــ اصُولِ زندگی

۳۶۔ خانقاہ امدادیہ

۳۷۔ تصوّف

۳۸۔ مجاہدۂ نفس

۳۹۔ راحت رسانی

۴۰۔ تعلیم و تربیت

۴۵۔ مکاتبت

۴۶۔ تحفظِ حقوق

۴۷۔ دیانت و شرافت

۴۸۔ اختلاف و التفات

۴۹۔ ذکر و فکر

۵۰۔ تخیلِ پاکستان

۵۱-صلاحِ معمارِ پاکستان

۵۲-آئینی سرگرمیاں

۵۳-سیاسی کشمکش

حصہ چہارم — انجامِ زندگی

۵۴۔ اہتمامِ اصلاحِ امت

۵۵۔ مجازین صحبت و بیعت

۵۶۔ تصنیفات و خطبات

۵۷- اہل و عیال

۵۸۔ اہتمام سفر آخرت

۵۹۔ علالت و رحلت

۶۰ - اعترافِ عظمت

اصولِ زندگی

خانقاہِ امدادیہ

حقیقتِ خانقاہ خانقاہ ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی تربیت گاہ کے بھی ہیں۔ جہاں کتاب وسنت کے مطابق تزکیۂ نفس و صحتِ اخلاق کی عملی تعلیم دی جاتی ہو۔ اس کی بہترین مثال اصحابِ صفہ کی تربیت گاہ تھی۔ جس میں خود سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عملی تعلیم وتربیت فرماتے تھے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم وتربیت کی ندرت و جامعیّت کے پیشِ نظر ہر دور میں اہل اللہ نے اپنے علاقہ میں ایسی تربیت گاہیں قائم کیں۔ جن میں رشد وہدایت کے چشمے اُبلتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ عجمی تصوف و رہبانیت کا ان پر کچھ ایسا کہر چھایا کہ ان کی اصلیت وحقیقت ہمیشہ کے لیے مستور ہو کر رہ گئی۔ گو اس گہرے کہر میں چشمِ بینا اکثر وبیشتر حقیقی خانقاہوں کا فی الفور پتہ لگا لیتی۔ مگر چشمِ ظاہر بین شاذ ہی وہاں تک پہنچ سکتی۔ اس لیے جب بھی یہ لفظ کہیں نظر آتا ہے۔ تو ذہن انسانی فی الفور غلط تصورات کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی عملی مثالیں اسی مادی دنیا میں بھی موجود ہیں۔ جہاں مختلف علوم وفنون کی علمی وعملی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے۔

وجہ تسمیہ تھانہ بھون کی دینی تربیت گاہ کی بنیاد شیخ طریقت حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی۔ جو اپنے زمانہ کے اعظم مشائخ و علماء میں سے تھے۔ ان کا شمار اس دور کے "اقطاب ثلاثہ" میں ہوتا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت حافظ محمد ضامنؒ ان کے پیر بھائی تھے۔ یہ تینوں حضرات اسی خانقاہ میں ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ مشائخ میں "معرفت گاہ" کہلاتی تھی۔

مولانا شیخ محمد ۱۲۹۶ھ میں وفات پا گئے۔ حضرت حافظ محمد ضامنؒ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں ایک فرنگی کی گولی سے شہید ہوئے۔ اور اس انقلاب کے زمانہ میں حضرت حاجی صاحب مکہ معظمہ کو ہجرت فرما گئے۔ جس کی وجہ سے خانقاہ بے رونق ہو گئی۔

حضرت تھانویؒ نے اپنے شیخ کے ایماء پر ۱۳۱۵ھ میں آکر اسے پھر سے آباد کرنا شروع کیا۔ حضرت حاجی صاحب چونکہ اسی خانقاہ کے حجرہ میں رہائش رکھتے تھے۔ جو اب تک موجود ہے اس لیے اس کے صحن مسجد اور خانقاہ کی عمارت میں بہت زیادہ اضافہ کر کے اس مجموعہ کا نام حضرت حاجی صاحب کے ہی اسم مبارک پر "خانقاہ امدادیہ" رکھ دیا۔ جسے بعض ناواقف حضرات حاجی صاحب کا مزار تصور کرتے ہیں اور بعض کم فہم امدادِ باہمی کا ادارہ سمجھتے ہیں۔

وسعت خانقاہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی جب پہلی مرتبہ ۳۰ جون ۱۹۲۸ء کو تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ تو انہوں نے اپنے جائزہ کی بناء پر اپنی کتاب "حکیم الامت" میں اس کی وسعت کی یہ کیفیت درج فرمائی:-

خانقاہ کی عمارت قصبہ کے بالکل مغربی سرحد پر ہے۔
اس کے بعد اس لائن میں کوئی آبادی نہیں۔ کوئی دو فرلانگ

پرتاوُن کا ریلوے سٹیشن ہے ۔ قصبہ کی اکثر پرانی شاندار عمارتوں
کی طرح سڑک بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھڑنجے کی ہے ۔ جو
عین خانقاہ کے دروازہ تک آتی ہے ۔ پھاٹک کے اندر ایک
وسیع صحن کنارے کنارے چاروں طرف پختہ برآمدہ یا ٹین کا
سائبان ۔ اس سلیقہ کے ساتھ کہ آدمی برسات میں ٹین کے نیچے
نیچے پورا چکّر لگالے ۔ نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض
زیادہ حصّہ پٹا ہوُا ۔ ایک لمبا حصّہ کھُلا ہوُا ۔ پھاٹک میں داخل
ہوتے ہی آپ کو دونوں طرف غسل خانے ملیں گے ۔ چھوٹے
لیکن ضرورت کے لیے کافی ۔ جاڑوں میں گرم پانی کرنے کا
انتظام موجود ۔ اور سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں ۔ برو ٹھا
طے کر کے اندرونی دروازہ میں داخل ہوئے ۔ جوتے اُتارے
کہ صحن مسجد شروع ہو گیا ۔ جوتا رکھنے کے لیے ایک چبوتر کا
بکس کھلا ہوُا رکھا ہوُا ۔ اب آپ مشرق سے اپنے بائیں
طرف یعنی شمال کی جانب مڑے ۔ یہیں کنواں ۔ اس کے
آگے بیت الخلا جانے کا راستہ ۔ اس کے بعد مہمان خانہ
کا زینہ مہمانوں کے لیے کمرہ ۔ کوٹھے پر ۔ سادہ مگر ہوا دار ۔
گنجائش اتنی کہ چار مہمان ایک وقت میں آسانی سے ٹھہر سکیں ۔
زینہ سے چند ہی قدم اور آگے چلے کہ رُخ شمال میں چلتے
چلتے اپنے داہنے ہاتھ کو یعنی مغرب کی جانب مڑنا پڑا ۔
اور ایک لمبا برآمدہ ملا ۔ اس برآمدہ میں دو سہ دریاں ہیں ۔
پہلی سہ دری کے عقب میں کتب خانہ کا کمرہ ۔ دوسری
سہ دری خاص حضرت کی نشست گاہ ۔ ایک حجرہ ۔

اس کے عقب میں۔ دوسرا حجرہ۔ اس کے مغربی کونے پر۔ یہی حجرہ حضرت حاجی صاحب کا تھا۔ اور ایک کوٹھڑی اس کے جواب میں برآمدہ کے شرقی کونے پر۔
اب دوسری سہ دری سے نکل کر مسجد میں آ گئے۔ مسجد کچھ ایسی بڑی نہیں لیکن بڑی پُر رونق اور پُر انوار۔ اور ساتھ ہی گنجائش اور آرام دہ۔ ختم مسجد کے بعد اُسی مغربی لائن میں دالان۔ اور اس کے عقب میں طالبین و سالکین کے لیے حجرے۔ دالان میں ابتدائی تعلیم کے لیے لڑکوں کا مدرسہ قرآنی۔ خاتمہ پر زینہ اور کچھ حجرے۔ اُوپر اور نیچے کے یہ سب حجرے طالبوں کے لیے ہیں۔ اب آپ پھر اپنی طرف یعنی شرق کی جانب مڑے اور جنوبی برآمدہ میں آ گئے۔ اس کا نصف حصّہ مدرسہ اور مہمانوں کے لیے ہے۔ اندرونی درجہ میں متعدد مہمانوں کی گنجائش۔ برآمدہ کے دوسرے حصّہ میں مدرسہ کی اُونچی جماعتیں یعنی ہدایہ خواں طلبہ کی درسگاہ۔ اس کے عقب میں رسالہ "النّور" کا دفتر حضرت کے بھتیجے اور خانقاہ کے مہتمم و نگران مولانا شبیّر علی صاحب کا کتب خانہ تجارتی۔ اس کے بعد آپ شمال کی جانب ایک بار پھر مڑے۔ اور شرق میں کنارہ پر چلتے چلتے چند قدم کے بعد دروازہ پر واپس پہنچ گئے۔ حجروں کی قطار ادھر بھی موجود۔ اور وضو کے لیے باقاعدہ نالیاں اس مستطیل کے شرقی ضلع میں شمال سے جنوب تک برابر بنی ہوئی ہیں"۔ حکیم الامت ص ۱۶-۱۸

نظم وضبط

دنیا میں کوئی حکومت اور کوئی ادارہ نظم وضبط کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اسی لیے قرآن پاک نے زندگی کے ہر دور اور شعبہ کے لیے حدود و قواعد کی پابندی لازمی قرار دی ہے۔ معلم الاخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مسلمانوں کی داخلی اور خارجی زندگی میں نظم وضبط پیدا کرنے کی غرض سے بھیجا گیا۔ جیسا کہ ان کا اپنا ارشاد ہے کہ "میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔" مگر عام طور پر نہ صرف عوام بلکہ خواص کا تصوّر یہی ہے کہ یہ اصول و قواعد۔ حدود و قیود اور نظم وضبط صرف انگریزوں کے ہاں تھا۔ اسلام ان کا مدعی نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی باضابطگی نہیں پائی جاتی۔ جو کام بھی ہے بے ضابطہ اور بے طریقہ۔ اس طرف سب سے پہلے ہندوستان میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے توجّہ فرمائی۔ اور اُنھوں نے مسلمانوں میں نظم وضبط پیدا کرنے کے لیے اپنے ہاں ہر ہر موقع و محل کے لیے اصول و قواعد تیار کیے۔ ان کی خود بھی اور دوسروں سے بھی پابندی کراتے۔ جس کی وجہ سے نافہم لوگ آپ کو سخت گیر کہتے۔ حالانکہ اس دور میں سب سے پہلے اُمتِ مسلمہ کو جو سبق حضرت تھانویؒ نے دیا۔ اسی کو قائد اعظم نے بھی دہرایا۔ قوم کو مشورہ دیا کہ وہ اتحاد۔ تنظیم اور یقین سے کام لے۔ چونکہ حضرت تھانوی کی یہ اصول پسندی طبائع پر گراں گزرتی تھی۔ اس لیے وہ آپ پر یوں زبانِ طعن دراز کرتے تھے:-

> "یہ اصول پسندی تو بالکل انگریزیت ہے کہ ملنے کے اوقات مقرر۔ گفتگو کے طور طریق متعین۔ یہ بھی کوئی درویشی ہے۔"

حالانکہ آرام و راحت کا بہت حد تک دار و مدار نظم وضبط پر ہے۔ اس لیے حضرت تھانوی کے ہاں اس کا بہت اہتمام تھا۔ آپ نے نو واردین کی سہولت و راحت کے لیے ایک سوال نامہ چھپا رکھا تھا۔ جس کی تمہید یہ تھی کہ:-

"بعض حضرات احقر کے پاس خاص مقاصد کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ جن کی بجا آوری ان کے مفصل حالاتِ ضروریہ کے مطلع ہونے پر موقوف ہوتی ہے۔ مگر اکثر کا میرے سوال کرنے پر بھی جواب بھی نہیں ملتا۔ یا بہت ہی ناتمام ملتا ہے یا کئی کئی بار کے پوچھنے پر ملتا ہے۔ جس سے طبعًا اذیت ہوتی ہے۔ اور اذیت سے تنگی و کدورت جو ان کے مقاصد میں مخل ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی وجہ پوچھنے پر اکثر نے تصریحًا یہ وجہ بیان کی کہ زبانی سوال سے انتشار ہو جاتا ہے۔ اس لیے سہولت کے لیے نقشہ ذیل تجویز کرتا ہوں کہ یہ نقشہ پیش کر دیا کروں اور وہ اس کی خانہ پُری خود یا کسی سے کرا کر مجھ کو عنایت فرما دیا کریں۔ حالانکہ جانبین کو اس میں راحت ہو گی۔"

اشرف علی

سوال نامہ

۱۔ نام

۲۔ اصلی وطن

۳۔ اس وقت کس مقام سے آنا ہوا۔ اور اس مقام میں کتنا قیام رہا ہے۔

۴۔ شغل و ذریعہ معاش۔

۵۔ موروثی زمین تو آپ کے پاس نہیں۔

۶۔ علمی استعداد اردو یا عربی یا انگریزی میں کس قدر ہے۔

۷۔ اصل مقصد آنے سے کیا ہے؟ محض ملاقات یا کچھ کہنا اور لکھ کر دینا یا زبانی اور مجمع میں یا تنہائی میں۔

۸۔ کسی سے بیعت ہیں یا نہیں ہیں تو کس سے۔

۹۔ اگر مجھ سے بیعت ہیں تو بیعت کو کتنا زمانہ ہوا اور تعلیم کس کے متعلق ہے۔

۱۰۔ میرے کون کون سے مواعظ و رسائل دیکھے ہیں۔

۱۱۔ اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دکھائی جائے۔

۱۲۔ کتنا قیام ہوگا۔

۱۳۔ کہاں قیام ہوگا۔

۱۴۔ خانقاہ میں اوّل بار آنا ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں۔ اگر پہلے بھی آئے ہیں تو کتنا قیام ہوگا۔

۱۵۔ یہاں کے انتظام طعام کی آپ کو خبر ہے یا نہیں۔

۱۶۔ باہر والا بڑا اعلان قلمی دیکھ لیا ہے یا نہیں۔

"اشرف علی"

اوقات نامہ سوال نمبر ۱۶ میں جس اعلان کی طرف اشارہ ہے وہ حسب ذیل تھا جو نو واردین کی سہولت اور اپنے بھی حرج اوقات کے انسداد کے لیے آپ کی نشست گاہ کے باہر آویزاں رہتا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعلان انضباط اوقات احقر

تاکہ نہ اہل حاجت کا حرج یا تکلیف ہو۔ نہ احقر کا۔

۱۔ صبح سے بارہ بجے تک مجھ کو متفرق ایسے کام رہتے ہیں۔ جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کسی سے ملنے میں یا بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے حرج بھی ہے۔

۲۔ البتہ اوپر کے نمبر سے تین شخص مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہو۔ اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا وہ جو جا رہا ہو۔ اور صرف

رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جو جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً درد زہ وغیرہ کا تعویذ لینا ہو یا فوری ضرورت کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو جس میں تاخیر نہ ہو سکے۔ مگر ان تینوں شخصوں کو چاہیئے کہ آتے ہی کہہ دیں کہ ہمارے اس وقت آنے کی یہ وجہ ہے۔ تاکہ معلوم نہ ہونے سے پریشانی نہ ہو۔

۳۔ پھر بارہ بجے سے نماز ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں بیٹھنے تک میرے قیلولہ و نماز کا وقت ہے۔ اس میں ملاقات سے اور نیز سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں۔

۴۔ پھر جب نمازِ ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں۔ اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے۔ آنے کی، بیٹھنے کی ہر قسم کی بات چیت کی۔ تعویذ وغیرہ مانگنے کی۔ البتہ جمعہ کا دن تعویذ سے مستثنیٰ ہے۔

۵۔ اذان عصر سے نماز سے فارغ ہونے تک کے لیے وہی قاعدہ ہے جو قیلولہ کے وقت کا ہے۔ اور نمبر ۳ میں مذکور ہے۔

۶۔ عصر سے فارغ ہونے کے بعد سے عشاء سے فارغ ہونے تک کے لیے وہ قاعدہ ہے جو صبح سے بارہ بجے تک کے وقت کا ہے۔ اور نمبر ۱ میں مذکور ہے۔ اور وہی لوگ یہاں بھی مستثنیٰ ہیں جو نمبر ۲ میں مذکور ہیں۔

۷۔ عشاء کے بعد تو علی الاطلاق معذوری ظاہر ہے۔ باستثناءِ اضطرار شدید

۸۔ یہ قواعد اُن صاحبوں کے لیے ہیں۔ جو مجمع میں اپنا مقصود ظاہر فرما سکتے ہیں۔ اور جو کسی کو کچھ پوشیدہ کہنا ہے۔ اس کے لیے یہ قاعدہ ہے کہ اگر تحریر کو کافی سمجھیں۔ تو میری مجلس سے ملحق سہ دری کی دیوار میں ایک بکس لگا ہے۔ اس میں لکھ کر ڈال دیں اور جس موقع پر جواب چاہتے ہوں۔ اس کا پورا پورا پتہ لکھ دیں۔ مثلاً فلاں نمبر کے حجرہ میں یا مسجد کے منبر پر۔ ہمیشہ بعد نماز فجر

ایسے پرچے نکالے جاتے ہیں۔ اسی طریقہ سے جواب تحریری مل جاوے گا۔ اور اگر وہ پوشیدہ بات زبانی ہی کہنا چاہیں۔ تو ایسے ہی پرچہ کے ذریعہ سے تنہائی کا وقت پوچھ لیں۔ میں جو وقت بتلاؤں۔ اس وقت بات کر لیں۔ اور اکثر بعد مغرب کا وقت بتلایا کرتا ہوں۔

۹۔ بعض مہمانوں کو میں خاص اجازت دے کر تنہائی کے وقت بٹھا لیتا ہوں۔ دوسرے حضرات اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں۔ اور اسی طرح ایک کو کہ کوئی خدمت پنکھا وغیرہ کی کرتا ہو دیکھ کر دوسرے اس کی تقلید نہ کریں۔ جب تک خاص اجازت حاصل نہ کر لیں۔ اسی طرح دوسری خدمت بھی بلا صریح اجازت نہ کریں۔ جیسے جوتا اٹھانا یا لوٹا بھر کر رکھنا وغیرہ۔

۱۰۔ راستہ میں بھی کوئی صاحب میرے ساتھ نہ چلیں۔ نہ گھر جا کر پکاریں۔

نوٹ نمبرا

یہ سب قواعد ان صاحبوں کے لیے ہیں۔ جو محض عقیدت مندی کے تحت آتے ہیں اور جن کو کوئی دوسرا تعلق بھی ہو۔ ان کے لیے یہ ضوابط نہیں۔ البتہ اگر کسی کو کسی خاص قاعدہ کا پابند کر دوں تو اس کو اس کی پابندی لازم ہے۔

نوٹ نمبر ۲

کسی وقت ضرورت سے کچھ ترمیم کر دوں۔ تو ترمیم ہی پر عمل ہو گا۔ اسی طرح ذاتی ملازموں کے لیے دوسرے ضوابط ہیں۔ جو ان کو زبانی بتلا دیے گئے ہیں۔

ماہ رمضان کے لیے ان قواعد کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔

۱۔ وقت تنگ اور مشاغل زیادہ ہونے کی وجہ سے رمضان گزرنے تک صبح کی مجلس موقوف کر دی گئی۔ ایک دو منٹ کے لیے ضروری بات کی زبانی اجازت ہے۔

۲۔ جن حضرات کو یہاں کے زمانہ قیام میں مکاتبت کی اجازت نہیں۔ وہ تو کسی قسم کا پرچہ نہ لکھیں اور جن کو اجازت ہے۔ وہ سہ دری والے لیٹر بکس میں نہ ڈالیں۔

بلکہ ڈاک کے ذریعہ سے بھیجیں اور جواب ملنے کا ذریعہ یہ ہوگا کہ عصر کے بعد حافظ اعجاز کے پاس جا بیٹھیں۔ ان کے پاس ایک بکس ہوگا۔ وہ اس کو کھول کر پرچہ والوں کے نام لے کر پکار پکار کر حوالہ کر دیں گے اور مناسب یہ ہے کہ ڈاک میں ڈالنے سے دوسرے روز جواب کا انتظار کریں اور شاذونادر بعض اوقات تیسرے روز ملنا بھی محتمل ہے۔ کتبہ اشرف علی عفی عنہ

اصول استثنیٰ حضرت تھانوی باضابطہ ہونے میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ مگر ضابطہ کی پابندی بھی حدِ اعتدال کے اندر تھی اور افراط و تفریط سے قطعاً پاک تھی۔ حالانکہ عام طور پر پابندِ اصول انسان استثناً کے قائل نہیں ہوتے۔ جس طرح پابندیٔ اصول فطرتِ سلیمہ کا مقتضا ہے۔ اس طرح ضروری اور خصوصی مواقع پر استثنائے سے کام لینا بھی فطرتِ سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی کا کوئی قاعدہ ایسا نہیں تھا۔ جس میں مستثنیات نہ ہوں۔ مگر آپ کا استثنار بھی قاعدہ کے مطابق تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا بکثرت استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ صرف خاص اہل تعلق۔ اہل قرابت۔ اہلِ فضیلت اور اہلِ حوائج شدیدہ ہی اس سے کبھی کبھی فائدہ اُٹھاتے تھے۔

شرائط حاضری اگر کوئی نووارد طالب تحریری طور پر حاضری خدمت کی اجازت چاہتا۔ تو سب سے پہلے اس سے یہ سوال فرماتے کہ تمھارے آنے کی ایسی کون سی غرض و غایت ہے۔ جس کے لیے حاضری اشد ضروری ہے۔ طالبین اپنے اپنے فہم کے مطابق اس سوال کے مختلف جواب عرض کرتے۔ لیکن جب تک وہ اس غایت کا انکشاف نہ کرتے اس وقت تک آپ ان پر برابر جرح کرتے رہتے۔ اور آنے کی اجازت مرحمت نہ فرماتے اور اگر کوئی یہ لکھتا کہ حاضری صرف ملاقات کے لیے ہے اور زمانۂ قیام میں مخاطبت و مکاتبت کی بجائے خاموشی کے ساتھ شریک مجلس رہوں گا۔ تو آپ اسے بخوشی اجازت دے دیتے

تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ بس یہی ایک ایسا مقصود ہے جو بغیر حاضری حاصل نہیں ہو سکتا۔ ورنہ دیگر تمام مقاصد کے لیے یہاں آنے کی زحمت گوارا کرنا قطعاً ضروری نہیں۔

دستور العمل بعد میں جب حضرت نے محسوس کیا کہ حاضریِ خانقاہ کی شرائط کے متعلق طالبین بہت گڑبڑ کرتے ہیں۔ اور طے ہونے میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے۔ تو آپ نے اپنے ذاتی خرچ سے حاضری کے متعلق مندرجہ ذیل دستور العمل چھپوالیا۔ جب کوئی حاضری کی اجازت طلب کرتا تو اُسے یہ مطبوعہ شرائط نامہ بھیج دیا جاتا:۔

دستور العمل طالبان تعلق مرکب از مراتب سبعہ

اولاً یہاں کی ابتدائی آمد میں ہر حال میں بدوں مخاطبت و مکاتبت کے سکوت محض کے ساتھ چندے مجالست و مصاحبت بغرض حصولِ بصیرت و مناسبت۔

ثانیاً۔ یہاں سے جاکر اگر تعلق رکھنا چاہیں۔ اپنے مستقر سے اپنی اصلاح کے متعلق زیادت مناسبت کے لیے مراسلت و مکاتبت۔

ثالثاً۔ مکرر آمد میں اگر یہاں کے قیام میں صرف مکاتبت چاہیں۔ تو قبل آمد بذریعہ خط مجھ کے تحقیق و موافقت و ضروری مناسبت و اخذ اجازت مکاتبت۔

رابعاً۔ بعد حصول اجازت نامہ جس کو آنے کے وقت دکھلانا ضروری ہوگا۔ یہاں کے قیام میں صرف مکاتبت بلا مخاطبت۔

خامساً۔ بعد مناسبت تامہ جو مکاتبت طویلہ سے حاصل ہو سکتی ہے، میری اجازت کے بعد یہاں کے قیام میں مکاتبت و مخاطبت۔

اور یہ سب تفصیل بقاءِ تعلق کی صورت میں ہے۔

سادساً۔ اگر اختلاف مذاق کے سبب مناسبت سے مایوسی ہو جائے

تو پھر مصلحت کے لیے نہ کہ کدورت کے سبب تجویز مفارقت و مجانبت و مشورہ رجوع بجانب محل مناسبت۔

سابعًا۔ لیکن اس حالت میں بھی اگر خواہش کریں تو طلب دُعا۔ دریافت خیریت کے لیے خط بھیجنے کی اجازت علی المواظبت و بشرط عدم انقباض سکوت کے ساتھ اجازت مجالست و مصاحبت۔

خلاصہ

۱۔ محض مجالست ۲۔ مستقر سے مراسلت

۳۔ بعد مناسبت ضروریہ و اخذ اجازت مجالست و مع مکاتبت بلا مخاطبت۔

۴۔ بعد مراسلت طویلہ و مناسبت تامہ و اخذ اجازت مجالست مع مکاتبت و مخاطبت۔

بصورت عدم حصول مناسبت

۵۔ مشورہ رجوع بجانب محل مناسبت ۶۔ صرف برائے طلب دعا و خیریت اجازت مراسلت ۷۔ بشرط عدم انقباض اجازت مجالست بلا مکاتبت و مخاطبت۔ فقط۔ کتبہ اشرف علی عفی عنہ،

اس مطبوعہ دستور العمل کے علاوہ آپ کے اس خط سے مزید شرائط کا پتہ چلتا ہے۔ جو آپ نے ایک خاتون کو عریضہ اجازت کے جواب میں تحریر فرمائیں کہ اگر کبھی تمہارے شوہر اپنی خوشی سے ہمراہ لاویں۔ بشرطیکہ قرض نہ اُٹھانا پڑے۔ کسی قسم کا کوئی حرج بھی واقع نہ ہو اور تم ان پر تقاضا کر کے تنگ بھی نہ کرو اور پردہ میں اور نماز میں بھی سفر میں خلل نہ پڑے۔ تو اجازت ہے۔"

(مکتوبات حسن العزیز جلد ۱)

منشاءِ مصلحت | اس دستور العمل سے جانبین کو بہت سہولت ہوتی ہے جس کے متعلق خود حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے،۔

"نئے آنے والوں کے لیے بزمانۂ قیام عدم مخاطبت و عدم مکاتبت کی شرط اللہ تعالیٰ نے خوب میرے دل میں ڈال دی ورنہ عدم مناسبتِ مزاج اور عدم موافقتِ طریق کی وجہ سے لوگ بے اصولی باتیں اور بے تکے سوالات کر کر کے مجھے بڑی اذیتیں پہنچاتے اور نہ صرف اپنا بلکہ میرا بھی بڑا وقت ضائع کرتے۔ اَب تو اللہ کا شکر ہے کہ میں بھی اپنے کام میں اطمینان سے مشغول رہتا ہوں۔ اور ان لوگوں کو بھی نہایت یکسوئی اور سکون کے ساتھ میری باتیں سننے اور اطمینان سے ان پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ورنہ اگر قیل و قال کی اجازت ہوتی۔ تو مجلس کیا ہوتی۔ چوپال ہوتی بڑے پریشان ہوتے۔ اور بڑا پریشان کرتے۔ اور یہاں سے بالکل کورے جاتے اب تو بکثرت اس مضمون کے خطوط آتے رہتے ہیں کہ خموشی کے ساتھ بیٹھنے سے بہت نفع حاصل ہوا۔"

کیونکہ حاضرِ مجلس رہ کر انھیں حضرت کے طرزِ تربیت۔ اخلاق و عادات۔ ترغیب و ترہیب۔ زجر توبیخ غرضیکہ ہر بات کا علم و مشاہدہ ہو جاتا تھا۔

آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہاں آنے والوں کے متعلق میرے جتنے معمولات ہیں۔ ان سب کا منشاءِ تعلیم ادب ہے۔ یہ اصل ہے اور سب فروع۔ جو کہ زمانہ اور مصالح اور ضرورتوں کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس اصل کی صریح تائید حدیث کان علیٰ رؤسنا الطیر سے ہوتی ہے۔ اگر یہ تائید نہ بھی ہوتی۔ تب بھی اس کے مستحسن اور قابلِ عمل ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔

زمانہ قیام میں عدم مخاطبت و مکاتبت کا یہ فائدہ ہے کہ نئے آنے والے پہلے خموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے میرا طرزِ تربیت۔ میری عادات

میری خصوصیاتِ مزاج دیکھیں۔ اور میری باتیں سنیں ان پر اطمینان سے غور کریں۔ پھر یہاں سے جا کر آزادی کے ساتھ رائے قائم کریں۔ اگر میرا طریقہ اور مزاج پسند نہ آئے۔ اور مجھ سے مناسبت پیدا ہونے کی توقع نہ ہو۔ تو کسی دوسرے سے رجوع کریں۔ اگر میری باتیں سب پسند ہوں۔ تو پھر اصلاح کے متعلق مجھ سے خط و کتابت کریں۔ شروع میں اصلاح خاص کی نیّت سے یہاں نہ آئیں۔ بلکہ یہ دیکھنے اور سیکھنے کے لیے آئیں کہ آیا باہم مناسبت ہو گی یا نہ ہو گی۔ اور اگر ہو گی تو اپنی اصلاح کے متعلق خط و کتابت کرنے اور اپنے امراض نفس کے پیش کرنے کا صحیح اور نافع طریق کیا ہے۔

مزید براں فائدہ یہ ہے کہ میرے متعلق عمر بھر میں جتنے کسی کو وسوسے آتے ہیں۔ اور اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک دم سے آ جائیں اور ختم بھی ہو جائیں۔ اور پھر عمر بھر کے لیے یکسوئی ہو جائے۔ یا تو ہمیشہ کے لیے معتقد ہو کر یا ہمیشہ کے لیے غیر معتقد ہو کر۔ ورنہ اگر میں اپنے آپ کو بنائے ہوئے رکھتا۔ تو عمر بھر بھی یکسوئی نہ ہوتی۔ جب کوئی بات اپنے خیال کے خلاف دیکھتے۔ فوراً شبہ قائم کرتے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا۔ اور عمر بھر اطمینان نہ ہوتا۔ اب تو بُرا بھلا جیسا بھی ہوں۔ سب کو سابقہ پڑتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ پھر چاہے کوئی رہے یا جائے۔ اور مجھے بھی یکسوئی ہو جاتی ہے اور اس خیال کے لوگوں سے میرا شروع سے ہی پیچھا چھوٹ جاتا ہے۔ جو بزرگی اسی کو سمجھتے ہیں کہ بت کی طرح بالکل بے حس ہو جائے۔ اگر ان کے ساتھ تعظیم کا برتاؤ کیا جائے۔ تب انھیں کوئی حس نہیں دوسرے یہ کہ بزرگی کا دعویٰ ہی کس نے کیا ہے اور بلانے کا اعلان کس نے دیا ہے۔ میں تو ایک طالبعلم ہوں۔ اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے دین کی جو باتیں سُنی ہیں وہ سناتا رہتا ہوں اور ان کی صحبت کی برکت سے دین کی جو حقیقت سمجھ میں آئی ہے۔

اس کو ظاہر کرتا رہتا ہوں۔ اگر کسی کے جی کو لگے۔ قبول کرے۔ نہ لگے نہ قبول کرے۔ اختیار ہے۔ لُلّو پتّو مجھے نہیں آتی۔ نہ میں اس کو مفید سمجھتا ہوں۔ اگر بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رفتہ رفتہ اپنے طریق پر لانا چاہیئے لیکن میں اس کے خلاف ہوں۔ کیونکہ میرا تجربہ ہے کہ جس نے اپنے ذہن میں جو معیار بزرگی کا صحیح یا غلط قائم کر رکھا ہے۔ وہ اسی وقت تک اس کا معتقد ہے۔ جب تک وہ اس معیار کے مطابق اس کو سمجھے ہوئے ہے اور جہاں ذرا اس معیار سے ہٹا ہوا پایا۔ بس سارا اعتقاد جاتا رہا۔ معتقد فیہ تو اس خیال میں رہتا ہے کہ یہ شخص ہمارا معتقد ہے۔ حالانکہ وہ درحقیقت اپنے ہی خیال کا معتقد ہوتا ہے۔

اِسی طرح اگر کسی معتقد کا اعتقاد جاتا رہے۔ تو معتقد فیہ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اس کا معتقد تھا ہی نہیں۔ بلکہ ایک خیالی شخص کا معتقد تھا۔ تو ایسے خیالی معتقد کے کم ہو جانے کا افسوس ہی کیا۔ بلکہ خوش ہونا چاہیئے کہ اچھّا ہوا قبل تعلق ہی پیچھا چھوٹ گیا۔ ورنہ تعلق قائم ہو جانے کے بعد اگر تعلق قطع ہو جاتا اور ضرور ہوتا۔ تو بہت ناگواری ہوتی۔ اور جب تک تعلق رہتا۔ بہت ستاتا اس لیے میں شروع ہی سے ہر طالب کے ساتھ ایسا صاف معاملہ کرتا ہوں کہ اس کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ شروع ہی میں فیصلہ ہو جائے۔ اِدھر یا اُدھر۔ نہ وہ دھوکہ میں رہے نہ میں میرا تو بس یہی مذاق ہے ؎

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

غرضیکہ پاس رہنے سے اصلاح نہیں ہوتی۔ بلکہ مناسبت ہوتی ہے۔ اور اپنے امراض کو پیش کرنے کا اور میرے جوابات کو سمجھ کر ان پر عمل کرنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

مذکور الصدر دستور العمل کی اس وضاحت کے بعد اس کی تائید میں واقعات

پیش کرنا لازمی طور پر طوالت کا باعث ہو گا۔ اس لیے اس کی صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جس سے اس کا عملی نقشہ بھی واضح ہو جائے گا۔ بلا مکاتبت و مخاطبت والے ایک طالب علم نے ایک مجلس میں رہ کر جب خاموشی سے حضرت کی تمام حرکات و سکنات اور طریقِ اصلاح وغیرہ کا جائزہ لے لیا۔ تو اس نے واپس جا کر آپ کو خط لکھا کہ:-

"دورانِ قیام میں جو سکون اور اطمینانِ قلب حضرت والا کی صحبت بابرکت سے حاصل ہوا ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے خاص کر اپنے نفس کے عیبوں پر بصیرت کے ساتھ اطلاع ہوئی۔ خاص کر بدگمانی کا مرض مجھ میں شدید ہے اس کا علاج تجویز فرمائیں۔"

جس سے ظاہر ہے کہ اس طالب نے حضرت کے طریق کار کو صحیح سمجھا۔ اور بہ بنائے مناسبت اصلاح حال کے لیے رجوع کیا۔ اور حضرت نے بھی بوجہ مناسبت فی الفور باقاعدہ تعلیم اصلاح شروع فرما دی اور اسے لکھا کہ:-

"وہ بدگمانی اختیار سے ہوتی ہے یا بلا اختیار اور صرف بدگمانی ہوتی ہے۔ یا اس کے موافق عمل بھی ہوتا ہے؟ اور کیا ہوتا ہے؟ مع ایک دو مثال کے لکھو۔"

بس اسی طریق سے آپ محققانہ انداز میں امراضِ نفس کی تحقیق فرماتے جاتے اور علاج تجویز فرماتے جاتے۔

مذکور الصدر انتظامیہ کے علی الرغم بعض لوگ بلا اجازت بھی حاضر ہو جاتے مگر ان کو بھی انھی اصولوں پر کار بند ہونا پڑتا۔ جیسا کہ آپ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ

"اگر کوئی بلا اجازت طلب کیے آ جائے۔ تو میرے

ہاں کوئی پہرہ چوکی تو ہے نہیں جو چاہے چلا آئے اور جب
چاہے چلا آئے۔ مگر یہاں آنے کے بعد بھی اس سے وہی
سوال ہو گا۔ اور قیام کی بھی وہی شرائط ہوں گی۔"

چنانچہ بلا اجازت آنے والوں سے جب مذکورہ بالا سوالات ہوتے اور وہ بے ڈھنگے اور بے تکے جوابات دیتے۔ تو ان سے حضرت کو از حد اذیت ہوتی اور اتنی ناگواری بڑھتی کہ ان کو دوسری ہی گاڑی سے واپس کر دیتے یا وہ از خود واپس چلے جاتے کیونکہ معاملہ صاف ہوئے بغیر قیام کرنا جانبین کے لیے تکدر پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

لیکن اکثر دیکھا گیا کہ ایسے نو واردین کی واپسی کی نوبت کم آتی۔ اور حضرت ان کے معافی طلب کرنے پر معاف فرما دیتے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ

"جو اذیت مجھے پہنچی۔ وہ کس مد میں رہی کیا یہ خالی ہی گئی۔
جس غرض کے لیے یہاں آئے ہو۔ یعنی قیام۔ وہ تو جبھی
پوری ہو گی جب اس اذیت کا کچھ تدارک کیا جائے گا۔"

جب وہ تدارک پوچھتا۔ تو اکثر اس سے خود تدارک تجویز کراتے۔ تاکہ وہ خواہ مخواہ حضرت پر سختی کا الزام نہ رکھے۔ چنانچہ وہ اپنی فہم یا دوسری کے مشورہ سے مناسب تدارک تجویز کرتا۔ اگر حضرت اسے کافی سمجھتے۔ تو اسے ہی اس کے لیے جائز سمجھتے یا اس میں مناسب ترمیم و تنسیخ فرماتے اگر وہ کافی و شافی نہ ہوتا۔ تو پھر اس پر اس انداز سے جرح فرماتے کہ اس کا تدارک خود بخود اسکے ذہن میں آجاتا۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی تدارک اس کے ذہن میں نہ آتا تو پھر خود بخود تجویز فرما دیتے۔ جو اکثر یہی ہوتا کہ کسی قریب مقام پر جا کر وہاں سے پھر حاضری کی اجازت طلب کی جائے۔ اور بعض کے لیے صرف اسی پر اکتفا

فرماتے۔ کہ آپ یہ اعلان لکھ کر خانقاہ میں آویزاں کر دیں کہ مجھ سے فلاں اذیت دہ حرکت سرزد ہوئی ہے۔ اور بعض کے لیے یہ تجویز فرماتے کہ سب مقیمین خانقاہ سے فرداً فرداً اپنی غلطی کا اظہار کیا جائے تاکہ نفس کو گرانی ہو۔ اور آئندہ کے لیے اس کو تنبیہہ ہو چونکہ حضرت کو ان کی اصلاح مطلوب ہوتی۔ اس لیے ہر ایک کی طبیعت کا جائزہ لے کر ہی اس کے مناسب حال تجویز فرماتے۔ چنانچہ ایک صاحب نے اپنے لیے یہ تدارک تجویز کیا کہ سہارنپور واپس جا کر پھر حاضری کی اجازت طلب کروں۔ آپ نے یہ تجویز منظور فرمائی لیکن اس وقت پھر ان سے کوئی اذیت دہ حرکت سرزد ہوئی۔ جب وجہ دریافت کی گئی تو وہ غلط تاویل کرنے لگے۔ جس پر آپ نے ان کے مجوزہ تدارک میں شدتِ مرض کے پیشِ نظر یہ ترمیم فرمادی کہ وہ سہارنپور کے بجائے دہلی جا کر حاضری کی اجازت طلب کریں اور اس پر افسوس بھی فرمایا کہ واللہ مجھ کو اس سے سخت قلق ہوا ہے۔ بلکہ خود ان سے بھی زیادہ قلق ہے۔ لیکن کیا کرتا۔ بدوں اس تدارک کے ان کی اصلاح ہی نہیں ہو سکتی تھی۔" چونکہ وہ طالبِ صادق تھے۔ اس لیے دہلی تک واپس چلے گئے۔ وہاں سے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اجازت حاضری طلب کی۔ جو حضرت نے بخوشی دے دی۔ لیکن واپسی پر مطابق دستور العمل اجازت حاضری کا خط پیش کرتے وقت ان سے پھر غلطی ہوئی کہ پہلے تو خط جیب سے نکالا۔ جب حضرت اس کو لینے کے لیے آمادہ ہوئے تو اسے فرش پر رکھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس سے آپ کو سخت اذیت ہوئی۔ جس پر آپ نے فرمایا کہ اگر مصافحہ کرنا تھا تو پہلے مصافحہ کر لیتے۔ پھر جیب سے خط نکالتے۔ اگر خط نکال کر لینے پر آمادہ کیا تھا۔ تو خط ہی دے دیتے۔ اس وقت مصافحہ نہ کرتے بعد میں کر لیتے۔ اس پر حضرت نے اسے اپنے پاس سے کچھ وقت کے لیے اٹھا دیا۔ ایسے مواقع پر آپ

حاضرین سے فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"اگر میں لوگوں کی ان حرکتوں پر صبر کروں ۔ تو ان کی اصلاح بھی نہ ہو ۔ اور میرے قلب کے اندر کی طرف سے تکدر بھی پیدا ہو جائے ۔ اور اب تو چونکہ میں اپنی اذیت کا اظہار کر دیتا ہوں ۔ اور بعض لوگ اذیت کا تدارک بھی کر دیتے ہیں اس لیے میری طبیعت صاف رہتی ہے ۔"

دستور سلف

ممکن ہے دورِ حاضر کی نازک طبائع اتنی وضاحت و صراحت کے باوجود بھی دستور خانقاہ پر حرف گیر ہوں تو ان کی آگاہی کے لیے یہاں یہ ذکر کر دینا بے سود نہ ہوگا کہ حضرت نے اس زمانہ کی نازک مزاجی کے پیشِ نظر یہ بہت ہی سہل شرطیں رکھی ہوئی تھیں ورنہ اکابر سلف میں تو تعلیم اصلاح کے لیے اس سے کئی درجے سخت سزائیں مقرر تھیں جیسا کہ صاحب "اشرف السوانح" کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ

"بزرگان سلف نے تو اس سے بھی سخت سخت سزائیں تجویز فرمائی ہیں ۔"

"طبقاتِ شعرانی میں ایک بزرگ کے حالات میں لکھا ہے کہ کہ ان کی خدمت میں ایک طالب علم آئے اور یہ کہا کہ بہت دور سے آیا ہوں ۔ اس احسان جتلانے پر ان کے لیے یہ تجویز فرمائی گئی کہ تین برس تک یہاں آنے کی ضرورت نہیں ۔ اسی طرح اس کتاب میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں ایک طالب علم مقیم تھے ۔ وہ ایک لاکھ درہم تو اپنے پاس سے اور ایک لاکھ درہم لے کر خرچ کر چکے تھے ۔ لیکن ہنوز ان کو کلام کرنے کی بھی اجازت نہیں ملی تھی ۔

اس لیے حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے طالبین بھی کوئی طالبین ہیں کہ ذرا سی سیاست کا بھی تحمل نہیں۔ اور پھر حضرت مولانا رومیؒ کا یہ شعر پڑھ دیتے تھے کہ ؎

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق
تو بجز نامے چہ میدانی ز عشق

اجتماعی حاضری

حضرت تھانوی کو طالبین کا اکٹھا ہو کر بغرض اصلاح آنا بالکل پسند نہ تھا۔ اور عام اجتماع کی وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ ہر شخص کا تنہا آنا ہی اس کے لیے مفید ہے کیونکہ ہر شخص کے ساتھ اس کے مناسب حال برتاؤ کرنا ہوتا ہے۔ اگر سب ایک ساتھ آئے۔ تو سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنا پڑے گا۔ اور اگر کسی کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا مناسب ہُوا تو اس کو اپنے ساتھیوں سے شرمندگی ہو گی۔ بس ہر شخص کا الگ الگ آنا ہی ٹھیک ہے۔ یہ تو سفر آخرت ہے۔ مُردے قبر میں علیحدہ علیحدہ ہی جاتے ہیں۔"

چنانچہ ایک صاحب نے عریضہ میں اپنے ہمراہ اپنے والد صاحب کو بھی لانے کا مقصد ظاہر کیا۔ تو آپ نے اسے لکھا کہ

"وہ آپ کے ساتھ تشریف لائے۔ تو ان کو مخدوم بنا کر رکھنا پڑے گا۔ جس کے لیے میں بسر و چشم آمادہ ہوں۔ لیکن ان کو نفع نہ ہو گا"

اسی لیے حضرت کسی کا کسی کے ساتھ بغرضِ اصلاح آنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ البتہ اگر کوئی محض ملاقات کے لیے کسی کو ساتھ لانا چاہیئے تو اسے اجازت تھی۔ جس طرح چاہے آئے۔

[illegible]

اتنی بڑی تربیت گاہ میں کوئی لنگر خانہ نہیں تھا۔ بلکہ آنے والے ... مقیمین خانقاہ کے لیے ان کی درخواست پر بعض لوگ

بطور خود قیمتاً کھانے کا انتظام کر دیتے تھے جس سے جانبین کو بہت آرام رہتا تھا۔
لنگر جاری نہ کرنے کی وجوہ حسب ذیل تھیں۔ جن کی خود حضرت تھانوی نے تصریح فرما دی تھی کہ :۔

۱۔ صادق و غیر صادق طالبین کا امتیاز مشکل ہو جاتا۔

۲۔ بہت سے محض روٹیوں کی خاطر پڑے رہتے۔

۳۔ لنگر خانہ کے اخراجات کے لیے ہر وقت آنے والوں کے ہاتھ پر نظر رہتی۔ کہ یہ کچھ دیں گے جو خلافِ استغنا تھا۔

۴۔ ہر وقت اُس کی خود نگرانی کرنی پڑتی۔ جس کے لیے وقت نہیں۔ اور دوسرے کسی پر اوّل بار ڈالنا مناسب نہیں۔ اور نہ ہی انتظام دوسرے کے سپرد کر کے خود کو بری الذمہ سمجھا جا سکتا ہے۔ مزید براں۔

۵۔ محض دوسرے کے اعتماد پر کام چھوڑ دینے سے وہ کام مکمل نہیں ہوتا۔

مہمان داری حضرت تھانوی کے ہاں اکثر و بیشتر مہمانوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس لیے خانقاہ میں ہر قسم کے مہمان خانے موجود تھے۔
البتہ مہمان داری کا کوئی معین ضابطہ نہ تھا۔ جس وقت جیسی ضرورت اور مصلحت دیکھتے۔ ویسے عمل فرماتے۔ مگر اپنا معتدبہ حرج اوقات نہ ہوتے دیتے۔ ایک دفعہ بلا اطلاع اور بلا حصول اجازت کسی گاؤں سے چند مستورات بغرض بیعت آگئیں۔ گھر والے کھانے کے انتظام کے لیے متفکر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جنسی دے دو۔ چولھا بتا دو اور کہہ دو کہ آپ ہی پکائیں اور آپ ہی کھائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

جن مہمانوں کی آمد کی اطلاع ہوتی۔ تو ان کی خاطر کوشش کر کے اپنے معمولات سے کچھ پہلے ہی فراغت حاصل کر لیتے۔ تاکہ ان کی طرف توجہ دی جا سکے جنھوں نے اسی روز واپس ہونا ہوتا ان کے لیے تو قیلولہ کا بھی ناغہ فرما دیتے

اور ڈاک کے کام میں بھی تاخیر کر دیتے۔ بعد میں زیادہ دیر تک بیٹھ کر ڈاک نکالتے۔

کم قیام کرنے والوں کو اپنے پاس بیٹھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیتے۔ اور کوشش فرماتے کہ اس تھوڑے وقت میں وہ زیادہ سے زیادہ دینی فائدہ حاصل کر سکیں۔ اور بعض اوقات اس حرص افادہ میں کھانے کے اوقات بھی مؤخر فرما دیتے۔

اور خاص حالات میں تو ظہر کی مجلس عام کے علاوہ صبح بھی ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ان کے لیے خاص مجلس منعقد فرماتے۔ جس کی ایسے حضرات کو بروقت اطلاع کرا دی جاتی۔

ہر مہمان کو اس کی حسب حیثیت گھر سے کھانا بھجواتے۔ جس کی کچھ تفصیل "بابِ معیشت" میں گزر چکی ہے۔ تعطیلات کے ایام میں دیوبند اور سہارنپور سے بڑی تعداد میں طلبا و اساتذہ اور علماء کرام استفاضہ و استفادہ کے لیے تشریف لاتے تھے۔ اور کئی کئی دن مہمان رہتے تھے۔ طلباء کے علاوہ سب حضرت کے ہی مہمان ہوتے۔ مگر جن طلباء کے متعلق قرائن سے معلوم ہوتا کہ ان کے پاس کھانے کے لیے خرچ نہیں۔ تو ہر ایک سے جدا جدا بذریعہ ملازم دریافت فرما کر بقدر ضرورت ان کی مالی اعانت فرماتے۔

طریقِ استقبال

خاص اہلِ تعلق کے لیے حضرت تھانوی اسٹیشن پر پہنچ کر استقبال کرنے یا واپس پہنچانے میں گریز نہ فرماتے۔ اور بعض اوقات انتہائی خواہش کے باوجود محض اس خیال سے اسٹیشن پر تشریف نہ لے جاتے کہ ان کو سخت شرمندگی ہوگی۔

بعض بہت ہی خاص اعزاز و امتیاز اور خصوصیات والے مہمانوں کی آمد کے وقت آپ اپنی جگہ سے اُٹھ کر استقبال فرماتے۔ اور معانقہ کرتے۔ لیکن اکثر ایسے موقعوں پہ حاضرینِ مجلس کو کھڑے ہونے سے روک دیتے۔ کہ سب کی طرف سے میں ہی اُٹھتا ہوں۔ اور سب صاحب بیٹھے رہیں۔ دنیا دار آدمیوں کے

استقبال کے وقت تو خصوصیت کے ساتھ اہلِ مجلس کو نہ اُٹھنے دیتے۔

اِسی طرح خواہ کتنا ہی عزیز مہمان ہو۔ جب وہ روانہ ہونا چاہتا۔ تو اس کے ٹھہرانے کے لیے دل میں خواہش پیدا ہونے کے باوجود مزید قیام کے لیے قطعاً اصرار نہ فرماتے۔ بلکہ قصدِ روانگی سُن کر یہی فرمادیتے کہ جس میں سہولت دیکھیں وہی کریں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اپنی دلی کیفیت و محبت کا اظہار فرمادیتے مزاحاً فرماتے کہ "یہ آنا کیا ہوا۔ پانی بھی نہ ہُوا" مہمان کی راحت رسانی کی خاطر اس کی روانگی کے وقت کا خود خیال رکھتے۔ اور اگر روانگی کے وقت ان سے کچھ تغافل ہو جاتا۔ تو آپ خود خلاف دستور فرما دیتے کہ جانے کا وقت آگیا ہے۔ تاکہ ریل کے نکل جانے سے ان کو ان کے عزم کے خلاف نہ رکنا پڑے۔ اور افسوس نہ ہو۔ غرضیکہ ہر وقت ان کی راحت کے خیال میں رہتے۔

اہتمامِ راحت : حضرت تھانوی بتاکید فرمایا کرتے تھے کہ

"خانقاہ میں آنے والوں کی کسی بے عنوانی پر سوائے میرے حاضرینِ خانقاہ میں سے کوئی روک ٹوک نہ کرے۔ نہ ان کو بلا پوچھے کوئی مشورہ دے۔ روک ٹوک کے لیے کیا میں اکیلا کچھ کم ہوں۔ میں ہی بہت کچھ روکتا ٹوکتا رہتا ہوں۔ اگر دوسرے بھی روکیں ٹوکیں تو بے چارہ آنے والا پریشان ہو جائے۔ پھر ہر ایک کا روکنا ٹوکنا گوارا تو نہیں ہوتا۔ میرا روکنا ٹوکنا تو خیر اس لیے زیادہ ناگوار نہیں ہوتا۔ کہ میرے ہی قصد سے یہاں آتے ہیں۔ دوسروں کے روکنے ٹوکنے سے دل شکنی ہوگی۔ جو مجھے ہرگز گوارا نہیں۔ پھر ہر شخص کو نصیحت کرنا آتا بھی نہیں نیز اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ آنے والے دوسرے روکنے ٹوکنے والوں کو مقرب اور دخیل سمجھ کر ان سے

مرعوب و مغلوب ہوں گے۔ اور اپنی حاجات کا وسیلہ بنائیں گے اور اس طمع میں ہدایا وغیرہ سے ان کی خدمت کریں گے۔ جس سے فریقین کے لیے سینکڑوں مفاسد کا باب مفتوح ہو جائے گا۔ اور اس میں خود میرے لیے بھی یہ خرابی ہے کہ اپنے بہت سے معین و معاون دیکھ کر میرا بھی دماغ خراب ہو گا۔

اَب تو الحمد للہ میں کسی کو اپنا معاون و مددگار نہیں سمجھتا اللہ کے سوا کسی پر میری نظر نہیں۔ کہنے کی تو بات نہیں۔ لیکن اس وقت ذکر آہی گیا۔ تو کہتا ہوں کہ دنیا میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا سمجھتا ہوں۔ اور ایک اکیلے شخص کے ساتھ ایک اکیلی ذات ہے اور کوئی نہیں۔

لوگوں کی تو اپنے خدام اور محبین پر نظر ہوتی ہے۔ میری کسی پر بھی نظر نہیں۔ میری خشکی کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ میں کسی کو اپنا محب اور معین و معاون نہیں بنانا یا رکھنا چاہتا۔ ہر شخص سے تو آزادی کے ساتھ جو برتاؤ مناسب سمجھتا ہوں کرتا ہوں۔ الحمد للہ یہ کبھی وسوسہ ہی پیدا نہیں ہوا کہ ایسے برتاؤ سے فلاں شخص میرا ساتھ چھوڑ دے گا۔ اور یہ میں دعویٰ سے نہیں کہتا۔ بلکہ یہ کہتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے کہ خدا جانے اس میں کتنی واقعیت ہے اپنے تئیں تو واقعیت کے خلاف نہیں کہہ رہا۔ اگر کمی بیشی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

مبنی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری اس وضع

کو محض اپنے فضل و کرم سے نباہ رکھا ہے۔ کیونکہ وہ عین وقت پر میری غیب سے ہر حاجت پوری فرما دیتے ہیں۔ اور ایسے طریق سے میری راحت کا سامان مہیّا فرما دیتے ہیں۔ جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے میرا یہ طرز آزادی و استغنا کا نبھ رہا ہے۔ ورنہ اگر احتیاج ہوتی۔ تو سارا استغنا دھرا رہ جاتا۔ اور ساری آزادی رکھی رہ جاتی۔"

قواعد ملاقات نو وارد کو ابتدائی ملاقات کے لیے ان قواعد کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ آنے کے بعد فوراً مقیمین سے اوقات کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرے۔

۲۔ وہاں پہنچنے کے بعد جلد ہی ملاقات کرلے۔ کیونکہ نئے آنے والے کے لیے کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ تاکہ اُسے انتظار نہ کرنا پڑے۔

۳۔ سلام و مصافحہ کے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ حضرت باتوں میں مشغول نہ ہوں۔ اور ہاتھ بھی مصافحہ کے لیے خالی ہوں۔ آرام نہ فرما رہے ہوں۔ اگر مشغول بیٹھا دیکھیں۔ تو بیٹھ جائے۔ انتظارِ فراغت میں نہ کھڑا رہے کہ تقاضے کی صورت ہوتی ہے۔ جس سے قلب پر بار ہوتا ہے۔

۴۔ سلام و مصافحہ کے بعد فوراً اپنا پورا تعارف کرائے۔ بصورت خط و کتابت آخری خط پیش کرے۔ گفتگو بیٹھ کر اس طرح کرے کہ صاف سنائی دے۔ بات پوری کرے۔ ادھوری نہ کرے۔

۵۔ سوال کا جواب فوراً دے۔ انتظار میں نہ رکھے۔ اگر جواب ذہن میں نہ آئے۔ تو کہہ دے کہ پھر سوچ کر جواب دوں گا۔

۶۔ اگر کوئی غلطی ہو جائے۔ تو بلا تامل اور بلا تاویل اس کا اقرار کرلے۔ اور سبب دریافت کرنے پر اصل بات بتلا دے۔

۷۔ اگر کوئی خط یا پرچہ پیش کرنا ہو۔ تو سامنے رکھ دے اور کہہ بھی دے کہ یہ پرچہ ملاحظہ ہو اس کو ہاتھ میں نہ لیے رہے۔ کیونکہ یہ بھی صورت تقاضا کی ہے کہ دوسرے کام سے جلد ہاتھ فارغ کیا جائے۔

۸۔ اگر مصافحہ کی ضرورت سمجھے تو مصافحہ سے فارغ ہو کر پرچہ پیش کرے۔

۹۔ اگر اسے کھانے کے لیے کہا گیا ہو تو کھانے کے وقت خانقاہ میں حاضر رہے تاکہ تلاش نہ کرنا پڑے۔

۱۰۔ آنے کی غرض صاف صاف بتلا دے۔ تاکہ اس کے مطابق معاملہ ہو سکے۔

۱۱۔ مقیمین سے بکثرت میل ملاپ میں وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ ہر شخص اپنے اپنے کام میں لگا رہے۔ بلاضرورت کوئی کسی سے بات نہ کرے۔

۱۲۔ بلا اجازت مقیمین و نو واردین ایک دوسرے کی دعوت نہ کریں۔

۱۳۔ اہل قصبہ سے کوئی تعلق پیدا نہ کرے۔

غرضیکہ حضرت ہر شے کو اپنی حد پر رکھنا اور دیکھنا چاہتے تھے۔ جس سے قدم قدم پر سبق ملتا تھا۔

دستور خدمت حضرت تھانوی اس وقت تک کسی سے خدمت لینا پسند نہیں فرماتے تھے جب تک اس سے بالکل دل نہ کھل جائے۔ بلکہ جن سے دل مل بھی جاتا۔ ان سے بھی شاذ و نادر ہی اور کسی بہت ہی خفیف کام کی فرمائش فرماتے۔ البتہ اگر وہ جو سبقت کرتے تو منع نہ فرماتے۔ ان پر مسلط بھی نہ ہو جاتے کبھی کبھار ایسا ہوتا۔ کیونکہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ بعض کام خود ہی کرنے سے اچھے ہوتے ہیں۔ اور بعضوں کی خدمت زحمت تک پہنچ جاتی ہے۔ کیونکہ ان کو خدمت کرنے میں راحت پہنچے گی۔ ہر شخص پر یہ اطمینان

مزاج۔ عادت مختلف ہوتی ہے واقف کار ہی سمجھ سکتا ہے کہ کس طریق سے خدمت کرنے میں راحت پہنچے گی۔ ہر شخص پر یہ اطمینان بھی نہیں کہ یہ خلوص سے ہی خدمت کرے گا۔ کیونکہ بعد میں اغراض نکل آتی ہیں۔ اور بعض سے خدمت لینا طبعاً گراں ہوتا ہے۔ مثلاً اہل علم سے۔ سیّد سے اور بوڑھوں سے خدمت لیتے ہوئے گرانی ہوتی ہے۔"

خدمت کے زحمت ہونے کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"بعضے استنجا کے لیے سخت گرم پانی دے دیتے ہیں۔ جس کا استعمال کے وقت پتہ لگتا ہے اور اس وقت اسے معتدل کرنے میں کوئی صورت نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس طرح وضو کے لیے۔ سخت سرد یا سخت گرم پانی دے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے میں نے اب دو لوٹوں میں پانی منگانا شروع کیا ہے۔ نصف لوٹا سرد پانی کا اور دوسرا لوٹا گرم پانی کا۔ تاکہ حسبِ خواہش پانی ملا لیا جائے۔"

نیز فرمایا کہ:

"میں چاہتا ہوں کہ سب اپنے اپنے کام میں لگے رہیں۔ خواہ مخواہ میری خدمت کے لیے مجھ پر مسلط نہ ہوں۔ تاکہ وہ بھی آزاد رہیں اور میں بھی آزاد رہوں۔ کیونکہ آزادی بڑی دولت ہے۔ خلاصہ میرے مذاق کا حریت ہے۔ کہ چاہے اہانت ہو۔ چاہے تعظیم جس سے آزادی میں فرق آئے اپنی یا دوسروں کی۔ اس میں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اور ہر

مسلمان کا یہی مذاق ہونا چاہیئے کہ غیر اللہ سے بالکل آزاد
ہے۔ کیونکہ خدا کی عبدیت مخلوق کی عبدیت کے ساتھ کیسے
جمع ہو سکتی ہے اس لیے میں نے اپنی ضروریات اتنی مختصر کر
رکھی ہیں۔ کہ ان کو خود ہی پورا کر لیتا ہوں۔ کسی دوسرے کی
محتاجی بفضلہ تعالیٰ نہیں رہتی"۔

جو خدمت کرنا چاہتا۔ اجازت لیے بغیر نہ کر سکتا تھا۔ اور جسے روک دیتے تھے۔ اسے اصرار کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ یہ نہ صرف مضر بلکہ جانبین کے لیے باعث تکدر ہوتا تھا۔

نظم مجلس

حضرت تھانوی جب مجلس یا مسجد میں آتے۔ تو لوگ تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوتے یا مصلیٰ تک پہنچنے کے لیے اِدھر اُدھر بیٹھنے لگتے یا مڑ مڑ کر دیکھنے لگتے۔ یا مسجد کو آتے ہوئے پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیتے۔ اس کی از حد ممانعت بھی فرماتے تھے کہ:

"میرے آنے کی وجہ سے کوئی تغیر نہ ہونا چاہیئے۔ جو جس طرح
بیٹھا ہے بیٹھا رہا کرے۔ یہ مجھے بہت گراں گزرتا ہے کہ میرے
آنے کی وجہ سے ایک ہل چل سی پیدا ہو جائے۔ میرے لیے
جگہ دینے کا کوئی اہتمام نہ کرے۔ میں خود جدھر سے چاہوں گا
آزادی کے ساتھ مصلیٰ تک پہنچ جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ
نہ مجھ کو تکلیف ہو۔ نہ میری وجہ سے کسی دوسرے کو تکلیف
ہو۔ اور نہ ہی میرے پیچھے پیچھے آنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ
اس سے ایک شان اور نمود کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔
نیز اس سے وہ ناجائز فائدہ اُٹھا کر میرے پیچھے ہی دوسروں
کو ہٹا کر صف میں جگہ لے لیتے ہیں۔ جس کا ان کو کوئی حق

نہیں ہوتا۔"

مسجد کو جاتے وقت کسی کو راستہ میں مصافحہ کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ آپ عین وقتِ نماز کے قریب مسجد کو روانہ ہوتے اور راستہ میں مصافحہ وغیرہ سے قلتِ وقت کے باعث تاخیر اور تکلیف ہوتی۔ اور نہ ہی وظیفہ کے وقت مصافحہ کی اجازت تھی۔ کیونکہ اس طرح اس میں خلل پڑتا تھا۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کو بڑی غیرت آتی ہے کہ جو بندہ اس کے ذکر میں مشغول ہو اسے دوسری طرف متوجہ کیا جائے۔

نشست گاہِ خاص

آپ کی خصوصی نشست گاہ سہ دری تھی۔ جس کے درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل ڈسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر تشریف رکھتے تھے۔ اس کے پائین میں ایک گوشہ صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ جن کو کوئی ضروری بات کہنی ہو یا صرف ملاقات کرنی ہو۔ مستقل طور پر کسی کو وہاں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ اسے ضروری بات کرنے کے بعد وہاں سے اُٹھنا ہوتا۔ اور بیٹھنا چاہتا۔ تو وہاں سے اُٹھ کر مجلس عام میں آبیٹھتا۔ وہاں کسی کے آکر بیٹھنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ حضرت فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اور یہ جگہ مخصوص کرنے کا فائدہ یہ تھا کہ مجلس میں کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہو۔ اور نہ لطفِ کیف میں کوئی فرق پڑے۔

سہ دری کا مغربی حصّہ اہلِ خصوصیت کے ساتھ کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں صرف ایسے لوگ بیٹھتے۔ جن کو حضرت وہاں خود بیٹھنے کا ارشاد فرماتے یا جن کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ حضرت نے ان کو اس جگہ بیٹھنے کا اعزاز بخشا ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کو تکلیف کی اجازت نہ تھی۔ کہ وہ ہر دفعہ حضرت کے کہنے پر وہاں بیٹھیں۔ بلکہ انھیں خود بخود ہی وہاں بیٹھنا ہوتا۔

مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں کہ:

"بیٹھنے بٹھانے کے سب آداب اور قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے۔ ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ۔ ہر بات میں نظم و آہنگ۔ بعد ظہر مجلس عام میں یہ قاعدہ تھا کہ حضرت کے ہاتھ پر سہ دری میں جو وسیع جگہ پڑی ہوئی تھی۔ وہ عام طالبین اور واردین کے لیے تھی۔ ہر شخص جہاں جگہ پائے۔ بیٹھ جائے۔ کسی دوسرے کو نہ اٹھائے نہ کھسکائے بائیں جانب جگہ نسبتہً کم تنگ تھی۔ کوئی سات آٹھ شخصوں کے بیٹھنے بھر کی۔ ادھر مخصوصین بٹھائے جاتے تھے۔ دو چار شخص سامنے بھی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک ایک در کی دیوار کی آڑ میں۔ بغیر دوسرے کے حق میں حجاب بنے"۔

(حکیم الامت ص۲۳)

دیگر قواعد

۱۔ طالبین اور نوواردین کو حضرت کو بالخصوص و دیگران کو بالعموم ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔

۲۔ طالبین کو دوسروں کی طرف سے سلام و پیام۔ خط و ہدیہ وغیرہ لانے کی بھی عام طور پر ممانعت تھی۔

۳۔ طالبین و نوواردین کو سفارشی خطوط لانے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ امرِ دین میں سفارش کوئی اثر نہیں رکھتی۔ جبکہ وہاں سارا اہتمام ہی دینی تعلیم و تربیت کا تھا۔ البتہ اس سے دوسرے کو اپنی مرضی کے موافق کام کرنے پر مجبور کرنا ہوتا ہے۔ جو حضرت کو پسند نہ تھا۔

۴۔ نوواردین کو ہدیہ پیش کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ تاوقتیکہ مناسبتِ تامہ

پیدا نہ ہو جائے۔

۵۔ مسجد یا گھر کو آتے جاتے وقت راستہ میں مصافحہ یا بات چیت کرنا بھی ممنوع تھا کیونکہ آپ اکثر آمد و رفت کے دوران میں غور و فکر میں مشغول ہوتے تھے اور بسا اوقات بالعموم بعد از عصر قریب مغرب گھر واپس جاتے ہوئے راستہ میں کوئی مضمون پڑھتے ہوئے تشریف لے جاتے تھے اس طرح کسی کے مصافحہ کرنے یا مخل ہونے سے یکسوئی میں خلل پڑتا تھا۔

۶۔ راستہ چلتے وقت پشت کی جانب سے تخاطب تو داخل بد تہذیبی تھا۔ اور اسے بُرا بہت مناتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رح نے حضرت امام ابویوسفؒ کو وصیّت فرمائی تھی کہ اگر تم کو کوئی پشت کی طرف سے خطاب کرے تو اس کا جواب مت دو۔ اس نے تمھاری بڑی اہانت کی۔ اور اس نے تم کو گویا جانور سمجھا۔ کیونکہ جانوروں کو ہی پشت سے خطاب کیا جاتا ہے۔

۷۔ راستہ چلتے وقت کسی کا ـــــــ خواہ مخواہ ساتھ ہو لینا بھی ممنوع تھا۔ کیونکہ چلنے میں آزادی نہیں رہتی۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی راستہ میں اپنے ہمراہ کسی کو نہ چلنے دیتے تھے۔

۸۔ اسی طرح راستہ چلتے وقت پیچھے پیچھے چلنے کی بھی اجازت نہ تھی کہ یہ آپ کے اچانک رک جانے سے پہلے آدمی کو ٹکر لگنے کا امکان تھا۔ اگر کوئی پیچھے چلنا ہی چاہتا۔ تو اتنے فاصلہ پر رہنے کی اجازت تھی کہ پاؤں کی آہٹ نہ آئے۔

۹۔ رخصت ہوتے وقت رخصتی ملاقات کے لیے کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ صرف اتنی پابندی تھی کہ آتے ہی کہہ دے کہ میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ محض سلام و مصافحہ سے پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ آمد کا ہے یا رفت کا۔

۱۰۔ عین چلتے وقت تعویذ وغیرہ کی درخواست یا کوئی دیگر حاجت پیش کرنی بھی ممنوع تھی کیونکہ قلتِ وقت کے باعث جانبین کو تنگی ہوتی تھی۔

ان شرائط کی مفصل حکمتیں جاننے کے لیے اشرف السوانح حصہ دوم عنوان چہارم کا مطالعہ مفید رہے گا۔

ماجدی جائزہ

مولانا عبدالماجد دریابادی، اپنے مشاہدہ کی بناء پر کوائف خانقاہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"معمول یہ تھا کہ طالبین و سالکین کا تانتا ہر زمانہ میں بندھا رہتا تھا۔ یہ لوگ آتے اور اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کر کے خانقاہ میں ٹھہر جاتے۔ ان میں اچھے اچھے ذاکر و شاغل ہوتے۔ اور ان میں سے بعض تو اپنے کام میں ریاضت کی بناء پر خود قابلِ زیارت ہوتے۔ لیکن یہ لوگ ملنے ملانے کے ڈھب کے زیادہ نہ ہوتے۔ دن تو دن۔ رات کے بھی اگلے اور پچھلے حصوں میں اپنے کام میں لگے رہتے۔ اور کام سے مراد محض نوافل و اوراد ہی نہیں۔ ہاتھ پیر سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی ان حضرات کو تامل نہ ہوتا۔ سادگی۔ اخلاص بے طمعی بے نفسی کے بیسیوں سبق ان لوگوں کی زندگیوں کو دیکھ دیکھ کر سیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک تعداد حضرت کے مخصوص خلفاء کی بھی تھی۔ یہ عموماً اہلِ علم و اہلِ وجاہت ہوتے کوئی نہ کوئی ان میں سے بھی تھانہ بھون حاضر ہی ہوتا رہتا۔ خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب (بی اے۔ ایل ایل بی) انسپکٹر آف سکولز۔ مولانا محمد طیب مہتمم (دارالعلوم)

دیوبند مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی (مفتیِ اعظم پاکستان) طبیبِ حاذق مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری میرٹھی۔ اس وقت نام خیال میں آرہے ہیں۔ اس قسم کے حضرات سے بھی تھانہ بھون کے طویل قیام کے دوران میں ضرور ملاقات ہو جاتی۔ ایک تیسرا طبقہ مولانا کے ذاتی مہمانوں کا ہوا کرتا۔ اور ان میں سے اکثر علم و دین کے مشاہیر ہی ہوتے۔ آج شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاسؒ کی دہلی سے آمد ہے۔ کل مدرسہ مظاہر العلوم کے مولانا عبد اللطیف صاحب اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپور سے آرہے ہیں اور پرسوں رائے پور کے مشہور بزرگ شیخ عبد القادر صاحب جنہیں پہنچانے کے لیے مولانا خود اسٹیشن تک گئے۔ اور ان کے پیچھے ان کا ذکرِ خیر بار بار کرتے رہے۔" (حکیم الامت ص ۱۳۹)

قواعد و ضوابط کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا قواعد و ضوابط کے محکوم نہ تھے۔ قاعدے اور ضابطے سب ضرورۃً اور سہولت کے لیے بنائے گئے تھے۔ یہ نہ تھا کہ اپنے اور دوسروں کے ہاتھ باندھ دینے کے لیے خواہ مخواہ کچھ ضابطے عائد کر لیے ہوں۔ یہ واقعہ خاص اس لیے درج کیا جاتا ہے کہ مولانا کو ایک گروہ ضابطہ پرستی میں بدنام کر چکا ہے۔ بدنامی تمام تر بے جا ایسے لوگوں نے قریب سے حضرت کو دیکھا نہیں۔" (حکیم الاُمت ص ۸۹)

انوارِ الٰہی

مولانا حافظ محمد عمر علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے صاحبِ حال بزرگ تھے نے اپنے اس مشاہدہ کا مولوی حافظ جلیل احمد رئیس علی گڑھ سے جو حضرت کے خلیفہ مجاز تھے۔ ایک بار ذکر فرمایا کہ:۔

"ایک رات ریل کے ذریعہ تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ تو جب ریل خانقاہ کے محاذ سے گزری تو میں نے عالمِ بیداری میں دیکھا کہ مسجدِ خانقاہ کے گنبد سے آسمان تک انوار کا ایک تار لگا ہوا ہے۔"

تصوّف

شریعت و طریقت

اسلام کی تمام تعلیمات کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے۔ جس کی ابتدائی تعلیم مجلس نبوی میں دی جاتی تھی۔ وہ چونکہ ابتدائی دور تھا اور حلقہ بگوشانِ اسلام اپنے اصلی مرکز میں موجود تھے۔ جن کی تعداد بھی اس وقت اتنی زیادہ نہ تھی۔ جتنی بعد میں ہو گئی۔ اس لیے اس نبوی یونیورسٹی میں علومِ اسلام یعنی علم تفسیر۔ علم حدیث۔ علم فقہ اور علمِ تصوف کی تعلیم یکجا دی جاتی تھی۔ کوئی الگ الگ دفتر قائم نہ تھے۔ البتہ اسی نبوی یونیورسٹی میں ایک اقامتی شعبہ ایسا بھی موجود تھا۔ جس میں محبانِ خدا اور عاشقانِ رسولؐ تزکیۂ نفس و اصلاح باطن کی عملی تعلیم و تربیت کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور اصحابِ صفہ کہلاتے تھے۔

بعد ازاں جب اسلام عالمگیر حیثیت اختیار کر گیا۔ تو اس کی تعلیمات کو علماءِ دین نے الگ الگ دفاتر میں منضبط کر دیا۔ جنھوں نے علمِ حدیث کی خدمت کی۔ وہ محدث کہلائے جنھوں نے علمِ تفسیر کا کام سنبھالا۔ وہ مفسر بنے۔ جو فقہ کا کام کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وہ فقیہہ بن گئے اور جنھوں نے صرف تزکیۂ نفس و اصلاح باطن کا شعبہ سنبھالا وہ ——— صوفیاء مشہور ہوئے۔

اکابر سلف میں سے کسی نے شریعت کو طریقت سے الگ نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ طریقت کو شریعت کے تابع رکھا۔ یہاں تک کہ تصوف کو بطور فلسفہ پیش کرنے والے سب سے پہلے مصنف شیخ ابن عربی نے بھی (جن پر بعض ظاہرین علماء نے کفر تک کا فتویٰ صادر کر دیا تھا) صاف طور پر لکھا ہے کہ :-

اقسامِ مشائخ

"مشائخ صوفیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو کتاب و سنت کے عارف ہیں۔ ظاہر میں کتاب و سنت کے موافق باتیں کرتے ہیں۔ اور باطن میں کتاب و سنت سے رنگے ہوتے ہیں۔ اللہ کے حدود کی نگہبانی کرتے ہیں۔ اس کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور احکام شرعی کی پابندی کرتے ہیں۔ اُمت پر شفقت کرتے ہیں۔ کسی گنہگار کو حقیر و ذلیل نہیں کرتے۔ اللہ کو جو محبوب ہے اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اللہ کو جو مغبوض ہے اس سے بغض رکھتے ہیں۔ اللہ کے راستے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اچھی باتوں کا امر کرتے ہیں۔ اور متفق علیہ منکر سے منع کرتے ہیں۔ یہ حضرات وہ ہیں جن کا اقتداء کیا جاتا ہے۔ ان کا احترام واجب ہے۔ یہی ہیں جن کی صورت دیکھنے سے خدا یاد آتا ہے۔"

دوسری قسم کے مشائخ وہ ہیں۔ جو صاحبِ احوال ہیں۔ ان کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ ظاہر میں ان کے اندر (شریعت کا وہ) تحفظ نہیں (جو پہلی قسم کے مشائخ میں ہوتا ہے نہ وہ اختیاط ہے جو ان میں ہوتی ہے) ان کے احوال کو تو تسلیم کر لیا جائے مگر ان کی صحبت اختیار نہ کی جائے۔ اگر ان سے کچھ کرامات

بھی ظاہر ہوں تو ان پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ جبکہ ان کے اندر شریعت کے ساتھ سوء ادب موجود ہے۔ کیونکہ ہمارے لیے اللہ تک پہنچنے کا راستہ اس راستہ کے سوا کوئی نہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے شریعت میں مقرر فرما دیا ہے۔ تو جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تک پہنچنے کا راستہ شریعت کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا قول غلط اور جھوٹ ہے۔ پس جس میں (شریعت کا) ادب نہ ہو۔ اس کی اقتداء نہ کی جائے گی۔ اگرچہ وہ اپنے حال میں سچا ہو۔" (فتوحات باب ۱۸۱)

اقوالِ صوفیاء

اسی سلسلہ میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اگر تم کسی کو کرامات والا دیکھو۔ حتیٰ کہ ہوا میں اڑتا ہو۔ تو دھوکے میں نہ آجانا۔ جب تک یہ نہ دیکھو کہ امر و نہی۔ حفظ حدود اور پابندی شریعت میں کیسا ہے۔"

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ:۔

"مخلوق پر سب راہیں بند ہیں۔ سوا اس کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم چلے۔"

حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

"جس کو دیکھو کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے۔ جو اس کو حد شرعی سے باہر کر دیتا ہے۔ تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔"

ان حقائق و شواہد سے ظاہر ہے کہ طریقت شریعت سے الگ نہیں ہو سکتی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

تصوّف اور قرآن

چنانچہ قرآن کریم میں بھی دونوں کے احکام پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اور دونوں کو اس طرح برابر کی حیثیت دی گئی ہے۔ کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنے سے اصل مقصود یعنی رضائے حق کا حاصل ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حضرت تھانوی "حقیقتِ تصوّف" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"شریعت کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے۔ وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے۔ جیسے کلمہ پڑھنا۔ نماز روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ ماں باپ کی خدمت۔ ان کو مامورات کہتے ہیں۔ اور کلمات کفر کہنا۔ شرک کے افعال کرنا۔ زنا۔ چوری۔ سود خواری۔ رشوت وغیرہ ان کو مناہی کہتے ہیں۔ بعض اعمال ایسے ہیں کہ جن کا تعلق باطن سے ہے۔ جیسے ایمان و تصدیق۔ عقائد حقہ۔ صبر و شکر توکل و رضا۔ بقضا تفویض و اخلاص۔ محبتِ خدا اور رسول وغیرہ۔ ان کو مامورات و فضائل کہتے ہیں۔ اور عقائد باطلہ۔ بے صبری و ناشکری۔ ریاء و تکبر عجب وغیرہ۔ یہ مناہی و رذائل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

جس طرح قرآن شریف میں اقیموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ موجود ہے۔ اسی طرح یاایھا الذین آمنوا اصبرو (ایمان دارو صبر کرو) اور واشکروا اللہ (اللہ کا شکر بجالاؤ) بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر کتب علیکم الصیام اور للہ علی الناس حج البیت پاؤ گے۔ تو دوسرے مقام میں یحبھم و یحبونہ اور والذین آمنوا اشد حبًا للہ بھی دیکھو گے۔ جہاں اذا قاموا

الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ ہے۔ اس کے ساتھ ہی یراؤن الناس بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام میں تارک نماز و تارک زکوٰۃ کی مذمت ہے۔ تو دوسرے مقام میں تکبر و عجب کی بُرائی موجود ہے۔ اسی طرح احادیث کو دیکھو۔ جس طرح ان میں ابواب نماز۔ روزہ۔ بیع و شرا۔ نکاح و طلاق پاؤ گے۔ ابواب ریا و سمع و کبر وغیرہ بھی دیکھو گے۔

اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں۔ اسی طرح اعمالِ باطنہ بھی حکم الٰہی ہیں۔ کیا اقیموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے اور اصبروا و اشکروا امر کا صیغہ نہیں۔ کیا کتب علیکم الصیام سے روزہ کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے اور والذین امنوا اشد حبًا للہ سے محبت کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لیے ہیں۔ اور باطن کی صفائی مقصود و موجب نجات اور اس کی کدورت موجبِ ہلاکت ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا	بیشک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا ناکام رہا۔
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔	جس دن مال و اولاد کام نہ آئیں گے۔ مگر جو شخص کہ اللہ کے پاس سلامت قلب لے کر آیا۔

دیکھو پہلی آیت میں تزکیہ باطن کو موجب فلاح اور دوسری میں سلامتی قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بنا دیا گیا ہے۔

ایمان و عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے قلب ہی کا فعل ہے اور ظاہر ہے کہ جتنے اعمال ہیں۔ سب ایمان ہی کی تکمیل کے لیے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے۔ جس سے انسان مقبول بارگاہ اور صاحبِ مدارج و مقام ہوتا ہے اور اس کا نام اصلاح و عرف میں تصوف ہے"۔

حقیقتِ تصوّف گویا کہ تصوف دین کی روح و معنیٰ یا کیف و کمال کا نام ہے۔ جس کا کام باطن کو رذائل یعنی اخلاق ذمیمہ شہوت۔ آفاتِ لسانی۔ غضب۔ حقد۔ حسد۔ حب دنیا۔ حب جاہ۔ بخل۔ حرص۔ ریا۔ عجب۔ غرور سے پاک کرنا اور فضائل یعنی اخلاق حمیدہ توبہ۔ صبر۔ شکر۔ خوف۔ رجا۔ زہد۔ توحید۔ توکل۔ محبت۔ شوق۔ اخلاص۔ صدق مراقبہ۔ محاسبہ تفکر سے آراستہ کرنا ہے۔ تاکہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔ جو مقصودِ حیات ہے۔

اس لیے تصوف و طریقت دین و شریعت کے قطعاً منافی و مغائر ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے کہ وہ صوفی بنے کہ اس کے بغیر فی الواقعہ مسلمان مسلمان کہلانے کا مستحق ہی نہیں رہتا۔

صورتِ حال مگر اَب تصوف کی حقیقت پر بدعات و رسومات بلکہ خرافات نے اتنے پردے ڈال دیے ہیں کہ اس کی صورت ہی مسخ کر کے رکھ دی ہے اور بقول مورخ اسلام سید سلیمان ندوی رحؒ:۔

"صوفیانہ خانوادوں کی جہالت اور موروثی گدی نشینی کی متواتر رسم نے اللہ تعالیٰ کی بخشش اجتہاد اور مقبولیت کو

کو بھی ایک صنعت گری کا کارخانہ بنا رکھا تھا۔ خانقاہوں کا کام صرف اعراس و فاتحہ کا اہتمام اور سماع و رقص و قوالی کا انصرام رہ گیا تھا۔ مقررہ دنوں اور مہینوں میں کچھ لوگ جمع ہو کر فاتحہ خوانی کر لیں۔ اور زیادہ بڑھیں تو ایک جگہ جمع ہو کر کسی سازندہ ترانے پر ہو حق کر لیں۔ اور زیادہ بڑھیں تو وحدت الوجود کی آڑ پکڑ کر شوخی و بیباکی اور رندی کے اشعار و مضامین پڑھ لیں۔ اور سر دھن لیں۔ چند سینہ بسینہ راز تھے۔ جن کو بے سمجھے بوجھے بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ تصحیح عقائد تحسین عبادت۔ اتباع سنت اصلاح اعمال اور ادائے حق عباد جو اصل دین اور صحیح سلوک تھا۔ وہ ہر جگہ سے مٹ چکا تھا۔ علماء ظاہر چونکہ باطن کے منکر تھے۔ یا باطن سے نا آشنا تھے۔ اس لیے ان کے پند و نصائح کی حیثیت صوفیوں میں تقبیح ناشناس سے زیادہ نہ تھی۔ اور علماء ظاہر چونکہ باطن سے منکر یا نا آشنا تھے۔ وہ ان دکاندار صوفیوں کو دیکھ کر اصل فنِ سلوک کو ضلالت و گمراہی قرار دینے لگے تھے۔ اور اس کے اصول و مسائل کو خلافِ شریعت و مخالف کتاب و سنت سمجھتے تھے۔ اس لیے عمومی طور پر تدوینِ فن۔ ترتیب اصول۔ تحقیق مسائل۔ تالیف رسائل اصل سلوک کے مضامین کو کتاب و سنت کی اور سلف صالحین اور اولیائے کاملین کی تشریح و توضیح سے ملا کر دیکھنے کے کام کہیں نہیں ہو رہے تھے۔ نہ خطب و مواعظ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کے خیالات کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی تھی۔ نہ ردِ شبہات و دفع

شکوک۔ رفع اوہام کے لیے کوئی سلسلہ تھا اور سالکین کی ظاہری و باطنی تربیت کی کوئی ایسی درس گاہ تھی۔ جس میں راہ کی مشکلات کو علمی و فنی طریق سے بنایا اور سکھایا جاتا ہو اور نہ کہیں کوئی ایسی مسند بچھی تھی۔ جہاں شریعت و طریقت کے مسائل پہلو بہ پہلو بیان کرتے ہوں جہاں تفسیر و فقہ و حدیث کے ساتھ امراض قلب کے علاج کے نسخے بتلائے جاتے ہوں۔ جو کتاب و سنت میں موجود ہیں۔ جہاں جس قلم سے احکامِ فقہی کے فتاوے نکل رہے ہوں۔ ایسی قلم سے سلوک و طریق کے مسائل بھی شائع ہو رہے ہوں۔ جس منبر سے نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ کے فقہی مسائل واشگاف بیان کیے جا رہے ہوں۔ اس منبر سے اُن کی روحانی حقیقت اور اُن کی قلبی ادا کاری کے طریق بتائے جا رہے ہوں۔“ (تجدید تصوف و سلوک صـ ۱۳)

تجدیدِ تصوّف

جاہلیّت کے اس دور میں حق تعالیٰ نے پھر ایک ایسا حکیم الاُمّت اور مجدّدِ ملّت بھیج دیا جس نے متذکرہ بالا تمام خامیاں دُور اور ضرورتیں پوری کر کے دربارِ نبوی کی یاد تازہ کر دی۔ اُنھوں نے نہایت کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ:۔

”لوگوں کو علم کی فکر تو ہے لیکن عمل کی نہیں۔ اس کا بڑا اہتمام ہوتا ہے کہ ساری کتابیں پوری کر لیں۔ ہدایہ بھی۔ قدوری بھی۔ شمس بازغہ بھی۔ لیکن عمل کی ذرا بھی پروا نہیں حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا اتنا کمال نہیں۔ شیطان بھی بہت بڑا

عالم ہے ۔ بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے ۔ تفسیر میں وہ ماہر۔ حدیث سے وہ واقف ۔ فقہ میں وہ کامل اور اگر یہ سب علماء سے زیادہ نہ جانتا ہو تو ان کو بہکا کیسے سکتا ہے ۔ شیطان میں اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ وہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا ۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایسا علم جو عمل کے لیے نہ ہو جہنم کا ذریعہ ہے ۔" (مواعظ اشرفیہ ص۵۰)

عمل کی ترغیب دینے کے بعد آپ نے تصوّف کی اہمیت کا یوں احساس دلایا کہ :-

"تصوّف کے بغیر کام نہیں چل سکتا ۔ کیونکہ سب سے اوّل چیز تصوّف میں تواضع ہی کی تعلیم ہے ۔ جس کو اصطلاح میں فنا کہتے ہیں ۔ عموماً تو تصوّف میں یہ سب سے آخر مقام سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن درحقیقت سب سے اوّل مقام بھی فنا ہی ہے اور سب سے آخر مقام بھی فنا ہی ہے کیونکہ فنا کے درجات ہیں ۔ باقی بدوں فنا کے تو کوئی اس طریق میں ایک قدم بھی نہیں سکتا ۔ خواہ لاکھ درود وظیفے پڑھے یا لاکھ تسبیحیں پھیرے ۔

لوگ کہتے ہیں کہ حجروں میں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا میدان میں آنا چاہیئے ۔ میں کہتا ہوں کہ حجروں ہی میں بیٹھنے سے میدان کی قابلیّت پیدا ہوتی ہے ۔ جیسے ریڈیو حجرہ میں ہی رکھا جاتا ہے پھر اس سے تقریریں نشر ہو کر تمام عالم میں ہل چل پڑ جاتی ہے ۔ سعد بن وقاص رضؓ ایک معرکے میں امیرِ لشکر تھے ۔ اور دنبل نکل آنے کی وجہ سے نقل و حرکت سے معذور تھے ۔ پھر بھی اپنے خیمہ میں بیٹھے بیٹھے فوج کی کمان کر رہے

تھے (بلکہ جب نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی بدر سے پہلے حرا تھا۔ تو بدیگراں چہ رسد)"۔

(الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۷۸)

سلاسل اربعہ

آپ نے آج کل کے مدعیانِ تجدد کی طرح اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بنائی۔ بلکہ اپنی تمام تعلیمات کی بُنیاد کتاب و سنّت اور اتباع سلف صالحین پر رکھی۔ اور عوام کو تربیتِ باطن کے چاروں سلسلوں یعنی چشتیہ۔ نقشبندیہ۔ قادریہ۔ سہروردیہ کے مشائخ عظام اور تربیتِ ظاہر کے چاروں سلسلوں شافعی۔ حنفی۔ مالکی۔ حنبلی کے آئمہ کرام کی تعظیم و تکریم کی تاکید کی اور لکھا کہ :۔

"اللہ و رسول ؐ نے دین کی سب باتیں قرآن و حدیث میں بندوں کو بتلا دیں۔ اب کوئی نئی بات نکالنا دین میں درست نہیں۔ ایسی نئی بات کو بدعت کہتے ہیں۔ بدعت بہت بڑا گناہ ہے۔ البتہ بعض باریک باتیں دین کی جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتیں اگلے عالموں نے اپنے علم کے زور سے قرآن و حدیث سے سمجھ کر دوسروں کو بھی بتلا دیں۔ ایسے لوگ مجتہد کہلاتے ہیں۔ مجتہد بہت ہوئے ہیں۔ ان میں چار بہت مشہور ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رح۔ امام شافعی رح۔ امام مالک رح۔ امام احمد رح۔ جس کو جس مجتہد سے زیادہ اعتقاد ہو۔ اس کی پیروی اختیار کرے۔

اسی طرح نفس کے سنوارنے کے طریقے قرآن و حدیث کے موافق اولیاء اللہ نے اپنے دل کی روشنی سے سمجھ کر بتلائے۔ ایسے لوگ شیخ کہلاتے ہیں۔ شیخ بھی بہت ہوئے ہیں

مگر ان میں چار زیادہ مشہور ہیں :۔

۱۔ خواجہ معین الدین چشتی رح

۲۔ حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی رح

۳۔ شیخ شہاب الدین سہروردی رح

۴۔ خواجہ بہاؤ الدین نقشبند رح

جس مجتہد اور شیخ سے اعتقاد ہو اس کی پیروی کر کے دوسروں کو بُرا سمجھنا درست نہیں اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ تو اس میں پیروی نہیں"۔ (تعلیم الدین باب العقائد)

اسی کتاب کے باب الوصایا میں آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے بھی نقل فرما کر اس پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرمائی کہ :۔

"مذاہب میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے کہ حنفیوں کا مذہب سب سے اچھا ہے یا شافعیہ کا مذہب سب سے بڑھ کر ہے ۔ اپنے مذہب پر عمل کرتا رہے نہ صوفیوں کے طریق میں سے ایک دوسرے پر ترجیح دے ۔ کہ چشتیہ کے نسبت بڑے زور کی ہے دوسرا کہے واہ نقشبندیوں میں اتباعِ سنّت زیادہ ہے اور اس قسم کے خرافات سے بچتا رہے اور جو لوگ مغلوب الحال ہیں ۔ یا کسی تاویل سے کوئی امر کرتے ہیں جو اس شخص کے نزدیک خلافِ سنّت ہے۔ ان کو بُرا بھلا نہ کہے ۔ اور خود وہی کرے جو قواعد شرعیہ کے موافق ہو"۔

جامع اصول

اِس سلسلہ میں آپ نے یہ جامع اصول تجویز فرمایا کہ :۔

"بعض حضرات میں قبول کے علامات ظاہر ہیں اور منجملہ ان علامات کے علمائے محققین کا حسن ظن بھی ہے۔ ان کے ساتھ حُسنِ اعتقاد رکھّے۔ اور ان کے کلام میں اگر کوئی امر ظاہراً خلافِ سوادِ اعظم دیکھے۔ تو اپنا اعتقاد اس کے موافق نہ رکھّے۔ نہ اس کو کسی کے سامنے نقل کرے۔ نہ ایسی کتابوں کا خود مطالعہ کرے۔ جب تک کسی شیخ سے نہ پڑھ لے۔ کیونکہ ان حضرات کا مقصود عوام کے لیے تدوین نہیں بلکہ عوام سے اخفا فرماتے تھے۔ لہٰذا اعتقاد سوادِ اعظم کے موافق رکھے اور اس کلام میں اگر تاویل ممکن ہو تو تاویل کرے۔ ورنہ غلبۂ حال پر محمول کرے یا دشمنوں کے ملحق کر دینے کا احتمال کرے۔ یا مثل متشابہات کے اس کو مفوض بہ حق کرے۔ کیونکہ گو وہ معصوم نہ تھے۔ لیکن شریعت کے بے حد متبع تھے۔ چنانچہ غیر معذور سے اگر کوئی فعل خلافِ شریعت ظاہر ہو۔ تو اس پر ان سے خود نکیر منقول ہے اور اس لیے احکام میں خود ان سے ایسا امر منقول نہیں۔ (جو شریعت کے خلاف ہو) صرف بعض "اسرار" منقول ہیں۔ جن کی بنیاد ذوق کشف پر ہے۔ اور تعبیر خاص اصطلاح میں کی گئی ہے۔ اور ان دونوں چیزوں سے چونکہ عوام اور اہلِ ظاہر بے بہرہ ہیں۔ اس لیے ان کے کلام کے معارضِ شریعت ہونے کا یہ لوگ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ گو ظاہری (علم و فضل کے اعتبار سے) ان سے بڑھے ہوئے ہوں۔ اس لیے ان کو اجمالاً تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ورنہ گستاخی سے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔

البتہ جو شخص ایسا محقق ہو۔ اس کو حق ہے کہ ایسے کلام پر مفصلاً ردّ کرے۔ خواہ "خطائے اجتہادی" کے درجہ میں اور خواہ ابطال کی حد تک"۔

مجاہداتِ اربعہ

اربابِ تصوّف تزکیۂ نفس کے لیے سالکین سے بعض مجاہدات و ریاضیات بھی کراتے ہیں۔ جن میں قلّتِ طعام۔ قلّتِ منام۔ قلّتِ کلام اور قلّتِ اختلاط مع الانام خاص طور پر مشہور ہیں۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وقت سے اب تک ان پر مسلسل اور متواتر عمل کیا جا رہا تھا۔ اور کسی نے اس امر کی طرف توجہ نہ دی تھی کہ آیا یہ مجاہدات اس زمانہ کے طبائع و اذواق کے موافق بھی ہیں یا نہیں۔ حضرت تھانوی نے ان مجاہدات کے لیے بھی زمانہ حال کے حالات کے مطابق ترامیم کیں اور ان کو اتنا آسان کر دیا کہ ہر شخص بآسانی ان پر عمل کر سکے۔ فرماتے ہیں:۔

"زُھد ترکِ لذّات کا نام نہیں۔ محض تقلیل لذّات کافی ہے۔ یعنی لذّات میں انہماک نہ ہو۔ کہ رات دن اسی فکر میں رہے۔ یہ چیز زہد کے منافی ہے۔ ورنہ اگر بلا تکلّف اور بلا اہتمامِ خاص کے لذّات میسّر آئیں۔ تو یہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے شکر کرنا چاہیئے صحّت کی بہت حفاظت کرے۔ دل و دماغ کی تفریح و تقویت ہمیشہ غذاً و دواً کرتا رہے۔ غذا ایسی نہ اتنی کمی کرے کہ ضعف پیوست ہو جائے۔ نہ اس قدر افراط کہ ہضم میں فتور ہو جائے۔

بہت کم کھانا بھی زہد نہیں۔ نہ یہ مقصود ہے۔ کیونکہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے خزانہ میں کوئی توفیر تھوڑا ہی ہو جائے۔ ہاں اتنا بھی نہ کھایئے کہ پیٹ میں درد ہو جائے۔ ہمارے حاجی (امداد اللہ رح) صاحب کا مذاق تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام سے رکھّے۔ لیکن اس سے کام بھی نہ لے۔ میرا تو خیال ہے کہ "مزدور خوش دل کند کار بیش"۔

حضرت حاجی صاحب نے ایک روز فرمایا کہ میاں اشرف علی! پانی ہمیشہ ٹھنڈا پیو کہ ہر بُن مُو سے الحمدللہ نکلے۔ ورنہ گرم پانی پی کر زبان تو الحمدللہ کہے گی۔ دل شریک نہ ہوگا۔

اِسی طرح سونے میں اعتدال رکھئے۔ نہ اتنا زیادہ سوئے کہ کسل ہو جائے نہ بہت کمی کرے۔ کہ یبوست (خشکی) ہو جائے۔"

البتہ کثرت کلام پر تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"زیادہ گوئی قابل ترک ہے۔ حضرات عارفین کا مشاہدہ ہے۔ کہ ضروری گفتگو دن بھر بھی ہوتی رہے۔ تو اس سے قلب پر ظلمت کا اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک کنجڑا دن بھر "لے لو امرود" پکارتا پھرے۔ تو ذرّہ برابر قلب میں اس سے غفلت نہ آئے گی۔ کیونکہ یہ بضرورت ہے اور بے ضرورت ایک جملہ بھی زبان سے نکل جائے۔ تو دِل سیاہ ہو جاتا ہے۔"

اِسی طرح لوگوں سے تعلق بڑھانے کو سخت مضر بتایا کہ:۔

"اگر تم ارتباط بالاحباب کی وجہ سے معمولات کو ناغہ کرو گے۔ تو ایک دن بالکل کورے ہو جاؤ گے۔ من لاوِرد لہٗ لاوارِد لہٗ"

چنانچہ انہی اصول و قواعد کے تحت آپ سالکین کی تعلیم و تربیت فرماتے رہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے:

مجاہدۂ نفس

ضرورت نگرانی

یوں تو انسان اپنی ہر چیز کی نگرانی اور حفاظت کرتا ہے۔ مگر جس چیز کی زیادہ نگرانی کی ضرورت ہے۔ اس سے بالعموم غفلت برتی جاتی ہے۔ یعنی انسان اپنے نفس کی اتنی نگرانی نہیں کرتا۔ حالانکہ فی الحقیقت مال کا ضیاع نفس کے معصیت میں مبتلا ہونے کے ابتلا سے کم تر ہے۔ کیونکہ دولتِ باطنی کے بقا کا تمام تر دارومدار نفس کی نگہداشت پر ہے۔ اور باطن کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت شیخ اکبر قدس سرہ العزیز اپنے رسالہ الامر المحکم المربوط فیما یلزم اصل طریق اللہ من الشروط میں لکھتے ہیں کہ:

"پس جبکہ شیخ ہر روز اپنے حالات کی نگرانی اسی طریق سے نہ کرے۔ جس سے اس کی یہ تمکین (یعنی دوام اطاعت اور کثرت ذکر کی عادت) حاصل ہوتی ہو۔ تو (عجب نہیں) کہ وہ دھوکہ میں پڑ جائے۔ اور آہستہ آہستہ طبیعت اور عادت قدیمہ اس کو اپنی طرف کھینچ لے۔ اور پھر وہ خلوت میں بھی رہنا چاہے۔ تو اُنس حاصل نہ ہو۔ بلکہ خلوت سے وحشت ہونے لگے۔ اور یہی حال ہے ان تمام حالات و کیفیات کا۔ جو نفس کی طبیعت و جبلت کے موافق نہیں۔ کہ ان حالات کے حصول پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ بہت سریع الزوال

ہوتے ہیں اور ہم نے بہت سے مشائخ کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے درجہ سے گر گئے ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ان کو عافیت عطا فرمائے (آمین) حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔ ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسہ الشر جزوعا و اذا مسہ الخیر منوعا ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نفس کے تمام رذائل کو جمع فرمایا اور بیان فرما دیا ہے کہ جتنے فضائل نفس کو حاصل ہیں وہ اس کے جبلی اور طبعی نہیں ۔ اس لیے ان کا تحفظ واجب ہے ۔"

اسی طرح شیخ ابو مدین مغربی جو حضرت شیخ اکبرؒ کے مشائخ میں سے ہیں ۔ طبقات کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ :-

"جو درویش اپنی (باطنی) زیادتی اور کمی کو ہر دم محسوس نہ کرتا رہے ۔ وہ درویش نہیں ۔"

شاہانِ طریق کی اس تحقیق کے آئینہ میں جب ہم حضرت تھانوی کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں ۔ تو آپ کو ہر وقت نگرانی نفس میں مشغول پاتے ہیں ۔ جو شخص خود اپنے نفس کی نگرانی و نگہداشت نہ کر سکے وہ دوسروں کی نفسانی امراض کا کماحقہٗ علاج کیسے کر سکتا ہے ؟ اسی لیے حضرت تھانوی کے ہاں ظاہری ریاضات و مجاہدات کی طرف بالکل اعتنا نہیں برتا جاتا تھا ۔ مگر باطنی مجاہدات کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی ۔ جس کی بنا پر آپ فرمایا کرتے تھے کہ :-

"میرے طریق میں تو عمر بھر لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں ۔ گویا جنم کا روگ لگ جاتا ہے ۔ میرے یہاں تو وہ آوے جس کو رات دن اپنے نفس پر آرے چلانے ہوں ۔"

شاہی سلوک

مگر یہ آرے بھی سرتاسر قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق ہی چلانے

پڑتے تھے۔ دوسرے مشائخ کی طرح یہاں یہ دستور نہ تھا کہ اپنے مریدین سے گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے ذکر و شغل کرا لینا اور پھر انھیں خلافِ شرع وضع قطع وغیرہ اُمور میں بالکل آزاد چھوڑ دینا حضرت تھانوی کا تو یہ اصول تھا کہ نہ ریاضیات کراتے تھے۔ نہ مجاہدات۔ نہ ترکِ تعلقات کراتے تھے۔ نہ ترکِ لذات و مباحات۔ بلکہ تاکید فرماتے تھے کہ :-

"خُوب راحت و آرام سے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو۔ اور طبیعت میں نشاط رہے۔ جو معین عبادات ہو۔ البتہ معصیت کے پاس سے نہ پھٹکو اور نفس کی ہر وقت نگرانی رکھو۔ اور ہمت سے کام لو۔ اور بقدر تحمّل و فرصت کچھ ذکر و شغل بھی کرتے رہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ مقصود کا حصول یقینی ہے۔ نہ کم کھانے کی ضرورت ہے۔ نہ کم سونے کی یہ دونوں مجاہدے آج کل متروک ہیں۔ کیونکہ طبائع میں پہلے ہی ضعف غالب ہے۔ البتہ کم بولنا اور کم ملنا جُلنا ضروری ہے لیکن نہ اتنا کہ قلب میں انقباض پیدا ہو جائے۔"

اور اسی پہ آپ کا عمل تھا۔ جس پہ ایک حقیقت شناس نے کہا :-

"حضرت تھانوی کا سلوک تو شاہی سلوک ہے۔"

فریبِ نفس

ایک دفعہ ایک صاحب نے کسی کے ترکہ سے پانچ سو روپیہ بذریعہ بیمہ مصارف خیر کے لیے حضرت تھانوی کی خدمت میں بھیجے۔ مگر اس کے بھیجنے کے متعلق پہلے اجازت نہ لی۔ اس لیے حضرت نے حسبِ معمول بیمہ واپس کر دیا۔ اس پہ اُنھوں نے ایک معذرت نامہ بھیجا اور روپیہ بھیجنے کی اجازت چاہی۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ اس پانچسو روپیہ میں زیادہ حصّہ تو ان ورثا کا ہے جو اسے مصارفِ خیر

میں صرف کرنے کی اجازت دے چکے ہیں اور قلیل حصّہ ایسے ورثاء کا ہے۔ جن سے اس امر کی اجازت حاصل نہیں کی گئی۔ اس لیے حضرت تھانوی نے کلی طور پر ممانعت لکھ بھیجی کہ چونکہ بعض ورثاء کی اجازت حاصل نہیں کی گئی اس لیے یہ رقم نہ بھیجی جائے۔

"مجلسِ عام میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت نے اس فضیلت کا انکشاف فرمایا کہ :۔

"ممانعتِ کلی لکھتے وقت میرے نفس نے کہا کہ رقم کے اس حصّہ کی تو بھیجنے کی اجازت لکھ دی جائے جس کے متعلق ورثاء کی اجازت لی جا چکی ہے۔ اچھا ہے مساکین کا بھلا ہو جائے گا۔ لیکن میں نے اپنے نفس سے کہا کہ اچھا آپ اپنے اُستاد کو بھی پٹی پڑھانا چاہتے ہیں"

اور اس طرح آپ فریب نفس سے بچ گئے۔ جو صرف نگرانِ نفس کی برکت تھی کیونکہ :۔

نگرانیِ نفس

حضرت تھانوی جہاں طالبین کے نفوس کی ہر وقت دیکھ بھال کرتے رہتے تھے۔ وہاں اپنے نفس کی بھی نگرانی رکھتے تھے۔ اور اسے اُبھرنے کا ذرّہ موقع نہ دیتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"اگر گھر سے کہیں گئی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور کوئی غیر محرم عزیز یا مہمان یا کام کاج کرنے والی عورت یا لڑکی گھر میں ہوتی ہو۔ تو میں اس زمانہ میں گھر جانا ہی چھوڑ دیتا ہوں اور اگر کوئی ضروری بات کہنی یا سُننی ہوتی ہے۔ تو دہلیز ہی میں کھڑے کھڑے کہہ سُن لیتا ہوں۔ اندر نہیں جاتا۔ یہ میں اس لیے اوروں کو سُنا رہا ہوں کہ سب کو اس معاملہ میں غایت درجہ احتیاط رکھنی چاہیئے۔

کیونکہ اوّل تو نفس کا کچھ اعتبار نہیں پھر خیالات کا بھی تو پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ بلکہ نابالغ نامحرم لڑکیوں سے بھی احتیاط ہی چاہیئے۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی نابالغ لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرنے کا سبب تو شفقت ہی ہوتا ہے۔ لیکن سر پر ہاتھ رکھنے کی تھوڑی دیر بعد نفس کی آمیزش ہونے لگتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو عموماً ایسے دقائق نفسی کی طرف اعتناء بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ برابر شفقت ہی کے گمان میں رہتے ہیں۔ اس کی احتیاط واجب ہے۔"

ایک اور موقع پر فرمایا کہ:۔

"میں کسی امرد کو بھی اپنے پاس تنہائی میں نہیں آنے دیتا۔ گو یہ بات اپنی ذات میں تو معمولی ہے لیکن جو شخص مجھ سے اعتقاد رکھتا ہو۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ کہ جب یہ پیر ہو کر بھی اپنے نفس کی اتنی حفاظت کرتے ہیں۔ تو ہمیں تو بہت ہی زیادہ حفاظت کرنی چاہیئے۔"

"ایک مرتبہ آپ مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی کے ہمراہ سفر فرما رہے تھے۔ آپ نے نارنول سے الور۔ الور سے دہلی اور دہلی سے پانی پت جانا تھا۔ نارنول میں جمعہ پڑھا۔ تو آپ نے شب جمعہ کو نہجد کے وقت کپڑے بدلنے کے لیے مولوی صاحب موصوف سے کپڑے مانگے۔ جن کی تحویل میں آپ کا بیگ تھا۔ اُنھوں کا چکن کا کرتہ پیش کیا فرمایا یہ نہیں۔ ململ کا کُرتہ لائیے۔ جب وہ ململ کا کرتہ لائے۔ تو پھر فرمایا کہ اچھّا وہ چکن کا ہی لے آئیے۔ اس کو رکھ دیجئے۔ جب وہ چکن کا کُرتہ لائے تو فرمایا کہ کچھ خبر بھی ہے۔ یہ میں نے

کیوں کیا۔ بات یہ ہے کہ جب آپ اچکن کا کُرتہ لائے۔ تو مجھے خیال ہوا کہ یہ تو قصبہ ہے۔ یہاں ململ کا کُرتہ پہن لینا کافی ہے۔ اس کے بعد دہلی جانا ہے وہاں چکن کا کُرتا پہننا مناسب ہوگا۔ (اس مصلحت سے کہ امرا کی نظر میں ذلّت نہ ہو) میں نے اس خیال کی مخالفت کی۔"

آپ نے صرف اسی پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ نفس کو اس سرتابی کی سزا دینے کے لیے الور سے دہلی روانہ ہوتے وقت کپڑے نہ بدلے۔ یہاں تک کہ دہلی میں بھی نہ بدلے۔ حالانکہ کپڑے میلے ہو چکے تھے۔ اور بوجہ نفاست مزاج میلے کپڑوں سے بہت اذیت ہو رہی تھی۔ مگر جب دہلی سے پانی پت پہنچے۔ تو فوراً غسل فرما کر کپڑے بدل لیے۔ اور اس طرح آپ نے نفس کی خواہش عزت پوری نہ ہونے دی۔

سامانِ راحت

نفس کی اس طرح نگرانی کرنے سے گو شروع میں تھوڑی سی کلفت ہوتی ہے۔ مگر اس کے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اسی سے دائمی راحت کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ کالپٹی کے سفر کے دوران میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کے ایک ہم سبق انگریزی خواں پولیس آفیسر بھی ہم سفر تھے۔ خواجہ صاحب بھی حضرت کے ساتھ تھے اُنھوں نے خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت سے عرض کیا کہ ان کی حالت دیکھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہمت نہیں پڑتی۔ حضرت نے فوراً فرما دیا کہ:

"اس کو نہ دیکھئے مگر یہ دیکھئے کہ گھڑی کو چابی دینے والا تو ایک مرتبہ ہی چابی دیتا ہے۔ پھر جو کچھ اس میں تغیرات ہوتی

ہیں۔ وہ تو خود بخود اور بے تکلف ہی ہوتے رہتے ہیں کہ پہلے ایک بجا۔ پھر دو۔ پھر تین دقس علیٰ ہذا" یعنی بظاہر ضرور دشواری نظر آتی ہے۔ مگر اس دشواری کو ایک مرتبہ برداشت کر لینے سے جو تعلق مع اللہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی لذت کے مقابلہ میں اس دشواری کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ قلب خود بخود اپنی اصلاح کی طرف راغب رہتا ہے اور جونہی کوئی ایسا ناگوار واقعہ پیش آتا ہے۔ تو وہ فوراً اس کی کوئی نہ کوئی تاویل کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ہر وقت باطنی ترقی کرتا رہتا ہے اور اس شخص سے بڑھ جاتا ہے۔ جسے عبادات نافلہ کا تو اہتمام بہت ہوتا ہے۔ لیکن قلب کی نگہداشت کا اہتمام نہیں ہوتا۔"

راحت رسانی

حقیقتِ راحت

قرآن کریم اور احادیث نبوی میں اسی دنیا کے اندر لطفِ جنت اٹھانے کے لیے جس قدر اصول و آداب موجود ہیں۔ ان تمام کی اساس و بنیاد اس پر ہے کہ مسلمان کی زبان اور ہاتھ سے آزار نہ پہنچے۔ جسے ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

دین کے پانچ اجزا میں سے عقائد و عبادات کا تعلق براہِ راست حق تعالیٰ سے ہے۔ صحّتِ اخلاق و معاملات کا تعلق زیادہ تر انسان کی اپنی ذاتِ خاص سے ہے۔ اور آدابِ معاشرت کا تعلق تمام تر عوام النّاس کے ساتھ ہے۔ جنھیں حق تعالیٰ نے اپنی عیال ظاہر کر کے اپنا محبوب جتایا ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی امر ہے کہ جو کسی کے محبوب سے محبت کرتا ہے وہ بھی محبوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا سہل طریق یہ ہے کہ اس کی مخلوق کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دی جاوے۔ جس کی طرف الا ماشاء اللہ کسی کی بھی توجہ نہیں بلکہ اس وقت حالت یہ ہے کہ ع

انساں کو انساں ہی جینے نہیں دیتا

مشاہیر صوفیاء و مشائخ میں اس بات کا شرفِ اولیت حضرت تھانویؒ کو ہی حاصل ہے کہ آپ نے ذکر و شغل اور مجاہدات و ریاضات کی بجائے اپنی تمام تر توجّہ اصلاحِ معاشرت پر رکھّی۔ جو تکدر و انقباض کی رافع اور مسرت و انبساط کی جامع ہے۔

اصولِ راحت

ذیل میں حضرت تھانوی کے چند اصولِ راحت پیش کیے جاتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس معاملہ میں حضرت کی نظر کتنی دُور رس تھی۔

اپنے لیے

متکلم کو ہدایت تھی کہ:۔

۱. بات ہمیشہ صاف اور بے تکلّف کہہ دے۔ تکلُّف کی تمہید وغیرہ نہ کرے۔

۲. کسی کے توسُّط سے بلا ضرورت پیغام نہ پہنچائے۔ جو کچھ کہنا ہو۔ خود

بے تکلّف کہہ دے۔

۳۔ جب بات کرنی ہو تو سامنے بیٹھ کر کرے۔ پشت پر سے کرنے میں الجھن ہوتی ہے۔

۴۔ اگر گفتگو میں کسی کی بے تمیزی پر زیادہ تغیّرِ مزاج میں ہونے لگے تو بہتر ہے کہ بلاواسطہ اس سے گفتگو نہ کرے۔ کسی مزاج شناس۔ سلیقہ شعار کو بُلا کر اس کے واسطہ سے گفتگو کرے تاکہ تمھارا تغیُّر دوسرے پر اور اس کی بے تمیزی تم پر اثر انداز نہ ہو۔

۵۔ دوسروں کی بات اچھّی طرح توجّہ سے سُنئے۔ اور اگر کچھ شبہ رہے تو متکلم سے فوراً دوبارہ تحقیق کر لے۔ مجھے سمجھے محض اجتہاد سے کام نہ لے۔ بعض اوقات غلط فہمی کے ساتھ عمل کرنے سے متکلم کو اذیت ہوتی ہے۔

دُوسروں کے لیے

دوسروں کو تاکید کی تھی کہ :۔

۱۔ جس سے بے تکلّفی نہ ہو۔ اس سے ملاقات کے وقت اس کے گھر کا حال نہ پوچھو۔

۲۔ لڑکوں کے سامنے کوئی بے شرمی کی بات نہ کہو۔

۳۔ جو آدمی تیزی کے ساتھ جا رہا ہو۔ راستہ میں اسے مصافحہ کرنے کے لیے مت روکو شاید اس کا کوئی حرج ہو۔ اسی طرح ایسے وقت میں اس کو کھڑا کر کے بات مت کرو۔

۴۔ جو شخص کھانے کے لیے جا رہا ہو۔ یا بُلایا گیا ہو۔ اس کے ساتھ اس مقام تک جاؤ کیونکہ صاحبِ خانہ شرما کر کھانے کی تواضع کرتا ہے۔ اور دِل اندر سے نہیں چاہتا۔ اور بعضے جلدی قبول کر لیتے ہیں۔ تو صاحبِ خانہ کی بلا رضا کھانا کھایا اور اگر قبول نہ کیا۔ تو صاحبِ خانہ کی سبکی ہے۔ پھر

خود صاحبِ خانہ کا اوّل صورت میں تردد یہ بھی مستقل ایذا ہے۔

۵۔ کوئی چیز جو کئی شخصوں کے استعمال میں ہوتی ہو۔ اس سے کام لینے کے بعد اسے وہیں رکھ دو۔ اور اس کا بہت ہی اہتمام کرے تاکہ دوسروں کو پریشانی نہ ہو۔

۶۔ جہاں جس کا جوتا رکھا ہو۔ اس کو ہٹا کر اپنا جوتا رکھ کر مسجد وغیرہ میں نہ جانا چاہیئے جہاں جس کا جُوتا رکھا ہو۔ وہ اسی کا حق ہے۔ وہیں آ کر دیکھے گا۔ نہ ملے گا تو پریشان ہوگا۔

۷۔ جہاں اور آدمی بیٹھے ہوں وہاں بیٹھ کر مت تھوکو۔ نہ ناک صاف کرو۔ اگر ضرورت ہو تو ایک کنارے جا کر فراغت حاصل کرو۔

۸۔ بیمار کے سامنے یا اس کے گھر والوں کے سامنے ایسی باتیں مت کرو۔ جس سے زندگی کی نااُمّیدی پائی جائے۔ ناحق دِل ٹوٹے گا۔ بلکہ تسلّی کی باتیں کرو۔ کہ انشاء اللہ تعالیٰ سب دُکھ جاتا رہے گا۔

۹۔ اگر کسی سے پوشیدہ بات کرنی ہو۔ اور وہ بھی اس جگہ موجود ہو۔ تو آنکھ سے یا ہاتھ سے ادھر اشارہ مت کرو۔ ناحق اس کو شبہ ہوگا۔ اور یہ جب ہے کہ اس بات کا کرنا شرعًا درست بھی ہو۔ اور اگر درست نہ ہو تو ایسی بات کرنا ہی گُناہ ہے۔

۱۰۔ کسی کو کوئی چیز ہاتھ میں دینا ہو تو دُور سے مت پھینکو۔ کہ وہ ہاتھ میں لے لے گا۔

۱۱۔ اگر کسی شخص پر قصداً ناخوش ہونا پڑے یا اتّفاق سے ایسا ہو جائے تو دوسرے وقت اس کا دل خوش کر دو۔ اور اگر تم سے واقعی زیادتی ہو گئی ہے۔ تو بے تکلف اس سے معذرت کر کے اپنی زیادتی کی معافی مانگ لو۔ عار مت کرو۔ قیامت میں وہ اور تم برابر ہو گے۔

مُلاقاتیوں کے لیے

مُلاقاتیوں کے لیے ان چند اصولوں کی پابندی لازمی تھی کہ :-

۱۔ اگر مجلس میں کوئی خاص گفتگو ہو رہی ہے۔ تو نئے آنے والے کو خواہ مخواہ سلام کر کے اپنی طرف متوجہ کر کے سلسلۂ گفتگو میں مزاحم نہ ہونا چاہیئے۔ جبکہ چپکے سے نظر بچا کر بیٹھ جاوے۔ پھر موقعہ پا کر سلام وغیرہ کرے۔

۲۔ اگر کسی سے ملنے جاؤ تو وہاں اتنا مت بیٹھو یا اس سے اتنی دیر باتیں مت کرو کہ وہ تنگ آجاوے یا اس کے کام میں حرج ہونے لگے۔

۳۔ مشغول آدمی کے پاس بیٹھ کر اس کو تکتا نہ رہے کہ اس سے دل بٹتا ہے اور دل پر بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ بلکہ خود اس کی طرف متوجہ ہو کر نہ بیٹھے۔

۴۔ کوئی حاجت لے کر جاوے۔ تو موقع پا کر فوراً اپنی بات کہہ دے انتظار نہ کراوے۔

۵۔ بعض آدمی مجلس میں پہنچ کر سب سے الگ الگ مصافحہ کرتے ہیں۔ اگرچہ سب سے تعارُف نہ ہو جس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے اور فراغ تک تمام مجلس مشغول اور پریشان رہتی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ جس کے پاس قصد کر کے آئے ہو۔ اس کے مصافحہ پر کفایت کرو۔ البتہ اگر دوسرے سے بھی تعارُف ہو تو مضائقہ نہیں۔

مہمانوں کے لیے

مہمانوں کے لیے یہ اصول وضع فرمائے کہ :-

۱۔ کسی کے گھر میں مہمان بنو تو اس سے کسی چیز کی فرمائش نہ کرو۔ بعض دفعہ چیز تو بے حقیقت سی ہوتی ہے۔ مگر اس وقت گھر والا اس کو پوری

نہیں کر سکتا۔ ناحق اس کو شرمندگی ہو گئی۔

۲۔ اگر کسی کے ہاں مہمان بنو اور تم کو کھانا کھانا منظور نہ ہو۔ خواہ کھا چکنے کی وجہ سے یا روزہ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے کھانے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً جاتے ہی اس کی اطلاع کر دو کہ میں اس وقت کا کھانا نہ کھاؤں گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انتظام کرے۔ اور انتظام میں اُسے تعب بھی ہو اور تمھارے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اس کا نقصان بھی ہو۔

۳۔ اسی طرح مہمان کو چاہیئے کہ کسی کی دعوت میزبان کی اجازت کے بغیر قبول نہ کرے۔

۴۔ اگر مہمان کہیں جانا چاہے تو میزبان کو اطلاع کر کے جاوے تاکہ بعد میں اس کی تلاش نہ کرنی پڑے۔

۵۔ جہاں مہمان بنے۔ وہاں کے انتظامات میں مہمان ہونے کی وجہ سے ہرگز دخل نہ دے۔ البتہ اگر میزبان کوئی خاص انتظام اس کے سُپرد کرے تو اس کے اہتمام کا مضائقہ نہیں۔

۶۔ مہمان کو چاہیئے کہ اگر پیٹ بھر جاوے تو تھوڑا سالن روٹی دستر خوان میں ضرور چھوڑ دے۔ تاکہ گھر والوں کو یہ شبہ نہ ہو کہ مہمان کو کھانا کم ہو گیا۔ اور وہ دل میں شرمندہ ہو۔

فرمائشیوں کے لیے

فرمائش کرنے والوں کو ہدایت تھی کہ :۔

۱۔ جس شخص کی نسبت تم کو قرائن سے متیقن یا مظنون ہو کہ تمھارے کہنے کو ہرگز نہ ٹالے گا۔ تو اس سے کسی ایسی چیز کی فرمائش نہ کرو جو شرعاً واجب نہیں۔

۲۔ اگر بلا فرمائش کوئی تمھاری مالی یا بدنی خدمت کرے۔ تب بھی اس کا

لحاظ رکھو کہ اس کی راحت یا مصلحت میں خلل نہ پڑے۔ یعنی اس کو زیادہ نہ جاگنے دو۔ اس کی گنجائش سے زیادہ اس کا ہدیہ مت لو۔ اگر وہ تمھاری دعوت کرے تو بہت سے کھانے مت پکانے دو۔ ہمراہی میں بہت سے آدمیوں کی دعوت مت کرنے دو۔

۳۔ کسی ایسے شخص سے کوئی چیز مت مانگو کہ تم کو قرائن سے یقین ہو کہ وہ باوجود گرانی کے بھی انکار نہ کر سکے گا۔ اگرچہ یہ مانگنا بطور عاریت یا قرض کے ہی کیوں نہ ہو گی۔ یا اگر گرانی ہوئی۔ تو یہ آزادی سے عذر کر دے گا۔ تو مضائقہ نہیں اور

۴۔ یہی تفصیل ہے کسی کام بتلانے میں۔ کوئی فرمائش کرنے میں کسی سے کسی کی سفارش کرنے میں۔

۵۔ اسی طرح کسی کی وجاہت سے کام نکالنا۔ مثلاً کسی بڑے آدمی سے اپنی قرابت ہے۔ اور اس کے کسی معتقد یا اثر ماننے والے کے پاس اپنی کوئی حاجت لے جاوے اور قرائن سے معلوم ہو کہ وہ بطیب خاطر اس حاجت میں سعی نہ کرے گا۔ بلکہ محض اس بڑے آدمی کے تعلق اور اثر سے کرے گا کہ بے توجہی سے وہ ناراض نہ ہو جائے تو اس طرح سے کام نکالنا۔ یا کام کی فرمائش کرنا حرام ہے۔

تعلیم و تربیت

محورِ زندگی

حضرت تھانوی کی زندگی کا ایک سرسری جائزہ لینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے اپنی زندگی اُمتِ مسلمہ کی اصلاح و تربیّت کے لیے ہی وقف

کر رکھی تھی۔ آپ کو ہر وقت طالبین و سالکین کی اصلاح و نفع کا خیال رہتا تھا۔ اس باب میں آپ کو اتنا اہتمام تھا کہ خود طالبین و سالکین بھی اپنے لیے اتنی فکر نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے جن جن گوشوں تک آپ کی نظر پہنچتی تھی۔ وہاں کسی دوسرے کی نظر پہنچنی محال تھی۔

تشخیص و معالجہ

ایک صاحب قلم فلسفی لکھتے ہیں کہ :۔

"اکثر اطباء علاج میں صرف مرض کا خیال کرتے ہیں۔ مریض کا نہیں۔ شخصی حالات یا زمان و مکان کے اختلافات پر بہت کم نظر جاتی ہے۔ حضرت کے ہاں روحانی معالجہ میں دونوں باتوں کا پورا لحاظ رہتا ہے۔ مثلاً کم خوری۔ کم خوابی یا دیگر ریاضیات شاقہ وغیرہ کو غالباً اس زمانہ کے لوگوں کے لیے بالعموم ترک ہی فرما دیا ہے۔ اذکار و اشغال وغیرہ تمام چیزوں میں طبیعت کی مناسبت اور برداشت کا خیال فرماتے ہیں۔ زیادہ زور احکام پر ہے۔ تشخیص مرض اور نفس شناسی میں حضرت کی حذافت حیرت انگیز ہے۔ کسی ماہر نفسیات کی نگاہ وہاں کیا پہنچے گی۔ جہاں حضرت کی پہنچتی ہے۔ ایک شخص اپنی جس صفت کو تواضع سمجھ رہا ہے۔ اور دوسرے بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ حضرت کی حذافت اسے کبر کا مریض تشخیص فرماتی ہے۔ اور پھر مریض کو خود نظر آجاتا ہے کہ ہاں یہ تواضع نہیں کبر تھا۔ بعض مرتبہ آدمی اپنا کوئی ایسا حال بیان کرتا ہے کہ دوسرا مرشد تو شاید اس کی ولایت کی تصدیق کر دے۔ مگر حضرت یبوست دماغ کا علاج کرانے کی ہدایت فرماتے ہیں۔ اسی طرح دوسری طرف

بعض حالات وخیالات پر انسان کو اپنے کفر و نفاق تک کا گمان ہونے لگتا ہے ۔ لیکن حضرت کی تشخیص میں وہ ایمان و اخلاص کے منافی نہیں ہوتے کم ہمّت سے کم ہمّت کو بھی حضرت ہمّت شکستہ نہیں ہونے دیتے ۔ بلکہ جہاں تک بھی اس کی ہمّت یاوری کرے ۔ دین کا یسر یہ ہے، کہ خدا سے پلٹاتے وکھتے ہیں. ایسے ہی تجربات ہیں کہ مرشد کی کیا ضرورت ہے اور اس کو کیسا ہونا چاہیئے ۔

تعلیم وتربیّت کے باب میں بعض کلیات تو حضرت کے ایسے ہیں مثلاً مطلوب وغیر مطلوب اختیاری وغیر اختیاری کی تفریق وتقلیل کہ جن سے سلوک کی سینکڑوں گرہیں کھل جاتی ہیں ۔ بہت سی باتوں کو سالک اہم ومقدم قرار دے لیتا ہے ۔ جو دراصل غیر اہم یا سرے سے غیر ضروری ہوتی ہے ۔ جیسے احوال واذواق ۔ کشف وکرامات ۔ ان کے عدم حصول سے نہ صرف دل ٹوٹ جاتا ہے ۔ بلکہ جو امور حقیقتہً اہم واقدام ہیں ۔ ان کا دل میں اہتمام ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ ایک بڑی سہولت تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں حضرت نے یہ فرمادی ہے کہ جس کے بعد محرومی کا کوئی عذر نہیں رہ جاتا ۔ کہ دُور دراز مقام پر رہ کر بھی آدمی مکاتیب کے ذریعہ کافی استفادہ کر سکتا ہے ۔ اس معاملہ میں حضرت کی بصیرت سراپا کرامت ہے ۔ طویل سے طویل اور پراگندہ سے پراگندہ خطوں میں دُکھتی ہی رگ پر اُنگلی پڑتی ہے ۔ اور دو چار فقروں میں شافی وکافی جواب تحریر فرماتے ہیں ؛" (الفیض الجاری)

اہمیّتِ اصلاح

حضرت تھانوی کی ابتدائی اور اہم ترین کوشش یہ ہوتی تھی کہ اصلاحِ اعمال کی اہمیّت طالب کے ذہن نشین ہو جائے اور جب تک یہ مقصود حاصل نہ ہو جاتا۔ نہ آپ خود چین لیتے اور نہ اُسے چین لینے دیتے۔ مگر یہ منزل آپ صرف استفسارات میں ہی طے کرا دیتے تھے۔ اور اس کا حق تعالیٰ نے آپ کو ایسا ملکہ و سلیقہ بخشا تھا۔ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ آپ طالب سے محققانہ سوالات کر کر کے اسے اس طرح لاجواب کر دیتے کہ اس کا جہل اس کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا تھا۔ اور وہ اپنے لیے گریز پائی کے تمام راستے مسدود پا کر شاہراہِ طریقت پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتا تھا۔ جس کی مثالوں سے اشرف السوانح حصہ دوم بھری پڑی ہے۔

طریقِ اصلاح

حضرت تھانوی کے ہاں امراضِ باطنی کے معالجہ کا دستور یہ تھا کہ طالب آپ کو محض اپنے حالاتِ باطنیہ کی اطلاع دے۔ اور درخواست اصلاح کرے لیکن تشخیص و تجویز کے سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی رائے یا تدبیر پیش نہ کرے۔ اور یہ تمام معاملہ آپ کی رائے پر چھوڑ دے۔ جب آپ تمام حالات کا جائزہ لے کر یا بشرطِ ضرورت ضروری استفسارات فرما کر مرض و علاج تشخیص و تجویز کریں۔ تو طالب بلاچون وچرا اور بکمال اعتماد آپ کی تجاویز پر عمل کرنا شروع کر دے اور اس میں قطعاً قطعاً اپنی رائے کو دخیل نہ ہونے دے عمل کرنے کے بعد یا عمل کرنے کے دوران میں جو جو حالات اور تغیرات پیدا ہوتے جائیں ان سے آپ کو مطلع کرتا رہے۔ اور ان کے پیشِ نظر حضرت اپنی تجویزات میں جو مناسب حال تغیر و تبدل یا کمی بیشی یا ترمیم و تنسیخ فرمائیں۔ ان پر کاربند

رہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رکھے اس طریق کو ذہن نشین کرنے کے لیے حضرت نے فرمایا کہ بس ان چار ہم قافیہ الفاظ کو یاد رکھے۔ اطّلاع و اتّباع۔ اعتقاد و انقیاد۔ تعلیم و تربیت کا یہ دستور آپ کے اس اصول پر مبنی تھا کہ :۔

"انسان صرف اختیاری امور کا مکلف ہے۔ غیر اختیاری امور کا مکلف ہی نہیں لہذا اختیاری امور میں تو بہ تکلف ہمت اور استعمال اختیار سے کام لے اور غیر اختیاری اُمور کے نہ تو درپے ہو اور نہ ان کی فکر میں پڑے۔"

چنانچہ جب کوئی طالب اپنے کسی عیب کی اصلاح چاہتا۔ تو آپ سب سے پہلے اس پر یہ سوال کرتے کہ یہ اختیاری ہے یا غیر اختیاری؟ اگر وہ کہتا کہ اختیاری ہے تو فرماتے جس چیز کا فعل اختیاری ہے اس کا ترک بھی اختیاری ہے۔ ہمت کر کے اختیار کو استعمال میں لاؤ۔ اگر وہ کہتا کہ غیر اختیاری ہے۔ تو اگر وہ دراصل غیر اختیاری ہوتا۔ تو فرماتے کہ غیر اختیاری کا انسان مکلف ہی نہیں۔ پھر اس میں دینی ضرر ہی کیا ہوا۔ جو اس کا علاج پوچھا جاتا ہے یوں سوال ان عنوانات سے بھی فرماتے کہ یہ بات عقلی و طبعی ہے یا مقصود و غیر مقصود ہے یا مطلوب و غیر مطلوب ہے۔ جس سے حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی۔ مثلاً

۱۔ عقلی و طبعی اُمور کے متعلق فرماتے تھے انسان عقلی امور کا مکلف ہے۔ کیونکہ وہ اختیاری ہیں۔ طبعی اُمور کا مکلّف نہیں۔ کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں۔

۲۔ اعمال و احوال کے متعلق فرماتے۔ اعمال مقصود ہیں۔ احوال (کشف و کرامات وغیرہ) مقصود نہیں۔ کیونکہ اعمال اختیاری ہیں۔ احوال اختیاری نہیں۔

۳۔ افعال و انفعالات کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اس طریق میں افعال کا اعتبار ہے۔ انفعالات کا اعتبار نہیں۔ لہذا افعال کا اہتمام چاہیئے۔

جو اختیاری ہیں۔ انفعالات کے درپے نہ ہونا چاہیئے جو غیر اختیاری ہیں۔

۴۔ مقصود و غیر مقصود کے سلسلہ میں فرماتے کہ گو احوال محمودہ محمود ہیں۔ لیکن مقصود نہیں کیونکہ وہ اختیاری نہیں۔ نہ ان کا حصول لازم نہ ان کا بقا دائم۔ اگر حاصل ہوں، شکر کرے۔ لیکن کمال نہ سمجھے اگر حاصل نہ ہوں یا حاصل ہو کر زائل ہو جائیں۔ تو غم نہ کرے۔

غرضیکہ آپ صرف اس ایک تنقیح پر مختلف صورتوں سے ہزاروں اشکالات فوراً اس طرح حل فرما دیتے تھے کہ اہلِ علم کے سامنے بھی ان کا جہل متشکل ہو کر آجاتا تھا۔

اذکار و اشغال

جب ایک طالب علم اصلاحِ اعمال کی اہمیت کو ذہن نشین کر کے اصلاحِ اعمال میں خاص اہتمام کے ساتھ مشغول ہو جاتا تو پھر آپ اصلاحِ اعمال کی تکمیل کا انتظار کیے بغیر بلا تامل اذکار و اشغال بھی اُسی وقت تک شروع کرا دیتے تھے حالانکہ سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ سلف کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب تک طالب اصلاح اعمال ظاہرہ و باطنہ کی تکمیل نہ کر لیتا۔ اسے اذکار و اشغال شروع نہ کرائے جاتے۔ لیکن اکابر متاخرین نے یہ دیکھ کر کہ اس زمانہ میں عمریں اور ہمتیں دونوں اس ترتیب کو علیٰ حالہ قائم رکھنے میں قاصر ہیں۔ اُنھوں نے یہ ترتیب بدل دی۔ اور اصلاح اعمال کے ساتھ اذکار و اشغال کی تعلیم بھی دینی شروع کر دی۔ مگر حکیم الاُمت نے اپنے زمانہ کے طالبین کے مصالح کے پیشِ نظر اکابر سلف اور اکابر متاخرین کے طریق کے بین بین طریق اختیار کیا۔ فرماتے ہیں کہ:-

"کچھ دن تک تو میں محض اصلاح اعمال ہی میں مشغول رکھتا ہوں۔ اور جب یہ دیکھ لیتا ہوں کہ اصلاحِ اعمال کی اہمیت اچھی طرح اُس کے ذہن نشین ہو گئی ہے۔ اور اس کے اندر اس کا خاص اہتمام پیدا ہو گیا ہے۔ اس وقت

اذکار و اشغال بھی بتلا دیتا ہوں اور پھر دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلاتا ہوں۔ غرضیکہ میں نے اکابر متاخرین کے طریق میں اپنے زمانہ کے طالبین کی طبائع کا رنگ دیکھ کر بضرورت صرف اتنی ترمیم کرلی ہے کہ وہ حضرات تو دونوں چیزوں کو شروع ہی سے ساتھ ساتھ چلاتے تھے۔ اور میں کچھ دن بعد ساتھ ساتھ چلاتا ہوں"۔

دستور العمل

اذکار و اشغال کے سلسلہ میں حضرت کا دستور العمل بھی بڑا حکیمانہ تھا۔ جس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ یہ:۔

"دستور العمل غایت نافع ہونے کے اعتبار سے میرے نزدیک عطر تصوف کہنے کے قابل ہے۔ جو بہت ہی خاک بیزی کے بعد ہاتھ آیا ہے۔ جسے عام طالبین کے لیے عموماً اپنے شیخ کی خدمت میں پہنچنے تک کے واسطے اور اپنے دوستوں کے لیے خصوصاً ہمیشہ کے لیے عمل کرنے کے واسطے ضبط کیے دیتا ہوں۔ پھر اگر کسی کا شیخ اس کو منظور و جائز رکھے تب تو قصہ سہل ہوا۔ اور اگر اور اد و اذکار و اشغال کے متعلق کچھ اور تجویز کرے اور اس کے موافق کرنا چاہیئے۔ البتہ اس میں جتنے امور شرعاً ضروری ہیں۔ ان میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں۔ وہ بحالہ رہیں گے"۔ (قصد السبیل صہ)

اس توسیع و احتیاط کی مثال اس زمانہ میں ملنی ناممکن نہیں۔ تو مشکل ضرور ہے۔ آپ کے الفاظ میں اس دستور العمل کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"طالب یا عامی ہے یا عالم۔ اور ہر ایک ان میں سے یا فکر

معاش وحقوقِ عباد سے فارغ ہے ۔ یا مشغول ۔ تو طالب کی یہ کل چار قسمیں ہوئیں :۔

(۱) عامی فارغ (۲) عامی مشغول (۳) عالم فارغ

(۴) عالم مشغول ۔

ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک دستور العمل خاص ہے ۔ (بحوالہ صدر)

برائے عامی مشغول

۱۔ عامی مشغول کا خاص دستور العمل یہ قرار دیا کہ :۔

" اوّل عقائد و مسائل ضروریہ سیکھے ۔ اور بہت اہتمام سے اس کا پابند رہے ۔ جو نئی بات اس کو پیش آوے ۔ علماء سے پوچھے ۔ اور اگر اس کا پیر عالم ہے ۔ تو وہ سب سے بہتر ہے ۔ اگر ممکن ہو تو تہجد اخیر شب میں پڑھے ورنہ عشا کے بعد ہی وتر سے پہلے کچھ نفلیں بجائے تہجّد کے پڑھ لے ۔ اور پانچوں نمازوں کے بعد یا جن نمازوں کے بعد فرصت ہو سبحان اللہ سو بار لا الہ الّا اللہ سو بار اور اللہ اکبر سو بار اور سوتے وقت استغفار سو بار پڑھا کرے ۔ اور ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے درود شریف زبان سے جاری رکھّے ۔ اس میں وضو اور کسی عدد کی قید نہیں ۔ لیکن ہر وقت تسبیح ہاتھ میں لیے پھرے ۔ اور اگر قرآن پڑھا ہُوا ہو تو روزانہ کسی قدر قرآن کی تلاوت بھی کر لیا کرے ۔ اور رسالہ قصد السبیل کے اخیر میں جو مردوں اور عورتوں کے لیے نصیحتیں لکھّی ہیں ۔ ان کو کبھی کبھی دیکھ لیا کرے اور ان پر عمل کرے ۔ اور کبھی کبھی

اپنے پیر کے پاس یا کوئی خوش عقیدہ متقی بزرگ موجود ہو اس کے پاس جا بیٹھا کرے۔ لیکن پیر کے پاس جانے میں اس کی پابندی نہ کرے کہ کچھ نہ کچھ لے کر ہی جانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ تکلیف اخلاص کے خلاف ہے اور باقی اوقات میں بال بچوں کے لیے کسبِ حلال میں مشغول رہنا بھی عبادت ہے۔ اور اگر یہ عامی عورت ہے۔ مگر یہ بدون اذن شوہر کے پیر کے ہاں نہ جائے اور ایام حیض میں بھی وظیفوں کے وقت میں وضو کر کے وظیفے پڑھ لیا کرے بجز قرآن مجید کے کہ اس کا پڑھنا اس حالت میں درست نہیں۔"

برائے عامی فارغ

۲۔ "عامی فارغ کا خاص دستورالعمل وہی قرار دیا جو عامی مشغول کے لیے بیان کیا گیا۔ لیکن اتنے امور اور زائد ہیں کہ اگر ممکن ہو۔ تو پیر کی خدمت میں جا پڑے۔ اور اگر کوئی انتظام وسامان ظاہری نہ ہو۔ تو اتنا ضرور ہے کہ دوسرے کے بھروسہ پر نہ رہے۔ یا تو کچھ محنت مزدوری کر لے اور اگر ہمّت ہو۔ تو اللہ پر توکّل کرے مل جائے تو کھا لے۔ نہ ملے صبر کرے۔ اگر پیر کے پاس نہ رہ سکے تو اپنے وطن میں ہی رہے خواہ گھر میں یا کسی مسجد میں۔ مگر جہاں تک ہو سکے خلق سے علیٰحدہ رہے۔ کسی کے پاس زیادہ آمدورفت نہ رکھے۔ جب تک کوئی دنیا یا دین کی ضرورت نہ ہو۔ مخاطبت نہ کرے۔ اور کسی ضرورت سے ملنا ہو تو زبان کا بہت خیال رکھے۔ کوئی کلمہ خلافِ شرع مثل غیبت وغیرہ مُنہ

سے نہ نکالے۔ لیکن نماز جماعت کے ساتھ پڑھے۔ اور تنہائی میں جو اوقات اپنی ضروری حاجت و آرام سے بچیں اس میں خواہ قرآن کی تلاوت مع مناجات مقبول خواہ نوافل خواہ درود شریف۔ خواہ استغفار میں مشغول رہے۔ اور اگر کچھ خواندہ ہو۔ تو تھوڑے وقت دین کی کتابیں بھی جو اردو۔ فارسی میں ہیں۔ کسی معتبر عالم کو دکھلا کر مطالعہ کرے۔ لیکن جہاں شبہ رہے۔ اپنی رائے سے مطلب نہ نکالے۔ کسی محقق عالم سے پوچھ لے۔ اگر اس بستی میں کہیں طالب علم یا اللہ اللہ کرنے والے موجود ہوں تو ان کی خدمت گزاری میں اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ خرچ کرے۔ اس سے قلب میں برکت بھی پیدا ہوتی ہے اور خود بینی سے بھی حفاظت رہتی ہے اور کبھی کبھی نفل روزہ بھی رکھ لیا کرے باقی دونوں قسم کے عامی کو اشغال کی تعلیم نہ کرنا چاہیئے کہ اس میں طرح طرح کے خطرات ہیں۔ جن کا تحمل عامی سے نہیں ہوتا۔ البتہ اگر اس میں شوق و استعداد دیکھے تو اسم ذات تین ہزار سے چھ ہزار تک تنہائی میں بیٹھ کر پڑھنے کو بتلا دے۔ مگر بدوں ضرب دے دوں جہر کے۔ اس سے زیادہ مناسب نہیں باقی دوسرے اوراد نوافل جس قدر جی چاہے پڑھے۔ البتہ اگر کوئی عامی صحبت علماء سے مثل علماء کے خوش فہم ہو گیا ہو۔ وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔"

برائے عالم مشغول

۲۔ "عالم مشغول کا خاص دستور عمل یہ قرار دیا کہ فارغ اوقات

میں کوئی ایسا وقت جس میں قلب، افکار و تشویشات سے کسی قدر خالی ہو۔ اور معدہ پُر نہ ہو۔ نہ بھوک کا تقاضا ہو۔ معین کر کے اس میں بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک جس قدر ممکن ہو۔ خلوت میں بیٹھ کر اسم ذات یعنی اللہ اللہ باوضو خفیف جہر و ضرب کے ساتھ قلب کو متوجہ کر کے پڑھا کریں۔ تہجّد کی پابندی کریں۔ اور کسی وقت قرآن شریف کی تلاوت اور مناجات مقبول کی اصل عربی کی ایک منزل کا التزام رکھیں۔ اگر مدرس ہیں۔ فبہا۔ ورنہ ایک معتد بہ وقت تدریس طلبۂ علم دین میں ضرور صرف کیا کریں۔ اور گاہ گاہ جب ضرورت دیکھی جاوے۔ یا سامعین رغبت کریں۔ ضروری احکام کا وعظ کہہ دیا کریں۔ مگر وعظ میں غیر ضروری مضامین بیان نہ کریں اور جو ضروری مضمون ہو۔ مگر عوام کی طبیعت کے خلاف ہو۔ اس کو نہ مبہم طور سے کہیں۔ اور نہ خشونت و درشتی سے کہیں۔ بلکہ صاف لیکن نرم کہیں اور وعظ پر اُجرت نہ لیں۔ نہ عوام کے زیادہ درپے ہوں۔ نہ ان کو سخت کہیں کہ اس سے خواہ مخواہ عداوت پیدا ہوتی ہے۔ اور احیاء العلوم وغیرہ مطالعہ رکھیں۔ لیکن شیخ سے دُور رہ کر شغل نہ کریں۔ البتہ چندے شیخ کے حضور میں اگر یہ کام کیا ہو۔ اور وہ اب بھی تجویز کرے تو مضائقہ نہیں۔"

برائے عالم فارغ

۴۔ "عالم فارغ کے لیے یہ دستور العمل ہے کہ وہ اگر برائے چندے ہی فارغ ہو۔ جس کی مدت اقل چھ ماہ ہیں۔ خاص دستور العمل یہ ہے کہ چند روز جس قدر موقع میسّر آئے۔ شیخ کی خدمت

میں رہ کر مشغول ذکر رہے۔ اور اس کے لیے اذکار میں سے اس قدر کافی ہے کہ بعد تہجد کے بارہ تسبیح پڑھے۔ یعنی لا الٰہ الا اللہ ۲۰۰ بار الا اللہ ۴۰۰ بار اور اَللّٰہُ اَللّٰہ بضم ہائے اول و سکون ہائے ثانی ۶۰۰ بار اور صرف اللہ ۱۰۰ بار۔ یہ تیرہ تسبیح ہیں۔ مگر اصطلاح میں بارہ کہلاتی ہیں۔ ان میں خفیف سا جہر اور معتدل ضرب قلب پر کرے۔ مگر جہر مقصود بالذات اور قربت فی نفسہا نہیں۔ ایسا اعتقاد کرنا بدعت ہے (جس کی ترکیب قصد السبیل سے دیکھ لی جائے) اس کے بعد اگر نیند کا تقاضا ہو۔ ذرا سو جائے۔ ورنہ خواہ ان اذکار میں سے کسی خاص ذکر کو اور زیادہ کرلے۔ یا یوں ہی فارغ رہے۔ پھر بعد نماز صبح تلاوتِ قرآن اور ایک منزل مناجاتِ مقبول پڑھنے کے بعد بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک جس قدر سہل ہو۔ اسم ذات خفیف جہر اور معتدل ضرب سے خلوت میں بیٹھ کر کرے اور دوپہر کو قیلولہ کرے پھر بعد ظہر اسی طرح بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک سہولت کے ساتھ عصر کے قبل اسم ذات کا ورد کرے۔ اور عصر کے بعد اگر شیخ صاحب فارغ ہو تو مغرب تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ اور فارغ نہ ہو۔ یا وہاں موجود ہی نہ ہو۔ یا اس کے قلب میں زیادہ اشتیاق نہ ہو۔ تو جنگل۔ باغ۔ نہر۔ ندی وغیرہ کی سیر کو چلا جائے۔ اگر شیخ موجود ہو۔ تو اس کی اجازت لے کر جائے۔ اور اسی وقت میں کبھی کبھی مقابر عامہ مسلمین و مزارات اولیاء کرام پر ہو آیا کرے پھر بعد مغرب گھنٹہ آدھ گھنٹہ جب تک دلچسپی ہو۔ خلوت میں بیٹھ کر مراقبہ موت و مابعد الموت الی الحساب کا کرے کہ یہ واقعات اس

طرح سے پار ہوں گے۔ اور بقیہ اوقات میں چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے درود شریف پڑھتا رہے یا اور جس ذکر سے دل چسپی ہو۔"
(قصد السبیل)

عامی و عالم۔ فارغ و مشغول کے اشغال و اذکار کا طویل اقتباس محض اس لیے پیش کیا گیا ہے تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ یہ طریق سلوک شریعتِ مطہرہ کے کتنے مطابق ہے۔ اور دین و دنیا کے امتزاج کے باوجود کتنی سہولت و رعایت کا حامل ہے۔ اگر انسان ایک دفعہ اس پر عامل ہو جائے۔ تو بظاہر اگر کوئی مشکل صورت نظر بھی آتی ہو۔ تو وہ بھی سہل و آسان معلوم ہونے لگتی ہے۔

کیفیات و تنبیہات

یہ بات ظاہر ہے کہ جس دستور العمل پر بھی انسان عمل کرے۔ اس کا کوئی نہ کوئی خاص نتیجہ طالب کی طلب۔ اخلاص۔ ذوق و شوق کے مطابق بر آمد ہونا لازمی ہے۔ جسے سلوک کی اصطلاح میں کیفیت کہتے ہیں۔ مگر ان کیفیات کے معاملہ میں حضرت کی تنبیہات کا معاملہ ایسا ہے جیسے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

کیونکہ حضرت کے ہاں اس بات کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ طالبان کیفیات کو ان کے درجہ سے آگے نہ بڑھائیں۔ اسی لیے آپ طالبین کو کیفیات کی طرف التفات کرنے سے بتاکید منع فرماتے رہتے تھے۔ اگر کوئی طالب اپنی کیفیات کی اطلاع دیتا تو اکثر یہی فرماتے تھے کہ:۔

"ان کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ اپنے کام میں لگا جائے۔ اور کام ہی کی طرف ہمہ تن متوجہ رہا جائے۔ ورنہ غیر مقاصد میں مشغول ہو کر طالب اپنے اصل کام سے بھی رہ جاتا ہے

اور پھر کیفیات بھی منقطع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کا ورود بھی تو کام ہی کی برکت سے ہوتا ہے جیسے چراغ میں روشنی اُسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہ بتی میں تیل پہنچتا رہے۔ اور اگر تیل ہی ڈالنا چھوڑ دیا جائے۔ تو رفتہ رفتہ روشنی کم ہو کر چراغ گل ہو جائے گا"

۲۔ "کشف و کرامات و مواجید وغیرہ راہ سلوک میں کوئی چیز نہیں بلکہ

یہ چیزیں اکثر موانع طریق ہو جاتی ہیں۔ ان کا نہ ہونا زیادہ اچھا اور بے خطر ہے۔ لوگ خواہ مخواہ اس کی ہوس کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا درجہ تو بس اتنا ہے۔ جیسے شروع میں بچہ کو پڑھنے کا شوق دلانے کے لیے مٹھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت جنیدؒ کے قول تلك خیالات تربی بها اطفال الطریقه سے ظاہر ہے تو بعض مبتدیوں کو جو اطفال طریق ہوتے ہیں۔ راہ پر لگانے کے لیے کیفیات عطا فرما دی جاتی ہیں۔ اور

۳۔ کسی طالب کی حوصلہ افزائی کے لیے کیفیاتِ محمودہ پر اسے مبارک باد دیتے تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرما دیتے کہ کیفیاتِ محمودہ کو محمودہ سمجھ کر شکر تو کرے۔ لیکن مقصود اور کمال اور لازم طریق یا لازم بزرگی نہ سمجھے"

۴۔ "ذکر و طاعت میں بہ تکلف مشغول رہے۔ سہولت یا دلچسپی کا متمنی نہ ہو، اور یہ نہ دیکھے کہ مجھے کچھ نفع ہو رہا ہے یا نہیں ذکر و طاعت میں مشغول رہنا ہی اصل مقصود اور اصل نفع ہے اور جب بتکلف مشغول ہو جائے گا۔ تو پھر رفتہ رفتہ سہولت بھی ہونے لگے گی اور دلچسپی بھی پیدا ہو جائے گی"

توسط و اعتدال

غرضیکہ حضرت تھانوی کے ہاں افراط و تفریط نہ تھی۔ ہر معاملہ میں توسط و اعتدال برتا جاتا تھا کہ وجد و حال۔ ذوق و شوق۔ جوش و خروش اور گریہ وزاری سبھی کچھ ہو لیکن سب اندر ہی اندر ہو۔ باہر کچھ نہ ہو۔ ہمت و تحمل اور یقین و اعتماد کے ساتھ کام تو کرے مگر اظہار سے باز رہے۔ اس لیے آپ فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"تقویٰ و دین داری کا اہتمام تو بہت رکھے۔ لیکن اپنی طرف سے حتی الامکاں کوئی ایسی امتیازی صورت پیدا نہ ہونے دے۔ جس سے شہرت ہو جائے۔ جب لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہو تو کبھی کبھی کسی قدر ہنس بول بھی لے۔ تاکہ لوگوں کو خواہ مخواہ بزرگی کا گمان نہ ہو۔ لیکن ہنسنے بولنے کی کثرت ہرگز نہ کرے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو زیادہ ہنسنے سے بچاؤ۔ ہنسنے کی کثرت قلب کو مُردہ کر دیتی ہے۔"

یہ رعایتیں اور احتیاطیں صرف دربار اشرفیہ میں ہی برتی جاتی ہیں۔ دوسری خانقاہوں میں آپ کو ان کی مثالیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں گی۔

بیعت

حقیقتِ بیعت

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ:۔

" بیعت کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت۔ اس کی صورت مطلوب نہیں۔ حقیقت مطلوب ہے۔ صورت بیعت ایسی ہے جیسے پھولوں کی کیاری میں گھاس کہ اس سے ایک خوش نمائی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھولوں کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ لیکن پھولوں میں نشوونما میں گھاس کا کچھ بھی دخل نہیں۔ اگر کیاری میں گھاس نہ بھی لگائی جائے۔ محض پھولوں کے پودے ہی لگا دیئے جائیں تب بھی پھول اپنی ساری صفات اور اپنی اصلی آب و تاب ہی کے ساتھ پیدا ہوں گے۔ کیاری میں گھاس نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ذات میں کسی قسم کا نقص واقع نہ ہو گا۔ بیعت کی حقیقت یہ ہے کہ اس کو اپنے شیخ پر پورا اعتقاد ہو جائے کہ یہ میرا خیر خواہ ہے۔ جو مشورہ دے گا۔ وہ میرے لیے نہایت نافع ہو گا۔ غرض اس پر پورا اطمینان ہو اس کی تجویز و تشخیص میں مطلق دخل نہ دے۔ جیسا کہ طبیب حاذق و مشفق کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے۔ بس ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔

بیعت کی صورت شروع شروع میں خواص کے لیے نافع

نہیں ہوتی۔ عوام کے لیے البتہ نافع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کے قلب پر ایک عظمت اور شان اس شخص کی طاری ہو جاتی ہے۔ جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے قول کو باوقعت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ خواص کے لیے کچھ مدّت کے بعد بیعت نافع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا خاصہ ہے کہ جانبین میں ایک تعلق خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ پیر سمجھنے لگتا ہے کہ یہ ہمارا ہے اور مرید سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے ہیں۔ ڈانواڈول حالت نہیں رہتی۔ جب تک جانبین میں پوری مناسبت اور اطمینان نہ ہو جائے۔ بیعت کرنا کرانا بالکل عبث ہے۔" (حسن العزیز جلد ا ملفوظ نمبر ۵۹)

ضرورتِ ضابطہ

حضرت تھانوی کے ہاں چونکہ ہر بات اصول اور ضابطہ کی ہوتی تھی۔ اس لیے لوگوں پر اس کی پابندی ذرا گراں گزرتی تھی۔ حالانکہ وہ قواعد اپنی ذات میں بالکل سہل ہوتے تھے اور ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ نہ کوئی آپ کو اذیت دے۔ اور نہ کسی کا کوئی کام رُکا رہے۔ اور بزرگوں کے ہاں چونکہ یہ قاعدے اور ضابطے نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے لوگ حضرت پر زبانِ طعن دراز کرنے سے باز نہ رہتے تھے۔ جس کے جواب میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"بعض لوگوں نے مجھ سے کہا کہ اپنے اور حضرات کا تو یہ طرز نہ تھا میں نے کہا کہ یہ بات تو حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے کہ حدِ خمر نہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی صرف تعزیر تھی۔ حضرت عمرؓ نے بجائے تعزیر کے یہ حد کیوں مقرر کر دی۔ بس جو وہاں جواب ہے

وہی یہاں بھی ہے یعنی پہلے طبائع میں سلامتی تھی۔ اس لیے واقعات میں قلت تھی۔ لہٰذا صرف تعزیر کافی تھی۔ حد مقرر کرنے کی ضرورت واقع ہوئی۔ تو جو فاروق نے کیا۔ وہی ایک فاروقی بھی کر رہا ہے۔

مَیں نے یہ قواعد سوچ کر بلا ضرورت پہلے سے تجویز نہیں کیے بلکہ جیسے جیسے معاملات لوگ میرے ساتھ کرتے گئے۔ ان کی بنا پر جیسی جیسی ضرورت پیش آتی گئی۔ قواعد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ باقی خدانہ کرے۔ مجھ کو خواہ مخواہ قواعد بنانے کا کوئی شوق تھوڑا ہی ہے کہ لوگوں کو تنگی میں ڈالوں۔ مجھے تو ضرورتوں نے مجبور کر رکھا ہے "

اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے لوگوں کے اعمال میں روز بروز نئی نئی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اور حکومت ان کے انسداد کے لیے قانون پر قانون بنائے چلی جا رہی ہے۔ اسمبلی کا کوئی اجلاس بھی ایسا نہیں گزرتا۔ جس میں نئے نئے قانون اور ضابطے وضع نہ کیے جاتے ہوں۔

شرائط بیعت

انہی لیے حضرت کے ہاں بیعت کے لیے بھی قواعد مقرر تھے۔ جب کوئی طالب آپ سے بیعت کی درخواست کرتا۔ تو آپ ایک پرچہ شرائط بیعت اس کے حوالے کرتے۔ اور پرچہ دیتے وقت اس کو تاکید فرماتے کہ:

"اس کے متعلق یہاں تحریری یا تقریری گفتگو کرنے کی اجازت نہیں۔ گھر پہنچ کر اس کا جواب سوچ کر لکھنا۔ تاکہ آپ کو اس مسئلہ پر پورا غور کرنے کا موقع مل جائے۔ اس کے جو

مناسب ہو گا۔ جواب دیا جائے گا"

کیونکہ آپ جانتے تھے کہ زبانی گفتگو میں وہ ضرور کوئی بے ڈھنگی بات کہہ دے گا۔ جس سے طبیعت میں فہمائش کا تقاضا ہو گا۔ اور اس سے بے لطفی ہو گی۔ جو طالب کے لیے مضر ہے۔

شرائط دو قسم کی تھیں :۔

۱۔ بیعت بلا تعلیم ۲۔ تعلیم بلا بیعت

پہلی قسم کے لیے یہ شرائط تھیں :۔

۱۔ قرآن مجید جتنا پڑھا ہے یا جتنا یاد ہے۔ کسی صحیح پڑھنے والے سے صحیح کرنا ہو گا۔

۲۔ بہشتی زیور کے سب حصے یا سات حصے بہشتی گوہر۔ اصلاح الرسوم اور قصد السبیل کی تذئیل (جس میں کرنے اور چھوڑنے کے کاموں کی فہرست درج ہے) پڑھ کر یا سن کر اس کی پابندی کرنا ہو گی۔

۳۔ میرے چھپے ہوئے وعظ ہمیشہ پڑھنا یا سننا پڑیں گے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم میرے کسی اجازت یافتہ سے (جس کو میں تجویز کر دوں یا طالب کی تجویز پر اجازت دے دوں) حاصل کرنی ہو گی۔ اور جب تک پچیس بار ان سے خط و کتابت نہ ہو چکے۔ مجھ سے براہِ راست تعلیم کی استدعا نہ کی جائے۔

دوسری قسم کے لیے یہ شرط تھی :۔

اگر فی الحال بیعت پر اصرار نہ ہو۔ صرف تعلیم حاصل کرنا ہو۔ تو صرف اوّل تین شرطوں کی پابندی لازم ہو گی۔ چوتھی شرط نہ ہو گی۔ پھر جب باہم خوب مناسبت ہو جائے گی۔ اس وقت درخواست بیعت کا بھی مضائقہ نہیں۔

تنبیہ۔ ابتداء میں بیعت و تعلیم دونوں یکجا جمع نہیں ہو سکتیں۔

اشرف علی

دیگر شرائط

خط و کتابت کے بعد جن کی درخواست بیعت بلا تعلیم منظور فرمانا چاہتے ان کو لکھ دیتے کہ میرا یہ خط میرے فلاں تجویز کردہ اجازت یافتہ کے پاس بیٹھ کر ان سے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیں۔ جب ان کے تعلیمی خط مع میرے اس خط کے میرے پاس بھیج کر مجھ سے درخواست بیعت کی جائے گی۔ میں بیعت کر لوں گا۔ چنانچہ جب وہ ایسا کرتے تو آپ انھیں بلا تامّل بیعت فرما لیتے۔ لیکن خط کے ذریعہ بیعت فرماتے۔ محض بیعت کے لیے سفر کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ کیونکہ یہ مقصود خط کے ذریعہ بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

جن کو بیعت بلا تعلیم سے مشرف فرمایا جاتا۔ ان کو کسی قسم کی تعلیمی خط و کتابت کی اجازت نہ دی جاتی۔ البتہ محض طلبِ دُعا اور دریافت خیریت کے لیے خط لکھنے کی اجازت عطا کی جاتی اور جو اس سے تجاوز کرتا۔ اس کو خود خط کا مسودہ لکھ بھیجتے کہ آئندہ اس طرح لکھا جائے اور میرا مسوّدہ ہمراہ بھیجا جائے۔ تاکہ موازنہ ہو سکے کہ اس میں کمی بیشی تو نہیں کی گئی۔

جو حضرات تعلیم بلا بیعت کے خواستگار ہوتے تو حضرت انھیں خوش فہم تصور کرتے۔ کہ اُنھوں نے محض بیعت پر محض تعلیم کو ترجیح دی۔ جو اصل مقصود ہے۔ چنانچہ ان کی تعلیمی خط و کتابت کی اجازت دے دی جاتی۔ لیکن اگر وہ خط و کتابت کے دوران میں فہم و فکر سے کام نہ لیتے۔ اور بے اصول باتیں لکھ کر باعثِ اذیّت ہوتے۔ تو ان کو اپنے کسی خلیفہ مجاز سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت فرماتے۔ اور اس کی اکثر یہ ترتیب ہوتی۔ کہ اوّل سخت سخت تنبیہات کی جاتیں اگر ان کا اثر نہ ہوتا۔ تو خط بھیجنے کی ممانعت کر دی جاتی۔ جب وہ بلا واسطہ یا بواسطہ معافی چاہتا تو اکثر بواسطہ ہی معافی کے بارہ میں تحریر یا تقریر کی اجازت ملتی۔ کیونکہ اس طرح مزید بدعنوانیوں کا امکان نہ رہتا۔ اور واسطہ

کو صرف سفیر بننے کی اجازت ہوتی۔ وکیل بننے کی نہ ہوتی۔ اور اسے ذی واسطہ کو کوئی مشورہ دینے یا سفارش کرنے کی سخت ممانعت ہوتی۔ ورنہ وہ خود زیرِ عتاب آجاتا۔ اس لیے کبھی کسی کو ایسی جرأت نہ ہوتی۔ اور جب اس امر کی تسلّی ہو جاتی کہ یہ آیندہ اذیت نہ پہنچائیں گے۔ تو اُنھیں معافی دے دی جاتی۔ اور جن سے یہ توقع نہ ہوتی کہ وہ خط و کتابت میں آیندہ اذیّت نہ پہنچائیں گے۔ تو ان کو اس شرط پر معافی دے دیتے کہ آیندہ کے لیے مجھ سے تعلیم حاصل کرنے کا تعلق نہ رکھا جائے۔ مگر اس حالت میں بھی از راہِ خیر خواہی تحریر فرما دیتے کہ اصلاح کرانا بہر حال ضروری ہے۔ اور اس کے لیے کسی دوسرے مصلح کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور اگر کوئی اس کا پتہ پوچھتا۔ تو آپ وہ بھی بتلا دیتے۔

چونکہ یہاں نام نہاد کی بیعت نہ ہوتی تھی بلکہ کام کی بیعت ہوتی تھی۔ اس لیے اس میں عجلت گوارا نہ کرتے تھے اور تاخیر اس لیے فرماتے تھے کہ اُمّید بیعت میں طالب اپنی اصلاح اور مناسبت پیدا کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے ورنہ اگر درخواست پر بیعت فوراً فوراً کر لیا جائے۔ تو نہ صرف وہ بےفکر ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے دل میں اس کی وقعت پیدا نہیں ہوتی۔

صاف مُعاملگی

حضرت تھانوی ایسے لوگوں کو ہر گز بیعت نہ فرماتے۔ جن سے قلب میں کسی قسم کا حجاب ہو۔ خواہ اختلاف طبائع کی وجہ سے۔ خواہ اختلاف مسلک کے سبب سے یا کسی خاص نوعیت کی وجاہت کے سبب سے۔

بعض اوقات تعلیم و تربیت کے لیے اہلِ بدعت۔ اہل حدیث۔ اہلِ قرآن بلکہ قادیانی اور ہندو بھی آپ کے پاس پہنچتے رہے۔ اور بعض خط و کتابت کرتے رہے۔ لیکن حضرت تھانویؒ سب سے اوّل ہی موقع پا کر اپنا مسلک اور دستور صاف صاف بیان فرما دیتے اور اظہارِ حق میں ذرا تامّل نہ

فرماتے ۔ اور غیر مسلم کو تو نہایت مہذّب عنوان سے بلا ادنیٰ دلآزاری فرمادیتے کہ اُس کے لیے اسلام شرطِ اوّلین ہے ۔ تاکہ بعد میں کسی قسم کی خلش فریقین کے دل میں نہ رہے ۔

نوابوں کو اور اولیانِ ریاست کو ان کی پیہم درخواستوں کے باوجود بیعت فرماتے اور نہایت لطافت و متانت اور تہذیب و شائستگی کے ساتھ عذر فرمادیتے ۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ :۔

"کسی کی تربیّت اس وقت تک اپنے ذمّہ نہ لینا چاہیئے جب تک اپنے دل کو اس سے اتنا کھلا ہُوا نہ پائے کہ اگر خود اس کی ذات کو نالائق نہ کہہ سکے ۔ تو کم از کم اتنا تو کہہ سکے کہ آپ کی یہ حرکت بڑی نالائق ہے ۔ ورنہ پھر اس کی اصلاح کیا ہو سکتی ہے اور پھر اس کو اس سے فائدہ ہی کیا پہنچ سکتا ہے ۔"

اِس پر ایک اہلِ خصوصیت و صاحبِ اجازت نے عرض کیا کہ حضرت پھر ایسے لوگ فیض کس طرح حاصل کریں ۔ فرمایا :۔

"یہ تو انہیں کے اختیار کی بات ہے ۔ وہ برتاؤ ہی ایسا کریں کہ دل کھل جائے ۔ کہ جو چاہیں کہہ سکیں ۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ برتاؤ سے دل کُھل جاتا ہے ۔"

مگر بایں ہمہ آپ بعض درویشوں کی طرح اُمراء و اہلِ وجاہت کے ساتھ خشونت کا برتاؤ نہ کرتے تھے ۔ بلکہ فرماتے تھے کہ :۔

"اس معاملہ میں میرا معمول یہ ہے کہ میں ان کے ساتھ نہ تو تملق کا برتاؤ کرتا ہوں ۔ نہ اہانت کا ۔ بلکہ متوسط درجہ کا برتاؤ کرتا ہوں ۔ جس میں ان کی امتیازی شان اور حفظ مراتب کی بھی رعایت ہوتی ہے ۔ کیونکہ جس برتاؤ کے وہ عادی ہوتے ہیں اور وہ عام طور پر متوقع رہتے ہیں ۔ اس کا بھی بقدر

ضرورت لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ دل شکنی نہ ہو لیکن اگر ان کی طرف سے کوئی برتاؤ نازیبا ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسا برتاؤ جس سے اہلِ دین کا استخفاف مترشح ہو۔ تو پھر میں ان کی بالکل رعایت نہیں کرتا۔"

جو لوگ پہلے کسی صحیح سلسلہ بیعت سے وابستہ ہوتے اور اپنے شیخ کی وفات کے بعد حضرت سے مکرر بیعت ہونا چاہتے۔ تو حضرت انھیں عموماً ازسرِ نو بیعت نہ فرماتے بلکہ فرماتے کہ،

"پچھلی بیعت مع اپنی تمام برکات کے بدستور قائم ہے۔ تجدید بیعت کی حاجت نہیں البتہ تعلیم طریق کے لیے حاضر ہوں۔"

اس کے باوجود کوئی اپنی تسلّی اور اطمینان کے لیے بیعت پہ اصرار کرتا۔ تو آپ پھر انکار نہ فرماتے۔ کیونکہ تجدید بیعت خلاف طریق نہیں۔

اِنتہائے ادب

اگر کسی فاسد العقیدہ پیر کا مرید پچھلی بیعت کو فسخ کر کے حضرت سے بیعت ہوتا۔ اس کو بھی سخت تاکید فرماتے کہ اپنے پچھلے پیر کی نسبت عمر بھر کوئی گستاخی کا کلمہ زبان پہ نہ لانا۔ اگرچہ میں بھی بُرا کہوں۔ مگر تم مت کہنا۔ کیونکہ اوّل اوّل اس نے اس طریق کی طرف متوجّہ کیا۔ اور راہ پہ ڈالا۔ اس لیے وہ محسن ہے۔ گو راستہ غلط بتایا۔ لیکن مقصود کا شوق تو اسی نے دلایا۔ اس راہ میں ناشکری بہت ہی مضر ہے۔ یہ طریق بس بالکل ادب ہی ادب ہے۔ بے ادبی سے بڑھ کر اس طریق میں کوئی چیز مضر نہیں۔ یہاں تک کہ بعض حیثیتوں سے معصیت بھی اتنی مضر نہیں کیونکہ معصیت کا تعلق ایسی ذات سے ہے۔ جو انفعال سے پاک ہے اور بے ادبی کا تعلق شیخ سے

ہے۔ جو بشر ہے اور جس کو بے ادبی سے تکدر ہوتا ہے۔ جو مرید کے حق میں سم قاتل ہے۔

حضرت کے ہاں فاسد العقیدہ پیر وں کے احترام کا اتنا اہتمام تھا مگر اُن کے ہاں حضرت اور اُن کے سلسلہ کے اکابر کو بیہودہ اور فحش گالیاں دینے کا رواج عام تھا اور ہے۔

حضرت تھانوی حضرت حاجی صاحب کے طریق کے مطابق بیعت کرتے وقت طالبین کو چاروں سلسلوں میں داخل فرماتے تھے۔ تاکہ سب اکابر طریق سے انتساب ہو جائے اور سب کی برکات نصیب ہوں۔ چاروں سلسلوں کے بزرگوں سے یکساں اعتقاد رہے اور ایک سلسلہ کے بزرگوں کو دوسرے سلسلہ کے بزرگوں پر فضیلت نہ دیں۔ کیونکہ آخر اس تفصیل سے دوسرے بزرگوں کی تنقیص لازم آتی ہے۔ جو ناجائز بھی ہے اور خطرناک بھی۔ کیونکہ بزرگوں کے ساتھ سوءِ ظن بسا اوقات سوءِ خاتمہ کا سبب ہو جاتا ہے۔ ورنہ برکات سے محرومی تو ضرور ہوتی ہے۔

رعایتِ خاص

حضرت تھانوی عورتوں کو یوں تو مسنون طریقہ سے پردہ کی آڑ سے بذریعہ کسی رومال یا کپڑے کے بیعت فرماتے تھے۔ اور بیعت کرنے کے وقت اُن کے کسی محرم یا اپنی اہلیہ محترمہ یا اپنی کسی محرم مستورہ کو اپنے پاس بٹھا لیتے تھے اور اس بات کی بھی تاکید فرما دیتے تھے کہ میں جو کچھ کہتا جاؤں تم بھی وہ چپکے چپکے کہتی جاؤ۔ پکار کر نہ کہو۔ اور ایسی بوڑھیاں جو حضرت سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ ان کو بھی بیعت کے وقت پردہ میں بٹھا دیا جاتا تھا۔ جس سے اس طریق کے ادب کا تحفظ مقصود تھا۔ مگر ان کے لیے مردوں کی طرح مریض کو بھی از راہ ترحم جلد بیعت کر لیتے تھے۔

تاکیدِ خاص

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ:۔

"مَیں بیعت کے وقت اس سے بھی منع کر دیتا ہوں کہ کسی لڑنا جھگڑنا نہیں۔ کیونکہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کم عقل لوگ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور اپنے بزرگوں کو گالیاں دلاتے ہیں۔ کیونکہ دو ہی حالتیں ہیں یا تو وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کرے گا۔ تو یہ بھی مجھے پسند نہیں یہ استخواں فروشی ہے۔ کہ خواہ مخواہ اپنے بزرگوں کی تعریف کراتے پھریں۔ جسے غرض ہو گی۔ وہ خود آ کر دیکھ لے گا تمھیں ترغیب دینے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ گالیاں دے گا۔ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ ایک مسئلہ کسی کے سامنے بیان کر دیا کہ اس نے ابھی تک تو اُنھیں کو بُرا بھلا کہا تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے یہ کہا تھا کہ فلاں بزرگ فرماتے تھے۔ بس اب ان بزرگ پر گالیاں پڑنا شروع ہو گئیں۔ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک مخالف کے سامنے اپنے شیخ کا ذکر کیا جائے اور اُسے گالیاں دلوائی جائیں۔ اوّل تو آپ کو جوش ہی کیوں آیا اگر آیا تھا۔ تو اپنی ہی طرف منسوب رہنے دیا جاتا۔ یہ بالکل نادانی ہے کہ جوش آپ کو ہو اور نام شیخ کا لیں۔ تاکہ تیرا جو کچھ ہو۔ انھیں پر ہو۔"

ھدیہ

اِتّباعِ سُنّت

حضرتِ تھانوی کے ہاں کوئی بات بھی خلاف کتاب وسنّت نہ ہوتی تھی بلکہ آپ طبعًا کوئی خلاف شرع بات برداشت کر ہی نہ سکتے تھے کانپور سے واپسی کے بعد آپ نے گو اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے فرمان کے مطابق توکلًا علی اللہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔ مگر یہ توکل بھی اُس زمانہ کے مقتضیات کے عین مطابق تھا۔ یعنی آپ سال بھر کا خرچ ہمیشہ اپنے پاس جمع رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ کے ارشاد کے مطابق :۔

"اس سے اطمینان رہتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کو سال بھر کا خرچ دے دیا کرتے تھے۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ سال بھر کا خرچ ذخیرہ کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔"

قلیل ہدایا کی قبولیت اور کثیر ہدایا کا استرداد بھی عین سنّت کے مطابق تھا۔ ایک روز مجلسِ عام میں اس کی علت و حکمت کے متعلق خواجہ عزیز الحسن کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ :۔

"ھدیہ قبول کرنے کا طریقہ میں نے ایجاد نہیں کیا۔ یہ بھی دین کا طریقہ ہے۔ الحمد للہ مجھے اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ کوئی

دستور العمل سنّت اور شریعت کے خلاف نہ ہو۔ جو خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے۔ ایک بات میں میرا خیال تھا کہ شاید سنّت کے خلاف ہو۔ وہ یہ کہ اگر کوئی بڑی رقم کا ہدیہ دیتا ہے۔ تو گو دینے والے کی حیثیّت سے زیادہ نہ ہو اور خلوص میں بھی کمی نہ ہو۔ لیکن مجھے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اور طبیعت پر بوجھ سا ہوتا ہے جس کی وجہ سے واپسی کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ یہاں کیا عذر شرعی ہے۔ لیکن باوجود عذر سمجھ میں نہ آنے کے چونکہ طبعی بات کی مخالفت مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے میں انکار کر دیتا تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ محض طبعی معذوری ہے۔ سنّت میں اس کی اصل نہیں ہے۔ بہت دنوں مجھے یہ شبہ رہا۔ میں اپنے کو اس واپسی میں قاصر سمجھتا تھا۔ مگر واپس کر دیتا تھا۔ لیکن الحمد للہ میرا وہ شبہ جاتا رہا۔ جب سے کہ میں نے ایک حدیث دیکھی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ کوئی خوشبو پیش کرے۔ تو واپس مت کرو۔ کیونکہ اس کا بار کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اور فرحت کی چیز ہے۔ پس عدم رد کی علّت خفیف المحل ہونے کو بتلایا الحمد للہ کہ اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ طبیعت پر بوجھ پڑنا بھی ہدیہ کو رد کرنے کا ایک معقول و مشروع عذر ہے۔ میں نے احتیاطاً اوروں سے بھی پوچھا کہ اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ مجھے خیال ہوا کہ کہیں نفس نے ہی یہ مطلب نہ تراشا ہو۔ مگر وہ کہنے لگے کہ اجی دلالت صاف ہے۔"

مقدارِ ھدیہ

آپ فرماتے تھے کہ :۔

" اہلِ علم کو اموال کے باب میں بہت احتیاط چاہیئے۔ لینے میں بھی اور دینے میں بھی۔ میرے یہاں لینے کے بھی شرائط ہیں کہ ایک دفعہ ایک دن کی آمدنی سے زیادہ ہدیہ نہ دیا جائے۔ مثلاً اگر پندرہ روپیہ ماہوار کا ملازم ہے۔ تو ایک بار میں آٹھ آنہ یومیہ سے زیادہ نہ دے۔ اور دو ہدیوں کے درمیان کم از کم ایک ماہ کا فصل ہو اور پابندی کے ساتھ نہ دے "

شرائطِ ھدیہ

حضرت تھانوی کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب تک ہدیہ دینے والے کے متعلق آپ کو پورا اطمینان اور شرح صدر نہ ہو جاتا تھا کہ یہ بالکل صدق و اخلاص سے ہدیہ دے رہا ہے۔ اور یہ میرے متعلق کسی قسم کے دھوکہ میں نہیں ہے اور اس ہدیہ کے قبول کرنے میں کسی دینی یا دنیوی مصلحت میں خلل نہیں پڑتا۔ نہ اس کی۔ نہ میری۔ خواہ وہ گرانی ہی کے درجہ میں ہو۔ اس وقت تک ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ اور جن پر ان امور کے متعلق پورا پورا اطمینان ہو چکا تھا کہ وہ جو کچھ دیں گے۔ ان سب امور کی رعایت کر کے دیں گے۔ تو ان کے لیے کوئی قواعد و ضوابط نہیں تھے۔ بلکہ مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ :۔

" ایسے لوگ تو اگر مجھے اپنا سارا گھر بھی بخش دیں۔ تب بھی انکار نہیں "

اسی سلسلہ میں ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ :۔

" فلاں مقام سے جو آتا ہے۔ کبھی کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتا ہے۔

اوّل تو مجھے اجنبی شخص سے جس سے کہ پوری پوری بے تکلفی نہ ہو۔ ہدیہ لیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے اعتقاد میں مجھے کیا سمجھ رہا ہو۔ اور میں بعد ملاقات کچھ اور ثابت ہوں۔ پھر اس کو اس ہدیہ کا افسوس ہو۔ جیسے ایک شخص نے ایک مسئلہ پوچھا۔ اس کا جواب اس کے مذاق یا خواہش کے خلاف اسے ملا۔ تو کہنے لگا کہ ہم نے اتنے دنوں خدمت کی۔ پھر بھی موقع پر ہماری مدد نہ کی۔

دوسرے جس شخص کو مجھ سے دین کا فائدہ نہ پہنچا ہو۔ اس سے کچھ لینا سخت ذلت کی بات ہے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ گویا میں نے اسے بیعت ہی اس لیے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان لوگوں کے ہدیہ واپس کر دیتا ہوں۔ جو مجھ سے دین کی باتیں نہیں پوچھتے۔ یا اپنی اصلاح نہیں چاہتے کیونکہ سب خرابیوں کی بنا دین سے ناواقفیت اور فکر اصلاح نہ کرنے میں ہے جو دین کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کی دنیا کی سمجھ بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص دیندار ہوتا ہے۔ گو اسے دنیا کا تجربہ نہ ہو۔ لیکن دنیاوی اُمور میں بھی اس کی سمجھ سلیم ہوتی ہے۔ حلال روزی میں بھی یہی اثر ہے۔ برخلاف اس کے حرام روزی سے فہم مسخ ہو جاتا ہے۔

ہاں جو مجھ سے دینی نفع حاصل کرتا رہے۔ وہ اگر کبھی کچھ محبت سے دے۔ تو کس کو انکار ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دینے میں بجز محبت کے اور کوئی نیت نہ ہو۔ یہاں تک کہ ثواب کی نیت نہیں ہونی چاہیئے۔ گو حق تعالیٰ کے تعلق کی وجہ سے ثواب ویسے بھی مل جاتا ہے۔ جیسے اگر کوئی اپنے

باپ یا اپنے لڑکے کو کچھ دے۔ تو نیّت ثواب کی نہیں ہوتی۔ لیکن ثواب ملتا ہے۔"

اقسامِ ہدیہ

اِسی سلسلہ میں ایک بار فرمایا کہ:-

"آج کل جو بزرگوں کو بصورت ہدایا دیا جاتا ہے اکثر اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو بغرضِ دنیا یعنی رشوت۔ دوسرے بغرض ثواب اُخروی یعنی صدقہ و خیرات۔ تیسرے کسی امر دینی کی غرض سے (مثلاً استغفار کے سلسلہ میں) اس کی اُجرت اور میں ان تین قسموں میں سے ایک قسم کا بھی ہدیہ نہیں لیتا۔ البتہ جو محبّت سے دیا جاوے۔ وہ لے لیتا ہوں۔ کیونکہ صدقہ لینا تو مجھے بوجہ غنی ہونے کے جائز نہیں اور اُجرت اُمورِ دینیہ پر لینا بھی جائز نہیں سمجھتا۔ اور رشوت تو سب ہی کے نزدیک حرام ہے۔ جو محض محبت کی وجہ سے ہو۔ وہ ہدیہ ہے اور اسی کا قبول کرنا سنّت ہے۔ اور دین کی حفاظت بلا اِتبّاعِ سُنّت نہیں ہو سکتی۔ ہماری طرف جو لوگوں کی توجہ ہے۔ وہ سب دین کی بدولت ہے۔ اس لیے ہمیں اس دین کی عزّت قائم رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اس کی عزّت نہ رہے۔ تو پھر ہم کو کون پوچھتا ہے۔"

ہدیۂ طلبا

اس سلسلہ میں ایک اور مولوی منفعت علی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی

وکیل سہارنپور نے صاحب اشرف السوانح سے فرمایا کہ میں حضرت تھانوی کی خدمت میں بزمانہ طالب علمی جب کبھی ہدیہ پیش کیا۔ تو آپ نے یہ فرماکر واپس کر دیا کہ :۔

"اگر تو تم طالب علمی ہی کر رہے ہو۔ اس لیے سرِ دست تمھارا مجھ پر حق ہے۔ اگر میں اسی طرح ہدایا لینے لگوں۔ تو سونے کی دیواریں کھڑی کر لوں"

واقعی حق تعالیٰ نے آپ کو جس قسم کی محبوبیت و جاذبیت بخشی تھی۔ اُس کی وجہ سے بکثرت ہدایا آتے تھے۔ اگر حضرت ان کو قبول کرنے میں بھی ویسی ہی وسعت دکھلاتے۔ تو بلا خوفِ تردید کروڑپتی بن جاتے۔

تعلّق باللہ

مگر وہاں تو معاملہ دوسرا تھا۔ اور تو اور۔ خود اپنے برادرِ عزیز منشی اکبر علی صاحب کا ہدیہ بھی آپ نے قبول کرنے میں عذر فرمادیا۔ آپ جب کانپور سے تھانہ بھون آکر مقیم ہوئے تو آپ کے برادر موصوف ان دنوں بریلی میونسپلٹی میں بطور سیکرٹری ملازم تھے اور قریبًا پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اُنھوں نے یہ چاہا کہ پچاس روپیہ ماہوار حضرت کو بھیج دیا کریں۔ جو آپ کانپور میں بحیثیت مدرس لیتے تھے۔ اور حضرت کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا۔ تو آپ نے اُنھیں لکھا کہ :۔

"اس کی قبولیّت میں ایک خرابی ہے۔ اب تو میری نظر کسی خاص شخص پر نہیں۔ صرف اللہ پر ہے۔ اگر تم نے ماہوار مقرر کر دیا تو پھر دل بریلی میں ہی پڑا رہے گا۔ اور ہر ماہ کے اختتام پر یہ خیال کرنا پڑے گا کہ آج تنخواہ وصول ہوئی ہو گی۔ آج روپیہ روانہ کیا ہو گا۔ آج آرہا ہو گا۔ بروقت

نہ آیا۔ تو اور پریشانی بڑھے گی۔ کہ نہ معلوم کیا وجہ ہوئی۔ پھر مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ کی شان تو نہ رہے گی۔ کہ جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہاں سے حق تعالیٰ دیتے ہیں۔ دوسرے یہ بُرا ماننے کی بات نہیں۔ گو تمھاری تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ رہ جائے گی۔ لیکن ضرورتیں مختلف ہوا کرتی ہیں بعض دفعہ پانچ سو کا خرچ پڑ جائے گا۔ اس وقت تم گرانی محسوس کرو گے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر وقت جوشِ محبّت نہیں رہتا۔"

غرضیکہ حضرت تھانوی کے وسعت کے ساتھ ہدایا قبول کرنے اور ان کے محدود تعداد میں قبول کرنے کے لیے اُصول وضع کرنے میں اُسی تعلّق باللہ کو دخل تھا۔ جس کے بعد دُنیا کی کسی چیز کی محبت و وقعت دل میں باقی نہیں رہ جاتی۔

تبرّکات

امتیازی وصف

صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ:۔

"چونکہ حضرت والا پر بفضلہ تعالیٰ توحید اور تنزیہ باری تعالیٰ کا بہت غلبہ ہے اور ہر شے کو اس کے درجہ پر رکھنا۔ اور مقصود و غیر مقصود میں فرق کرنا حضرت کا امتیازی وصف

ہے جو ایک مجدّد اور مصلح اور حکیم الامّت میں ہونا لازمی ہے۔ اس لیے تبرکات کے باب میں بھی حضرت کا مذاق نہایت معتدل ہے۔ یعنی ان کی برکات کا انکار نہیں۔ بلکہ بزرگوں کے تبرکات کی برکتوں کے واقعات اپنے بھی اور دوسروں کے بھی مشاہدہ کیے ہوئے اکثر نہایت معتقدانہ طور پر بیان فرماتے رہے ہیں۔ لیکن جو اصل دولت بزرگوں کے پاس ہے جس نے ان حضرات کو اس قابل بنا دیا کہ اس کی وجہ سے ان کی چیزوں میں بھی برکت پیدا ہو گئی۔ اس دولت کی تحصیل کی جانب خود بھی ہمیشہ نظر رہتی ہے اور دوسروں کو بھی اسی کی تحصیل کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ اور فرماتے رہتے ہیں کہ بزرگوں کے اصل تبرکات تو اُن حضرات کے یہ اقوال و اعمال و احوال ہیں۔ ان سے برکت حاصل کرنی چاہیئے"۔

عطیۂ شیخ

چنانچہ جب حضرت کے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب قدّس سرہٗ نے بغایت شفقت وعنایت اپنا کتب خانہ حضرت تھانوی کو عطا کرنا چاہا۔ تو اس وقت حضرت تھانوی نے نہایت ادب و احترام سے عرض کیا کہ:۔

"حضرت کتابوں میں کیا رکھّا ہے۔ مجھے تو کچھ اپنے سینہ مبارک سے عطا فرمائیے"۔

اِس پر حضرت حاجی صاحب بہت مسرور ہوئے اور جوش میں آ کر فرمایا کہ:۔

"جی ہاں۔ سچ تو یہی ہے کہ کتابوں میں کیا رکھّا ہے"۔

حالانکہ کتابوں کا عطیہ دوسرے تبرکات کے مقابلہ میں ہزار درجہ بہتر ونافع ہے۔ مگر حضرت تھانوی رح کی نظر کتابِ علم پر نہ تھی۔ بلکہ انوارِ علم پر تھی۔ جس کا محض پرتو کتاب پر ہوتا ہے۔

اَدبِ تبرکات

جس طرح بزرگوں کی شان میں اَدنیٰ بے اَدبی بھی موجب محرومی و برکاتِ باطنی ہوتی ہے۔ اس طرح ان کے تبرکات کی بے اَدبی بھی باطنی محرومی کا باعث ہوتی ہے۔ مگر ان کے ادب میں حُدود سے تجاوُز کر کے غلو کرنا تو معصیت کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے حضرت تھانوی کو اس معاملہ میں اعتقاداً یا عملاً زیادہ شغف نہ تھا۔ یہاں تک کہ ان کا اَدب اور اَدب میں اعتدال و احتیاط کی نگہداشت ہی بار خاطر ہو رہی تھی۔ اس لیے آپ کے پاس حضرت حاجی صاحب کے جس قدر تبرکات موجود تھے وہ آپ نے ایسوں میں تقسیم کر دیئے تھے۔ جن کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ ان کا اُدب کریں گے۔ اور ان تبرکات میں سے صرف حضرت حاجی صاحب کی تعلیمات پر اکتفا کیا اور فرمایا کہ :-

"اگر اللہ تعالیٰ نے اُنھیں پر عمل کی توفیق بخشی۔ تو ظاہری تبرکات کے مقابلہ میں ہزار درجہ بہتر ہیں۔"

ایک صاحب نے آپ سے سوال کیا کہ شیخ کے تبرک کو پہن کر پاخانہ جانا جائز ہے یا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ :-

"جائز تو ہے۔ مگر کچھ واجب بھی تو نہیں۔ اور ہر جائز کام کا کرنا ضروری ہی کیا ہے خود میری یہ حالت ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ مبارک جلال آباد سے تھانہ بھون آتا ہے۔ تو اگرچہ اس مکان کی طرف جہاں وہ رکھا جاتا ہے۔

پاؤں کرنا جائز ہے۔ مگر غلبۂ ادب کی وجہ سے غالب احوال میں
اس طرف پاؤں نہیں کر سکتا۔"

برکتِ تبرکات

حضرت تھانوی تبرکات کی برکت کے نہ صرف قائل تھے۔ بلکہ اکثر اسے محسوس بھی کرتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میں برکت کا تو معتقد ہوں۔ لیکن جو آج کل لوگوں نے ان کے متعلق اعتقاد اور عمل میں غلو کر رکھا ہے۔ اس کو ناجائز سمجھتا ہوں۔"

ایک بہت ہی صالح اُمّی بزرگ حاجی عبداللہ نے جو اوّل حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت تھے۔ اور پھر خود حضرت سے بیعت ہو گئے۔ حضرت کو ایک بالکل معمولی کپڑے کا روئی دار عبا ہدیۃً دیا تھا۔ جو حضرت نے خود استعمال کیا۔ اور اس کے متعلق فرمایا کہ:۔

"اُس کی خود میں نے یہ برکت محسوس کی اور جس کا بارہا تجربہ کیا کہ جب تک میں اس کو پہنے رہا۔ معصیت کے وساوس بھی بالکل نہ آتے تھے۔"

زیارتِ تبرکات

تبرکات کی زیارت کا جس طرح آج کل دستور ہے۔ اس سے حضرت کو سخت نفرت تھی۔ ایک دفعہ میرٹھ میں ایک صاحب سلسلۂ شیخ نے حضرت کی موجودگی میں حضرت حاجی صاحب قدّس سرہٗ کے ایک خرقہ کو مجلس میں ایک ایک کے سامنے پیش کیا تاکہ اس کو چوما جائے اور آنکھوں سے لگایا جائے حالانکہ یہ مروّجہ تعظیم و تکریم حضرت کے اپنے ہی پیر و مرشد کے خرقہ کی کی جا رہی

تھی۔ مگر پھر بھی حضرت نے فرمایا کہ:۔

"مجھ کو ان کا یہ فعل اچھا معلوم نہیں ہوا۔ بلکہ ایک ڈھونگ سا معلوم ہوا ہے"

جلال آباد میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامزد جبہ شریف رکھا ہوا ہے۔ جس کی آپ نے اپنے اکابر سے اس کی تصدیق وجدانی سنی ہوئی تھی۔ اسے بغرض زیارت تھانہ بھون بھی لے جایا جاتا تھا۔ اور خدام جبہ ایک لمحہ کے لیے بھی جبہ شریف کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ کرتے تھے۔ حضرت نے بھی اس کا شوق ظاہر کیا۔ مگر یہ شرط لگادی کہ مجھے بالکل تنہائی میں زیارت کا موقع دیا جائے۔ چونکہ ان لوگوں کو حضرت کی خاص طور سے خاطر عزیز تھی۔ اس لیے انھوں نے آپ کو تنہائی میں زیارت کرنے کی اجازت دے دی۔ اور خود وہاں سے ہٹ گئے۔ چنانچہ آپ نے بالکل تنہائی میں نہایت ذوق و شوق سے محلّی بالطبع ہو کر خوب اطمینان کے ساتھ زیارت کر کے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس وقت حضرت پر جو کیفیات طاری ہوئی ہوں گی۔ ان کی حضرت کے سوا کسی کو خبر نہ ہو سکی۔

احتیاط و ممانعت

حضرت تھانوی رحمہ نے لوگوں کو اس معاملہ میں غلو اور خلافِ شرع رسوم سے بچانے کے لیے یہ تدبیر کی کہ جب آپ نے اپنے پٹے دار بال کٹوائے تو ان کو حجام کے پاس نہ رہنے دیا۔ تاکہ وہ کہیں ان کو بیچنا نہ شروع کر دے۔ کیونکہ آپ بچشمِ خود مشاہدہ فرما چکے تھے۔ کہ حضرت حاجی صاحب کے تبرکات کا بعض لوگ معتقدین کے ہاتھ بڑی بڑی قیمتوں پر بیچنے پہ آمادہ تھے۔ اور پھر ان بالوں کو خاص اہتمام کے ساتھ دفن کرا دیا۔ تاکہ معتقدین کے ہاتھ نہ پڑنے پائیں اور وہ ان کا کوئی ڈھونگ نہ بنا سکیں۔

علاوہ ازیں آپ نے اپنے وصیت نامہ "الاستحضار للاحتفار" میں یہ وصیت بھی فرمادی کہ میری مستعمل چیزوں کے ساتھ متعارف طریق سے تبرکات کا سا معاملہ نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی محبت سے بطریق شرعی مالک بن کر مخفی طور پر اپنے پاس رکھے۔ تو مضائقہ نہیں۔ مگر اعلان اور دوسروں کو دکھلانے کا اہتمام نہ کیا جائے۔

حُصُولِ تبرکات

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"بزرگوں کے تبرکات حاصل کرنے کا سہل طریق جس میں ان کو کچھ تردد نہیں کرنا پڑتا۔ یہ ہے کہ اپنی کوئی چیز ان کو عاریۃً دیکر یہ عرض کیا جائے کہ کچھ دیر اس کو استعمال فرماکر واپس فرمادیں۔ میں نے ایک رومی شیخ کو حضرت حاجی صاحب سے اس طرح تبرک حاصل کرتے دیکھا تھا۔ جو مجھ کو بہت پسند آیا تھا۔"

مزید فرمایا کہ:۔

"تبرکات بزرگوں کے ہوتے ہیں۔ میں گنہ گار اس قابل کہاں کہ مجھ سے تبرکات حاصل کیے جائیں۔ لیکن بعض اپنے حسنِ ظن اور محبت سے مانگتے ہیں۔ تو اگر اس وقت کوئی چیز نہ ہوئی۔ تو میں ان کو بھی یہی ترکیب بتا دیتا ہوں اور یہ صورت ہے بھی بہت راحت کی کہ اس میں مجھ کو کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔"

چنانچہ اکثر فہیم خدام ایسا ہی کرتے تھے اور بعض کی درخواست پر حضرت اپنی خاص مستعمل اشیاء بھی مرحمت فرمادیتے تھے۔ نیز چونکہ نوزائیدہ بچوں کے کرتوں کے لیے اکثر حضرت سے کپڑا بطور تبرک مانگا جاتا تھا۔ اس لیے آپ اپنے کہنہ مستعمل کرتوں میں سے ایسے بچوں کے ناپ کے چند چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرا کر ایسے موقعوں

کے لیے رکھ لیتے تھے۔ تاکہ وقت پر تردد نہ کرنا پڑے۔ اور درخواست پر فوراً نکال کر دیا جا سکے۔

عملیات

خواصِ قرآنی

قرآنِ پاک میں اس کی مختلف صفات بیان فرمائی گئی ہیں۔ ان میں سے اس کی ایک صفت "شفاء" بھی ہے۔ سورۂ یونس کے چھٹے رکوع میں شفاء کے ساتھ لما فی الصدور کا بھی اضافہ فرمایا گیا ہے کہ یہ دلوں کی بیماری کے لیے شفاء ہے مگر آگے سورۃ بنی اسرائیل اور سورہ حٰم سجدہ میں لفظ مطلق شفاء کا آیا ہے کہ

نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ

ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جن سے روگ دفع ہوں۔ (بنی اسرائیل ۹/۱۵)

عام مفسّرین نے شفاء کی یہ تفسیر کی ہے کہ اس سے روحانی بیماریاں دُور ہوتی ہیں۔ دلوں سے عقائدِ باطلہ اخلاق ذمیمہ اور شکوک و شبہات کے روگ مٹ کر صحتِ باطنی حاصل ہوتی ہے۔ مگر صاحب "روح المعانی" اور "زاد المعاد" نے اس کا فلسفہ اور تجربہ بیان کر کے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ بسا اوقات اس کی مبارک تاثیر سے بدنی صحت بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ قیصرِ

روم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں دردِ سر کی شکایت لکھ بھیجی۔ تو آپ رضؓ نے ایک ٹوپی سلوا کر بھیج دی کہ یہ پہنی جائے۔ جب تک وہ ٹوپی سر پہ رہتی درد کو سکون رہتا۔ اور جب اس کو اُتار دیتا۔ پھر درد ہونے لگتا۔ اسے تعجُّب ہوا اور کھول کر اس ٹوپی کو دیکھا تو اس میں صرف بسم اللہ لکھی تھی۔

گو مادہ پرست اور ان کا حلقۂ اثر قرآن کے الفاظ کی تاثیر کا قائل نہیں مگر مادہ پرستوں کا مورثِ اعلیٰ ابو جہل اس کا قائل تھا۔ چنانچہ اس نے جب دیکھا کہ محض قرآن کی آیات سننے سے بڑے بڑے ذی مرتبت کفّار حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔ تو اس نے مُنادی کرادی کہ جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہو۔ وہاں شور و غل مچاؤ۔ تاکہ اس کی آواز لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ اور انھیں اس سے متاثر ہونے کا کوئی موقعہ نہ ملے۔

مُفیدِ خدمت

قرآن کے خواص پر بڑے بڑے آئمہ نے اپنے تجربہ کی بناء پر مفیدِ خلائق رسائل لکھے ہیں۔ جن میں سے حضرت تھانوی نے

۱۔ امام یافعی شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الدُّر النظیم جس میں اُنھوں نے کتاب البرق اللامع تالیف قاضی ابی بکر غسانی اور کتاب خواص آیات و فواتح تالیف امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو یکجا جمع کیا۔ اور

۲۔ شیخ شہاب الدین شرجی یمنی کی کتاب الفوائد فی الصلوٰۃ العوائد جس کے حاشیہ پر امام محمد شیرادی الشافعی الشرقاوی کا رسالہ بہ فوائد الغرالاسنیٰ فی شرح اسماء الحسنیٰ درج تھا کو عوام کے لیے مفید پاکر ان کا ترجمہ کر کے "اعمالِ قرآنی" کے نام سے اُردو میں منتقل کیا جن کا مقصد صرف

عامۃ المسلمین کو خواص قرآنی کے متعلق اکابر سلف کے تجربات سے مطلع کرنا اور پیشہ ور پیروں کے ہتھ کنڈوں۔ خلافِ شرع اور غیر معتبر باتوں سے بچانا تھا اور بس۔

ارشادِ مرشد

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ العزیز نے آپ کو تاکید فرمائی تھی کہ اگر لوگ تعویذ مانگنے آئیں۔ تو جو کچھ اس وقت سمجھ میں آیا کرے۔ لکھ کر دے دیا کریں۔ اس لیے حضرت تھانوی اپنے شیخ کے ارشاد کی تعمیل میں معمولی شکایات دردسر۔ بخار۔ نظر وغیرہ کے تعویذ اسی طرح لکھ کر دیتے تھے۔ عاملوں کی قیود کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ اور نہ ہی خاص عملیات کی پابندی کرتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات تو کوئی مناسبِ حال آیت یا حدیث یا دُعا لکھ دیتے تھے۔ جو عین وقت پر خیال میں آجاتی تھی اور بفضلہٖ تعالیٰ بالعموم مقصد براری ہو جاتی تھی۔

گرانیِ طبع

مگر ذاتی طور پر حضرت تھانوی تعویذ گنڈوں کے شغل کو بہت ہی ناپسند فرماتے تھے کیونکہ

۱۔ ان کے طالب زیادہ تر دنیا دار ہوتے ہیں۔ جو دُنیوی اغراض کے لیے حاصل کرتے ہیں۔ جس سے صرف وقت ہی ضائع نہیں ہوتا۔ دینی ضرر بھی ہوتا ہے۔

۲۔ لوگ ان کو تدبیر سے زیادہ نافع اور دُعا سے زیادہ مؤثر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا سمجھنا خلافِ سنّت ہے۔

۳۔ جن کے تعویذ گنڈے مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ لوگ انھیں صاحبِ

کرامات بزرگ سمجھنے لگتے ہیں۔

اس گرانیِ طبع کی وجہ سے حضرت عام طور پر تعویذ نہیں دیا کرتے تھے۔ جمعہ کو تو بالکل نہ دیتے تھے تاکہ ضرورت مندوں کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی طلب نہ کرنے لگیں ویسے بھی تحریری یا زبانی درخواست پر ایک سے زائد تعویذ نہ دیتے تھے۔ اگر آپ سے کوئی آسیب یا سحر وغیرہ کے لیے تعویذ مانگتا تو آپ عام طور پر یہ کہہ کر انکار فرما دیتے تھے کہ میں عامل نہیں مگر از راہِ شفقت یہ بھی فرما دیتے تھے کہ اگر کسی عامل کا مجھ سے پتہ پوچھا جائے تو وہ بتا دوں گا۔ چنانچہ جو پتہ پوچھتا۔ اسے بتا دیتے۔ جو عامل ہونے کے انکار کے باوجود تعویذ مانگنے پر اصرار کرتا۔ تو اُسے اس شرط پر تعویذ عطا فرماتے کہ:-

"اگر اثر نہ ہو تو مکرر مجھ سے درخواست نہ کی جائے۔ کیونکہ میں عامل نہیں ہوں کہ اگر ایک تعویذ سے نفع نہ ہُوا تو دوسرا لکھ دُوں گا۔"

مگر یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت نے جب بھی کچھ لکھ کر دیا۔ اس کا فوری اَثر ہُوا چنانچہ مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے فلسفی نے بھی اپنی کتاب "حکیم الاُمّتؒ" میں اس کا بڑی حیرت کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ بایں ہمہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:-

"مجھے دو صفحہ کا مضمون لکھنا اتنا گراں نہیں گزرتا۔ جتنا دو سطروں کا تعویذ لکھنا۔"

مواقع انکار

غیر مباح کاموں کے لیے آپ قطعاً تعویذ نہیں دیتے تھے۔ بلکہ جہاں کسی مفسدہ کا احتمال بھی ہوتا۔ وہاں آپ انکار فرما دیتے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک صاحب نے اپنی درخواست تعویذ میں لکھا کہ ایک نوجوان فاروقی النسل

اپنے تمام رشتہ داروں کی مرضی اور دستورِ خاندان کے خلاف تیموری نسل کی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے تمام رشتہ دار بجز اس کی والدہ کے اس پیوند سے ناراض ہیں۔ اس کا حضرت نے یہ جواب لکھا کہ :-

"اتنا قائل ہے کہ تفریق وہاں جائز ہے۔ جہاں اتفاق حرام ہو۔ کیا کسی عورت سے نکاح کرنا حرام ہے۔ جو تنافر کی تدبیر کی جائے۔ اگر اس جزو میں مجھ کو مطمئن کر دیا جائے۔ تو تعویذ لکھ دوں گا"

اسی طرح ایک صاحب نے اپنی تشویشات بیان کر کے کچھ پڑھنے کو پوچھا۔ تو فرمایا کہ تشویشات کا علاج پڑھنا نہیں بلکہ تدابیر اختیار کرنا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ کوئی تدبیر ہی بتا دیجئے۔ تو فرمایا کہ ہر تشویش کی تدبیر جدا ہے۔ جب کوئی خاص تشویش پیش آئے تو اس کے متعلق دریافت کیا جائے۔

اگر کوئی طالب حزب البحر یا دلائل الخیرات یا اس قسم کے بزرگوں کے دوسرے اوراد و احزاب پڑھنے کی اجازت طلب کرتا ہے تو آپ اس سے پہلے اس کی غرض دریافت فرماتے اگر وہ لکھتا کہ اسے دنیوی حاجات کے لیے بطورِ عمل کے معمول بنانا ہے تو صاف لکھ دیتے کہ میں عامل نہیں ہوں۔ اگر کوئی زیادہ ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے یہ لکھتا کہ مقصود قرب و رضائے حق ہے۔ تو تحریر فرماتے کہ ان دعاؤں سے پہلے قربِ حق کا کوئی طریقہ نہ تھا؟ اگر نہیں تھا۔ تو جن بزرگوں سے یہ دعائیں منقول ہیں۔ ان کو قربِ حق کس طرح حاصل ہوا؟ جو وہ اس قابل ہو گئے کہ ان پر یہ دعائیں الہام کی گئیں؟ لہٰذا تم بھی انھی کا طریقہ کیوں نہیں اختیار کرتے کہ ویسے ہی ہو جاؤ۔

غرضیکہ آپ حتی الوسع اس باب میں بھی اعتقادی غلو کی اصلاح فرمانے کی کوشش میں رہتے تاکہ آئندہ کے لیے اچھی طرح سبق مل جائے۔ اور لوگ

عملیات و تعویذات کے پیچھے نہ پڑے رہیں۔

قوّتِ متخیّلہ

آپ عملیات کے اثر کو زیادہ تر قوّتِ متخیّلہ کا اثر دیتے تھے۔ جن دنوں آپ کانپور میں پڑھاتے تھے۔ انہی دنوں وہاں طلسمی انگوٹھی اور روحوں کو بُلانے کا بہت چرچا تھا۔ جب آپ نے یہ واقعات سُنے تو آپ کو بہت حیرت ہوئی۔ اور خود یہ واقعہ دیکھنا چاہا چنانچہ اس واقعہ کے راوی کو کہا گیا کہ ان لوگوں کو یہاں بلا لاوے تاکہ ہم بھی مشاہدہ کر سکیں۔ چنانچہ جب یہ عمل کرنے والے آ گئے۔ تو آپ نے مدرسہ میں ان کے عمل کرانے کو خلافِ مصلحت سمجھا۔ اور ایک علیحٰدہ مقام میں اس عمل کو دیکھنا تجویز ہوُا۔ اس وقت تین عامل مدرسہ کے مہتمم۔ حضرت تھانوی اور ایک مدرس جو ایسی باتوں کے قطعاً قائل ہی تھے۔ موجود تھے۔ میز پر ان عاملوں نے عمل کیا۔ دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر اُنھوں نے میز پہ رکھّا اور ذرا ادھر توجّہ جو کی تو تھوڑی دیر بعد میز کا ایک پایہ خود بخود اُٹھا۔ اُنھوں نے کہا کہ لیجئے جناب روح آ گئی ہے۔ اُنھوں نے پوچھا کہ تمھارا کیا نام ہے۔ معلوم ہوُا کہ تجمل حسین ہے۔ کوئی آواز تو نہ تھی۔ البتہ کچھ اصطلاحیں مقرر تھیں۔ ان سے سوالات کے جواب معلوم ہو جاتے تھے۔ اب لوگوں نے مشہور اہلِ ہوئی کے لڑکے کی رُوح کو بلانا چاہا اور اس تجمّل حسین سے کہا کہ اس کی رُوح کو بُلا لاؤ۔ اور جب جانے لگو۔ تو فلاں پایہ کو اُٹھاتے جانا۔ اور جب واپس آنا تو واپسی کی اطّلاع فلاں پایہ کو اُٹھا کر دینا۔ چنانچہ فوراً پہلے وہ پایہ اُٹّھا۔ جس سے معلوم ہوُا کہ رُوح کو بلانے چلا گیا ہے تھوڑی دیر کے بعد دُوسرا پایا اُٹھا۔ جس سے معلوم ہوُا کہ اس شخص کی رُوح آ گئی ہے۔ اب ایسی ہی اصطلاحوں میں اس اہل ہوئی کے لڑکے سے سوالات کرنے

شروع کیے۔ پوچھا کہ تم نے جمہور کے مذہب کو حق پایا یا اپنے مذہب کو؟ جواب ملا کہ جمہور کے مذہب کو۔ پوچھا کہ تم اتّباعِ ہوی کی وجہ سے سزا بھگت رہے ہو یا سزا انہیں دی گئی۔ جواب ملا کہ سزا دی جا رہی ہے۔ میں عذاب میں مبتلا ہوں۔

حضرت تھانوی رح فرماتے ہیں کہ:۔

"ہم لوگ بڑی حیرت میں تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ان لوگوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ اب آپ جس شخص کی رُوح کو بُلوانا چاہیں۔ بلوالیں۔ ملّاں کی دوڑ مسجد تک۔ میں نے حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی رُوح کو بلایا۔ وہی تجمل حسین سب روحوں کو بُلا بُلا کر لاتا تھا۔ چنانچہ جب حضرت حافظ صاحب تشریف لائے تو میں نے السّلام علیکم کہا۔ اصطلاح میں جواب ملا کہ وعلیکم السّلام۔ جب حضرت مجلس میں یہ واقعہ بیان فرما رہے تھے۔ تو اس وقت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب نے حضرت سے سوال کیا کہ کیا حضور کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ حضرت حافظ صاحب کی رُوح ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ جی میں بالکل خالی الذہن تھا۔ نہ اعتقاد تھا اور نہ اس مشاہدہ کی تکذیب کی کوئی دلیل ذہن میں آتی تھی۔ حیرت میں تھا کہ یا اللہ کیا معاملہ ہے۔ سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آپ حضرت حافظ کا کلام پڑھیئے۔ ان کی رُوح خوش ہو گی۔ چنانچہ میں نے شروع کی غزل الا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا پڑھی۔ میز کا پایا بار بار اور جلدی جلدی اُٹھنے لگا۔ گویا حضرت حافظ صاحب کی رُوح وجد کر رہی ہے۔ ہم لوگ بڑے

متعجّب تھے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اتنے میں نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ ہم نماز پڑھنے کے لیے اُٹھے اور آپس میں گفتگو کی کہ آخر کیا معاملہ ہے۔ اخیر میں یہ رائے قرار پائی کہ یہ سب کرشمے قوّتِ خیالیہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ اب یہ کرنا چاہیئے کہ جب وہ عمل کرنے لگیں۔ تو ہم تینوں یہ خیال کر کے بیٹھ جائیں کہ پایہ نہ اُٹھے۔ مہتمم صاحب بولے کہ وہ لوگ مشّاق ہیں۔ ہم لوگوں کا خیال ان کے مقابلے میں کیا کام کر سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم ابھی سے ضعیف نہ بنو۔ نہیں تو کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ یہی سمجھنا چاہیئے کہ ان کے خیال کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ ہمارا خیال ضرور غالب آئے گا۔ امتحان تو کرنا چاہیئے۔

چنانچہ ہم لوگ یہ مشورہ کر کے بعد نماز مغرب پھر پہنچے۔ اور ان سے کہا کہ اب کی مرتبہ پھر وہ عمل دکھلاؤ۔ اُنھوں نے پھر عمل کرنا شروع کیا۔ ادھر ہم تینوں یہ خیال جما کر بیٹھ گئے کہ پایہ نہ اُٹھے۔ اُنھوں نے بہتیرا زور لگایا۔ مگر پایہ نہ اُٹھا جس پر وہ بڑے شرمندہ ہوئے اب تو ہماری بڑی ہمّت بندھی۔ اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ یہ سب قوّتِ خیالیہ کے ہی کرشمے ہیں اس پر میں اُٹھ کر چلا آیا"۔

دوسرے روز حضرت نے اُن ہمراہیوں کی مدد سے خود اس کا تجربہ کیا اور کامیاب رہے اور اس طرح اس عمل کی ساری حقیقت کھُل گئی (حضرت کے اس تجربہ اور دُوسرے تجربات کا مفصل حال "حسن العزیز" جلد اوّل کے ملفوظ نمبر ۱۲۵ میں مفصل درج ہے۔ جسے شوق ہو وہ وہاں سے دیکھ لے) حضرت نے فرمایا کہ قوّتِ متخیلہ ایسی چیز ہے کہ اگر اس سے کام لیا

جائے۔ تو بہت سے واقعات صحیح نکل آتے ہیں۔ جس کی تائید میں حضرت نے بعض واقعات بھی بیان فرمائے۔ جو اسی ملفوظ کے اندر موجود ہیں۔

تصرّفات

اسی سلسلہ میں آپ نے ایک استفسار پر فرمایا کہ :۔

"سالکین کو جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی بعض اُمُور قوّتِ خیالیہ کے تصرّف سے ہوتے ہیں مثلاً سلب مرض یا کشف قبور وغیرہ یا بعضے انوار و اصوات وغیرہ گو کتاب ضیاء القلوب میں بحیثیتِ فن بعض تصرفات کی ترکیبیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن انھیں بہت ناپسند فرماتے تھے۔ کیونکہ ان میں ایک صورت دعویٰ کی سی ہوتی ہے۔ نیز عوام کو ان کی باکمال ہونے کا ایہام ہوتا ہے۔ پھر اہلِ باطل کے لوگ معتقد ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لیے بزرگی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ فاسق فاجر یہاں تک کہ کفار جوگی بھی مشق سے یہ قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان میں بڑا فتنہ ہے۔ پھر تصرّفات شانِ عبدیت کے بھی خلاف ہیں۔ ان تصرفات کے وقت حق تعالیٰ کی طرف اتنی توجّہ نہیں رہتی جس قدر غیر حق کی طرف ہوتی ہے اور وہ بھی قصداً مجھ کو تو اس سے بڑی غیرت آتی ہے۔ اس لیے توجّہ متعارف یا تصوّرِ شیخ سے مجھ کو بہت ہی انقباض ہے۔ یہ وجدان کی بات ہے۔ گو میں اس کو جائز سمجھتا ہوں۔ لیکن ذوقاً نفرت ہے جیسے اُوجھڑی کھانا گو جائز ہے۔ لیکن بعض طبیعتیں اس کو قبول نہیں کرتیں۔" (ملفوظ نمبر ۱۲۸ احسن العزیز جلد ۱)

توجّہ مُتَعَارِف

فرمایا کہ :-

"توجّہ مُتَعَارِف اور تصورِ شیخ میں بھی ایک غیرت پیدا ہوتی ہے کہ جو توجّہ تام کہ حق تعالیٰ کا حق ہے۔ دوسری طرف اس کو مُنصرِف کرنا نہایت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ گو ہر وقت توجّہ الی الحق کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ لیکن قصداً تو دوسری طرف ایسی توجّہ اچھی نہیں لگتی۔ جو خاص حق تعالیٰ کا حق ہے۔"

ایک اور موقعہ پر یوں فرمایا کہ :-

"توجُّہ کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ تو غیر اختیاری ہے وہ یہ کہ دل چاہتا ہے کہ فلاں شخص میں ذوق و شوق۔ محبتِ حق۔ خوفِ خدا وغیرہ پیدا ہو جائے اس کے واسطے دعا کر دے۔ تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ دوسرا درجہ توجّہ کا متعارف مصطلحہ ہے وہ یہ کہ شیخ اپنے قلب کو سب خطرات سے خالی کر کے خاص توجّہ کرتا ہے۔ اس میں تصوُّر بقصدِ تصرُّف ہوتا ہے۔ یہ گو جائز ہے مگر ذوقاً پسند نہیں۔ اس میں فاعل قوتِ برقیہ ہوتی ہے جو انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے۔ جیسا کہ زمین میں بھی یہ قوت بہت ہے سنا ہے بے تار برقی کے جو خبر پہنچتی ہے وہ بھی اس کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے۔ نظر لگنے میں بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ مسمریزم و توجّہ متعارِف کا منشاء و ماخذ ایک ہے۔ ایک بُری جگہ صرف ہوتا ہے اور ایک اچھّی جگہ صرف کی جاتی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے اور یہ مشق پر موقوف ہے اس لیے مشق کی جاتی ہے کہ دوسروں

پر نسبت کا انفاء کریں گے۔ بعض مشائخ کے ہاں اس سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ مگر اس کا نفع باقی نہیں رہتا۔ طالب کیفیت کو نفع سمجھ کر اس کو کافی جانتا ہے۔ اس لیے کام چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں چند خلجان ہیں اوّل تو سنت میں منقول نہیں۔ دوسرے اس سے اکثر کو کام میں سستی ہونے لگتی ہے۔ بس مسنون طریقہ اصلاح کا وعظ۔ نصیحت۔ دُعا ہے اور توجہ تام حق تعالیٰ کا حق ہے۔" (کمالاتِ اشرفیہ ص۱۶۶)

مکاتبت

خدمتِ خلق

خدمتِ خلق بڑی چیز ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑی عبادت ہے۔ دوسروں کی راحت کے لیے خود تکلیفیں برداشت کرنا آسان نہیں۔ ہر دور میں ملک کے اندر بڑے بڑے عظیم الشّان ادارے سرگرمِ عمل رہے ہیں۔ مگر خدمتِ خلق کا شعبہ صحیح معنوں میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ حضرت تھانوی نے اپنی تمام زندگی خدمتِ خلق کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ مگر اس معاملہ میں اتنی احتیاط اور اتنا خیال ضرور رکھتے تھے کہ دوسروں کی خدمت کرتے کرتے کہیں اپنے حقوق جان کا نقصان یا حق تلفی نہ ہو۔ اس کے ساتھ اس بات کا بھی اہتمام رکھتے تھے کہ تمام تر توجہ ایک ہی طرف نہ لگی رہے۔ بلکہ سب کاموں کے لیے تھوڑا تھوڑا وقت نکالتے تھے۔ تاکہ کوئی کام اَدھُورا

نہ رہ جائے۔ اس لیے آپ فرمایا کرتے تھے کہ :-

"اگر کوئی عمر بھر بھی مجھ سے خدمت لیتا رہے۔ تو میں نہایت خوشی کے ساتھ حاضر ہوں۔ کیونکہ میرا تو کام ہی یہی ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت کروں۔ جتنی بھی ہو سکے اور جیسی بھی ہو سکے۔ بشرطیکہ طریقہ سے خدمت لی جائے۔ اور صرف وہی کام مجھ سے لیا جائے۔ جو میرے کرنے کا ہو۔ اور جو خود کر سکیں اس کو خود کیا جائے۔ سارا بوجھ مجھ پر نہ ڈالا جائے۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے سب کے کام ہو جائیں کیونکہ سبھی کا حق ہے۔ اگر میں ایک ہی کام کو لے بیٹھوں۔ تو دوسروں کے کام یوں ہی پڑے رہیں گے۔"

شرائطِ مکاتبت

اس لیے آپ نے خط و کتابت کرنے والوں کے لیے اپنے تجربہ کی بناء پر چند اصول مقرر کر رکھے تھے۔ تاکہ سب کا کام حصہ رسدی کا چلا جائے اور اگر آپ کے ہاں یہ اصول و قاعدے مقرر نہ ہوتے تو آپ کبھی بھی روزانہ اوسطاً چالیس پچاس خطوط کے جواب نہ دے سکتے۔ اور نہ ہی دوسرے ضروری اُمور کی طرف توجّہ فرما سکتے۔ آپ نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ :-

۱۔ ایک خط میں مختلف النّوع مضامین نہ لکھے جائیں۔ یعنی مسائل فقیہہ اور احوال و مسائل سلوک کا ایک ہی خط میں جمع کرنا آپ کو گوارا نہ تھا۔ ایک تو مختلف مضامین کے جواب دینے میں خلجان ہوتا ہے۔ دوسرے یہ اندازہ کبھی نہ ہو سکتا تھا کہ اصل مقصود کس مضمون کا جواب حاصل کرنا ہے۔ بعض

لوگوں نے اس سلسلہ میں بوجہ ناداری استثنیٰ کی درخواست کی کہ بار بار خط بھیجنے کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں تو حضرت نے اِنھیں لکھا کہ :-

"اوّل تو مواقع استثناء کو میں یاد کیسے رکھ سکتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جب مستثنیٰ کرنا شروع کر دیا۔ تو وہ قاعدہ قاعدہ ہی کب رہے گا۔ اور جس ضرورت و مصلحت سے وہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے وہ کب پوری ہوگی۔ اس لیے یہ تو گوارا نہیں۔ لیکن اگر ناداری ہے۔ تو اس غرض خاص کے لیے چندہ جمع کیا جائے اور اس میں بھی خوشی کے ساتھ شریک ہوں گا۔"

چنانچہ حضرت تھانوی نے اس بارہ میں اصول تو نہ توڑا۔ مگر ایسے لوگوں کی اس سلسلہ میں برابر مالی اعانت فرماتے رہے۔ تاکہ بوجہ ناداری وہ محروم نہ رہیں۔

۲۔ خط عبارت کے تصنّع و تکلّف سے پاک ہو۔ کیونکہ اس طرح تلبیس کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ اور مکاتب کے مافی الضمیر کا اندازہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ مزید براں ایسے خطوط سے زیادہ تر مقصود محض اظہارِ لیاقت ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض حضرات بلا ضرورت آپ کو عربی میں خط لکھ دیتے تھے۔ تو آپ جواب عربی میں لکھنے کی بجائے اُردو میں ہی یہ تحریر فرما دیتے کہ :-

"مَیں تو بے تکلّف عربی عبارت لکھنے پر قادر نہیں۔ اور آپ ماشاء اللہ قادر ہیں اس لیے آپ مجھ سے اکمل ہوئے۔ لہذا اکمل کو ناقص سے رجوع نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ کسی کامل سے رجوع کیجئے۔"

اس طرح ایک دوسرے عربی خط کے جواب میں لکھا کہ :-

"افادہ کی شرط مفید کا مستفید سے اکمل ہونا ہے۔ آپ عربی

لکھتے ہیں گو غلط لکھتے ہیں۔ میں غلط بھی نہیں لکھتا۔ پس آپ اکمل ٹھہرے اور شرط مفقود ہوئی۔ اس لیے مشروط بھی مفقود ہوا"۔

البتہ عربی ممالک سے جو خطوط عربی میں آتے تھے۔ ان کا جواب آپ عربی میں ہی دیتے تھے کیونکہ وہ ان کی مادری زبان تھی۔ وہاں تصنّع و تکلّف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

۳۔ طالبین خطوط میں اشعار نہ لکھیں۔ کیونکہ آپ اپنے بڑے کے سامنے اشعار پڑھنا یا اس کو اشعار لکھنا خلافِ تہذیب و ادب سمجھتے تھے۔ لیکن مغلوب الحال یا ہم عصر و ہم مکتب و ہم مشرب حضرات کے لیے یہ پابندی نہ تھی۔

۴۔ زیادہ تعظیمی الفاظ بھی لکھے جائیں۔ کہ یہ بھی تکلّف میں داخل ہے۔ ایک مرتبہ ایک ذی وجاہت وکیل نے لکھا کہ میں تو حضرت والا کے دربار کا ادنیٰ غلام ہوں۔ آپ نے اُسے اس لطیف و جامع جواب میں آئندہ کے لیے ایسا نہ لکھنے کی تنبیہہ فرمائی کہ:۔
"ایسے الفاظ سے اگر مجھ میں کبر ہوا۔ تو میرا مرض بڑھتا ہے۔ اور اگر تواضع ہوئی۔ تو تنگی ہوتی ہے۔ ہر حال اس میں ضرر ہی ہے۔ بدنی یا نفسانی"۔

اسی وکیل صاحب کے خط میں دوسرا فقرہ یہ تھا کہ افسوس میرا پہلا خط جو میں نے بڑے شوق سے لکھا تھا گم ہو گیا اور آپ کو نہیں ملا۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ اس پر یہ تنبیہہ تحریر فرمائی کہ:۔

"مجھ کو مسلمان کے منہ سے بدقسمتی کا اقرار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مسلمان تو بدقسمت ہوتا ہی نہیں۔ مثلاً اس واقعہ میں آپ کا خط گم ہوا۔ آپ کو قلق ہوا۔ اور اس پر آپ کو اجر ملا۔ تو یہ خوش قسمتی ہوئی یا بدقسمتی۔ البتہ جو معاصی اختیاریہ ہیں۔ ان کو خسارہ سے تعبیر کر سکتے ہیں"۔

انہی وکیل صاحب نے یہ بھی لکھا کہ حضوری میں جناب عالی سے مرعوب ہوں اور غائبی میں کتابت سے قلم ترساں۔ اس پر آپ نے لکھا کہ :-

"ان خیالات کو دل میں نہ آنے دیجئے۔ بلا رعایت کسی خاص حیز قاعدہ وضابطہ کے بے تکلف جو دل میں آئے لکھئے۔ بس اتنا خیال رہے کہ ایک تو واقعہ صاف لکھا جائے تکلف یا عبارت آرائی نہ ہو۔ دوسرے بلا ضرورت طول نہ ہو۔ تیسرے ایک خط میں متعدد مضامین نہ ہوں۔ لیکن اگر ان میں ارتباط ہو۔ تو وہ ایک ہی مضمون شمار ہوگا"

انگریزی روشنائی والے خطوط بھی آپ پسند نہ فرماتے تھے۔ کیونکہ ان میں سپرٹ کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی ایسا خط نماز کے وقت جیب میں ہوتا۔ تو آپ نکال کر الگ رکھ لیتے تھے۔ مزید براں گیلے ہاتھ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پر اس کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور پسینہ کی صورت میں جیب میں ایسے خط ہونے سے کپڑے داغدار ہو جاتے ہیں۔

حُصُولِ جواب

جوابِ خط کے لیے لازمی تھا کہ جوابی خط بھیجا جائے۔ خود حضرت تھانوی اگر اپنے کسی جاں نثار کو بھی خط لکھتے تو جواب طلب اُمُور کے لیے جوابی خط میں لکھتے اور فرماتے جب میری ہی غرض ہے۔ تو ان پر خواہ مخواہ کیوں محصول ڈاک کا بار ڈالا جائے۔ اسی طرح جو طالب اپنے سوال کے ساتھ جواب کے لیے لفافہ ہمراہ نہ بھیجتا۔ اسے جواب نہ دیتے۔

یہ بھی لازمی تھا کہ جوابی لفافہ پر اپنا نام و پورا پتہ صاف لکھا ہُوا ہو۔ بغیر پتہ لکھے جواب کے لیے لفافہ ڈالنے میں یہ قباحت ہوتی کہ بسا اوقات جواب دینے والے کا پتہ معلوم نہ ہوتا یا اس وقت بھُولا ہُوا ہوتا۔ یا جو

پتہ یاد ہوتا۔ وہ بدل چکا ہوتا ہے۔ یا نقل کرتے وقت غلطی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے جواب دیر سے پہنچتا ہے یا بالکل ہی نہیں پہنچتا۔

اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ جواب کے لیئے ٹکٹ نہ بھیجے جائیں۔ کیونکہ وہ بھی موجبِ اذیّت ہوتے ہیں۔ بسا اوقات لفافہ کھولتے وقت گِر جاتے تھے۔ بسا اوقات کثرتِ مشاغل اور ہجوم خطوط کی وجہ سے یاد نہیں رہتا تھا کہ اس خط کے جواب کے ٹکٹ کہاں رکھے تھے۔ اور اگر کوئی ٹکٹ گِر پڑتا اور بعد میں مِل جاتا۔ تو سب خطوط کی پڑتال کرنی پڑتی کہ یہ کس لفافہ کا ٹکٹ ہوگا۔ اگر پھر بھی پتہ نہ چلتا۔ تو کچھ عرصہ امانت رکھ کر پھر مصارفِ خیر میں صرف کر دیا جاتا اس طرح نہ صرف وقت ضائع ہوتا بلکہ پریشانی بھی اُٹھانی پڑتی۔

رسید طلبی

اگر کوئی خط بذریعہ "رجسٹری بہ واپسی رسید" بھیجتا۔ اور قرائن سے معلوم ہو جاتا کہ یہ کسی جھگڑے کا معاملہ ہے۔ جس کی وجہ سے بھیجنے والا رسید طلب کرتا ہے تاکہ مرسل الیہ خط پانے سے انکار نہ کرسکے۔ تو واپس کر دیتے اور فرماتے کہ رسید تو وہاں طلب کی جاتی ہے۔ جہاں یہ احتمال ہو کہ مرسل الیہ خط پانے سے انکار کر دے گا۔ جس کا حاصل یہ ہُوا کہ مُرسل کو مُرسل الیہ کے کاذب ہونے کا احتمال ہے۔ جو بلا دلیل شرعی معصیت ہے نیز اس سے مرسل کا مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مقصود تو یہ ہے کہ مرسل الیہ اس کے خاص مضمون پہنچنے کا انکار نہ کرسکے۔ لیکن رسید صرف اس بات کو ظاہر کرے گی کہ کوئی خط پہنچا مگر اس کو ظاہر نہیں کرسکتی کہ کس مضمون کا خط پہنچا۔ لہٰذا ہر حال میں رسید طلب کرنا ایک فضول حرکت ہے۔ رہی حفاظت۔ وہ غیر جوابی رجسٹری سے بھی ہوسکتی ہے۔

ویسے جہاں مذکورالصدر شبہ نہ ہوتا وہاں جوابی رجسٹری بھی وصول کر لیتے۔ مگر جوابی رجسٹری بھیجنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔

منی آرڈر

منی آرڈر کے کوپن پر اگر کوئی مضمون تحریر نہ ہوتا۔ یا مبہم مضمون ہوتا۔ جس سے بھیجی ہوئی رقم کا مصرف یا کوئی اور ضروری جزو صاف طور پر واضح نہ ہوتا۔ تو اس پر سبب لکھ کر واپس فرما دیتے۔ اگر کوپن پر صرف اتنا لکھا ہوتا کہ اس رقم کے متعلق الگ خط لکھا گیا ہے تب بھی اُسے وصول نہ فرماتے۔ کیونکہ اگر خط کے انتظار میں رقم وصول کر لیتے اور پھر خط کے مضمون سے وہ رقم قابل واپسی سمجھتے۔ تو اسے واپسی رکھتے اور پھر واپسی بھیجنے میں بڑی دقت ہوتی۔

بیمہ یا رجسٹری

اس طرح اگر کوئی رقم بذریعہ بیمہ یا رجسٹری بھیجتا اور اس کی تفصیل سے پہلے آگاہ نہ کرتا۔ تو بجز اطمینان کے مواقع کے اس کو بھی واپس فرما دیتے۔ کیونکہ یہ امر ظاہر یا واضح نہ ہوتا۔ کہ وہ رقم قابلِ وصولی ہے یا نہ۔

چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ منی آرڈر یا بیمہ کے ذریعہ آئی ہوئی رقم جو واپس جاتی اور پھر اس کے مرسل کی طرف سے وضاحتی خط آتا تو اس کا کوئی نہ کوئی جزو ضرور ایسا نکلتا جو ناقابلِ قبول ہوتا۔ جس کی مثال بابِ اخلاق میں بضمن استغنا گزر چکی ہے جو بڑے بڑے بیمے یا منی آرڈر خلافِ اصول ہونے کی وجہ سے واپس بھیج دیے جاتے۔ اور وہ رقوم اصول کے مطابق مکرر موصول ہوئیں۔ تو اس وقت حضرت فرمایا کرتے کہ دیکھیے جو آنے والی چیز ہوتی ہے وہ آکر ہی رہتی ہے چاہے اس کو واپس کیا جائے۔ پھر کیوں نیّت خراب کی جائے اور خلافِ اُصُول کا ارتکاب کیا جائے۔

جوابِ رسائل

آپ فرماتے تھے کہ :۔

"لوگ بڑے بڑے رسالے بھیج دیتے ہیں کہ ان کا جواب لکھو۔ میں یہ بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ سب کا یکجائی جواب لکھوں وہاں آپ یہ کریں کہ پہلے ایسے مقامات منتخب کرلیں جو آپ کے نزدیک محتاجِ جواب ہوں۔ پھر اُن مقامات میں سے ایک خط میں صرف ایک مقام میرے پاس بھیج دیا کریں۔ جب اس کا جواب پہنچ جائے اور وہ طے ہو جائے۔ خواہ ایک ہی خط میں یا متعدد خطوط میں۔ تو پھر اسی طرح دُوسرا مقام بھیج کر اس کا جواب حاصل کرلیں۔ اِسی طرح برابر مجھ سے خدمت لیتے جائیں۔ اور جب سب مقامات کا جواب ہو جائے تو اس کو جمع کر کے شائع کر دیں"

اِس سلسلہ میں آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ :۔

"لوگوں کو دوسرے پر بوجھ ڈال دینا تو آسان ہے۔ لیکن جب خود ان کو کچھ کام کرنے کو کہا جاتا ہے۔ تو پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو مذکورہ بالا طریقہ بتلایا۔ لیکن چونکہ اس میں خود بھی ان کو کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے بیٹھ رہے۔ البتہ ایک صاحب نے اس اطلاع کے بعد ایک رسالہ کا صرف ایک مقام حل کرایا۔ پھر وہ بھی بیٹھ رہے۔ اُنھوں نے فرقہ بہائیہ کے شبہات کے جوابات چاہے تھے۔ اُن کو میں نے یہی لکھ دیا کہ ایک ایک شبہ

پیش کیا۔ اور اس کو اپنی طرف منسوب کیا جاوے۔ نہ کہ کسی دوسرے کی طرف سے۔ کیونکہ میں غائب سے کیسے خطاب کر سکتا ہوں۔

چنانچہ انھوں نے ایک بار شبہ لکھ کر بھیجا۔ میں نے اس کا جواب لکھ دیا۔ اور میں اپنی طرف سے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اور اس کے جوابات کو جداگانہ نقل بھی کرا لیا (کیونکہ جو جواب یا مضمون باہر جاتا تھا۔ اس کی نقل رکھ لی جاتی تھی) تاکہ آئندہ کے لیے جوابات کو مسلسل نقل کراتا ہوں۔ لیکن ان کا بھی بس ایک ہی خط آ کر رہ گیا۔ اور اتنا التزام بھی ان سے نہ نبھ سکا۔"

تحفّظِ حقوق

حقوق العباد

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ:-

"عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حق العبد میں محض بندہ ہی کا حق ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کا حق نہیں ہوتا۔ یہ غلط ہے کیونکہ بندہ کا وہ حق اللہ تعالیٰ ہی نے تو مقرر فرمایا ہے۔ مثلاً حکم دیا ہے کہ مظلوم کی امداد کرو۔ کسی مسلمان کی غیبت نہ کرو۔ کسی کو ایذا نہ دو۔ تو جب ان احکام کے خلاف کسی کو ایذا دی

جاوے گی۔ تو جیسے بندہ کا حق فوت کیا۔ ویسے ہی حق تعالیٰ کا بھی حق فوت کیا کہ ان کے حکم کی مخالفت کی۔ اس لیے حقوق العباد میں بندہ کی معافی کے بعد اکثر حق تعالیٰ اپنا حق بھی معاف کر دیتے ہیں۔ مگر بعض اوقات محبوبانِ خاص کی حق تلفی میں ان کی معافی کے بعد بھی حق تعالیٰ اپنا حق معاف نہیں فرماتے۔ بلکہ مواخذہ ضرور ہوتا ہے"۔

(کمالاتِ اشرفیہ ص۱۶)

یہ اسی تحقیقِ لطیف کا نتیجہ تھا کہ حضرت تھانوی کو تحفظ حقوق کا غایت درجہ اہتمام تھا۔ اور معاملات میں ہمیشہ احکام شرعیہ اور جزعیات فقیہہ غامضہ دقیقہ کو ہر وقت پیش نظر رکھتے تھے اور مالی معاملات میں احتیاط انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ جو سب کے نزدیک واجب العمل ہونے کے باوجود قابل اعتنا نہیں۔

پابندیِ شریعت

ایک مرتبہ ایک صاحب نے ایک معتد بہ رقم مصارف خیر کے سلسلہ میں حضرت تھانوی کی خدمت میں روانہ کی اور لکھا کہ :-

"میں بہت بیمار ہوں یہاں تک کہ صحت سے مایوسی ہے"

مگر اس میں وصیت کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اس لیے حضرت تھانوی نے مصارفِ خیر کے لیے بھی رقم کی وصولی کو حد شرعی کے اندر لانے کے لیے ان کو شرعی وصیت کا ایک مضمون لکھ کر روانہ کیا۔ کہ وہ اس پر دستخط کر کے واپس بھیج دیں۔ تاکہ وصیت شرعاً بھی ہو جائے۔ چونکہ اُنھوں نے وہ رقم بہ نیت وصیت ہی بھیجی تھی۔ اس لیے اُنھوں نے بلا تامل اس مضمون پر دستخط کر کے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا۔ ورنہ حضرت اس بات کا تہیہ کر چکے تھے۔ کہ اگر اس پر دستخط نہ ہوئے تو یہ رقم واپس کر دی جائے گی۔

حُجّتِ شرعی

اسی طرح جب حضرت کے ایک نہایت ہی مُخلص اور متمول خادم مجاز حاجی محمد یوسف رنگونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا انتقال ہوا۔ تو ان کے ورثاء نے ایک کثیر رقم حضرت کی خدمت میں اس وصیّت کی بناء پر روانہ کی۔ جو مرحوم نے حضرت کے نام تحریر فرمادی تھی۔ لیکن حضرت نے تحریر فرمایا کہ:-

"چونکہ مرحوم کے بعض ورثاء نابالغ ہیں۔ اس لیے اگر یہ وصیّت کسی شرعی حجّت سے ثابت ہو۔ تب وہ نابالغ ورثاء کے مقابلہ میں شرعاً نافذ ہوسکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ لہٰذا وہاں کے علماء کے سامنے شرعی حجّت پیش کرکے اور ان پر یہ بھی ظاہر کرکے کہ وہ وصیّت نامہ کس کس کے پاس رہا اور کہاں کہاں رہا ان سے باقاعدہ فتویٰ حاصل کیا جائے اور پھر وہ فتویٰ میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر میرے نزدیک بھی وہ حجّت شرعاً کافی ہوگی۔ تو وصیّت کردہ رقم بخوشی قبول کرلوں گا۔ ورنہ عُذر کردوں گا۔"

چنانچہ وہاں سے باقاعدہ فتویٰ مکمّل حجّتِ شرعی کے ساتھ جب آیا۔ اور حضرت کو بھی اس پر پورا پورا اطمینان ہوگیا۔ تب وہ رقم قبول ہوئی۔

کمالِ احتیاط

وصیّت کردہ رقم کے علاوہ حاجی صاحب مرحوم نے ایک کثیر رقم ایک خاص مَصرفِ خیر کے لیے حضرت کے پاس امانت رکھی ہوئی تھی۔ جو حضرت نے ان کی ہدایات کے مطابق صرف فرمائی تھی۔ چونکہ اس کے مَصرف میں لانے سے قبل ہی صاحب خیرات انتقال فرما چکے تھے۔ اس لیے اب ان کا اس رقم پر کوئی حقِ شرعی باقی

نہ رہا تھا۔ بلکہ یہ رقم اب ورثاء کا ترکہ ہو چکی تھی۔ اس لیے حضرت نے وہ رقم ان کے ورثاء کو واپس بھیج دی اور اس رقم کی واپسی کی نسبت پہلے دریافت کرنا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ مبادا وہ ازراہ مروّت واپس کرنے کی ممانعت کر دیں۔ برخلاف اس کے اب ان کو آزادی تھی۔ کہ اَب جو چاہیں اس کے متعلق رائے قائم کریں۔ چونکہ ان کے ورثاء بھی ماشاء اللہ دین دار تھے۔ اس لیے اُنھوں نے بھی یہ کہا کہ اس رقم کو بالغ ورثاء نے اپنے حقہ میں لگا کر اور نابالغوں کے حصّہ کا عوض ان کو اپنے پاس دے کر واپس بھیج دیا کہ اُسی مصرف خیر میں بدستور صرف کی جاوے۔ چونکہ اب کوئی عذر شرعی باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے حضرت نے وہ رقم بخوشی قبول کر کے اس مَصرِف خیر میں صرف فرما دی۔

بے نظیر مثال

حضرت کے خلیفہ حکیم نور احمد صاحب کانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مرض الموت میں اپنے تین مکان بذریعہ تحریری وصیّت حضرت کے نام تملیک کر کے اس کی باضابطہ رجسٹری کرا دی۔ حضرت تھانوی چونکہ ان ایّام میں تھانہ بھون رہتے تھے۔ اس لیے ان کو اس واقعہ کا کوئی علم نہ تھا۔ اور نہ وہ بوجہ بُعدِ مسافت اور تنگیٔ وقت حضرت کو اس اَمر سے آگاہ کر سکے۔ جب حضرت کو کانپور جانے کا اِتّفاق ہُوا تو وہاں پہنچ کر یہ واقعہ بھی معلوم ہُوا۔ چونکہ حقوق العباد کا معاملہ تھا۔ اس لیے حضرت نے بڑے اہتمام سے مرحوم کے ورثاء کی نسبت تحقیق کی۔ تو معلوم ہوا کہ اُنھوں نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ البتہ یہ سُنا کہ ان کے کوئی عزیز تھے۔ جو مفقود الخبر ہیں۔

علّتِ تملیک پر جب حضرت نے غور فرمایا تو وہ ذوقاً اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر مرحوم کو گنجائش ملتی تو وہ کسی وارث کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ رقم مصارفِ خیر میں ہی وقف کرتے۔ لیکن چونکہ ان کو کوئی قابلِ اعتماد آدمی

نہ بلا۔ اس لیے ان کو خیال ہُوا کہ میرے نام وصیّت لکھ دیں۔ کہ وہ ان مکانات کی آمدنی مَصَارِفِ خیر میں صرف کریں گے۔ حالانکہ اس اَمر کی تائید میں وصیّت نامہ میں ایک حرف بھی موجود نہ تھا بلکہ اُنھوں نے وہ مکان مطلق تملیک کیے تھے جنھیں اپنے مصرف میں لے لینے میں کوئی اَمر مانع نہ تھا۔ مگر حضرت کے تقویٰ و استغناء سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ اور آپ نے غایت احتیاط کی بناء پر وہ تینوں مکان اپنی ملک میں رکھنے کی بجائے اس شرط کے ساتھ یتیم خانہ کانپور کے نام وقف کر کے رجسٹری کرا دیئے کہ:۔

"مرحوم کے کسی شرعی وارث کی مجھ کو تحقیق نہیں ہوئی۔ سو اگر واقع میں ایسا ہی ہے تب تو یہ مکانات کل وقف ہیں اور اگر کوئی شرعی وارث حجتِ شرعیّہ کے موافق ثابت ہو جائے۔ تو اگر وہ اس وقف کو جائز رکھے (اور شرعاً جائز رکھنے کی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے) تب بھی کل وقف ہے۔ اور اگر وہ جائز نہ رکھے یا اس کا جائز رکھنا کسی عارض کے سبب جائز نہ ہو۔ تو مجموعہ مکانات کا ایک ثلث وقف ہے۔ اور دو ثلث اس وارث کو واپس کیا جائے۔ اور اگر وقف مذکور کی آمدنی میں اس وقت اس قدر رقم موجود نہ ہو۔ تو اس دو ثلث کی آمدنی کی بقیہ ایک ثلث کی آمدنی سے اوّل پورا کیا جاوے۔ اس کے بعد مصارف یتیم خانہ میں صرف کیا جائے۔"

اعلان عام

آپ نے صرف یہ وقف نامہ رجسٹری کرا دینے اور وارث کے حقوق کا بندوبست کر دینے کا ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اس امر کے متعلق مفصّل اعلان رسالہ

"تنبیہاتِ وصیّت" کے ضمیمہ خامسہ تتمہ سابقہ کے مضمون رابع میں بھی شائع فرمایا۔ تاکہ:۔

الف۔ کسی طرح مرحوم کے مفقود الخبر عزیز کو اس بات کا علم ہو جائے۔ یا
ب۔ ممکن ہے ان کا کوئی اور شرعی وارث موجود ہو۔ تو وہ باخبر ہو جائے۔ نیز کہ
ج۔ میرا کوئی وارث رائج الوقت انگریزی قانون کی بناء پر اس کا دعویٰ نہ کر بیٹھے۔

اس سلسلہ میں مزید احتیاط و اہتمام یہ کیا کہ:۔

"اس وقف نامہ کی رجسٹری عدالت کانپور کا پورا پتہ لکھے دیتا ہوں تاکہ حق دار کو حاجت کے وقت اس کی نقل لینا سہل ہو جائے۔

جو یہ ہے:۔

"۲۱، مارچ ۱۹۲۳ء۔ بہی نمبر ۱۔ جلد ۵۰۱ صفحات ۲۹۷-۲۹۸-
دستاویز نمبر ۱۳۹۔ فقط"

اِستحقاقِ شرعی

اگر کسی رقم کے متعلق حضرت کو یہ علم ہو جاتا کہ اس کے وصول کرنے سے قبل بھیجنے والے کا انتقال ہو چکا ہے۔ تو اس کو بھی واپس فرما دیتے تھے۔ کیونکہ موہب کی ملک ہونے کے لیے محض روانگی رقم کافی نہیں۔ بلکہ قبضہ شرط ہے۔ اور یہاں چونکہ وہ رقم بھیجنے والے کے انتقال کے بعد وصول ہوئی۔ اور قبل انتقال یعنی اس وقت جب کہ وہ رقم مُعطی کی ملک تھی۔ حضرت کا قبضہ اس پر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے شرعاً وہ رقم وصول ہو جانے کے باوجود حضرت کی ملکیت نہ ہوتی تھی۔ بلکہ وارثوں کی ہی ملک رہتی تھی۔ اس لیے اسے واپس فرما دیتے تھے اور اگر بیمہ یا منی آرڈر پہنچنے کے قبل بھیجنے والے کے انتقال کی خبر مل جاتی تو اس کو وصول نہ فرماتے۔

اسی طرح اگر کسی رقم کے دوران صرف میں اس کے بھیجنے والے کے انتقال

کا علم ہو جاتا تو فوراً اس کا خرچ کرنا روک دیتے۔ اور بقیہ رقم کے متعلق خصوصیت کی محل پر تو اطلاع کر کے استفسار فرما لیتے تھے۔ جواب ہر پہلو سے اطمینان بخش ہوتا۔ تو اس پر عمل فرماتے۔ ورنہ بقیہ رقم واپس کر دیتے۔ اور بلا خصوصیت کے مواقع پر تو استفسار کیے بغیر ہی واپس کر دیتے۔

غرضیکہ جتنی احتیاط حضرت ایسے معاملہ میں فرماتے تھے اس کی مثال اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

حقِّ مساکین

حضرت کے ایماء پر خانقاہ تھانہ بھون میں روزانہ بعد عصر ختم خواجگان پڑھا جاتا تھا۔ جس میں خانقاہ میں رہنے والے مساکین بھی بعض شرائط مناسبہ پر شریک ہوتے تھے اور اس میں دعا مانگی جاتی تھی۔ جو صاحب اپنی دنیوی مباح حاجات کے لیے مُستدعی دُعا ہوتے تو اعانتِ مساکین کے لیے انھیں ایک آنہ یومیہ اس غرض کے لیے جمع کرانا پڑتا تھا کیونکہ عملیات اور رقی پر اُجرت لینا شرعًا جائز ہے۔ اور مساکین وظیفہ ختم ہونے کے بعد روزانہ ان کی مطلوبہ حاجت کے لیے ان کا نام لے لے کر دُعا کرتے تھے۔ اس طرح جو رقم وصول ہوتی۔ وہ سب شرکاء وظیفہ کو حصّہ رسدی تقسیم کر دی جاتی تھی۔

اگر کوئی بلا اُجرت دُعا کرانا چاہتا۔ تو سات دن تک اس کے لیے مُفت دُعا کی جاتی تھی۔ اور دینی اُمور کے لیے دُعا کرانے والوں سے کوئی رقم قبول نہ کی جاتی تھی۔ کیونکہ ایسی دُعا دین ہے اور باستثناء "مواقع مذکورہ فقہ" دین پہ اُجرت لینا جائز نہیں۔

اس طرح اگر کوئی مریض صحت کی دُعا کے لیے کوئی رقم بھیجتا اور اس رقم کے ختم ہونے سے قبل اس کا انتقال ہو جاتا۔ تو فوراً اس کی بقایا

رقم کی تقسیم بند کرا دیتے ہیں۔ اور بقیہ رقم اس کے ورثاء کو واپس بھیج دی جاتی تھی۔ اگر ورثاء یہ چاہتے کہ بقیہ رقم میں مرحوم کے لیے دُعائے مغفرت کی جائے تو انکار فرمادیا جاتا کیونکہ دُعا مغفرت پر اُجرت لینا جائز نہیں۔

اگر کوئی متمول شخص ایک آنہ یومیہ سے زائد بھیجنا چاہتا۔ تو زائد رقم قبول نہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک والی ملک نے اور ایک ولی عہد نے اس غرض کے لیے زائد رقم بھیجنی چاہی۔ مگر حضرت نے انکار فرمادیا۔ اور ایک آنہ یومیہ کے حساب سے ہی رقم وصول کی اور جب اوّل الذکر کو کامیابی نصیب ہوئی۔ تو انھوں نے مساکین کی دعوت و پارچات کے لیے ڈیڑھ سو روپیہ روانہ کیے۔ جو حضرت نے قبول کر کے مستحقین میں تقسیم کر دیئے۔

غرضیکہ ایسی احتیاط۔ صفائی معاملات اور حفظ حقوق کا اہتمام آپ کو کہیں بھی نظر نہ آئے گا۔

دیانت و شرافت

نظامِ قدرت

نظامِ قدرت تکوینًا اس بات کا متقاضی ہے کہ جب تک یہ نظام عالم قائم رہے۔ خیر و شر کی قوتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں۔ تاکہ اس معرکۂ حق و باطل میں لوگوں کی فہم و فراست اور علم و عمل کا امتحان ہوتا رہے کہ وہ اہلِ حق کے ساتھ صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں یا اہلِ باطل کی معیت میں راہِ ضلالت اختیار کرتے ہیں۔

اس ابتلاؤ و امتحان کے لیے نظامِ تکوینی کے تحت ہر زمانہ میں بالفاظِ قرآن شیاطین والانس کی جماعت بھیجی جاتی رہی۔ جس کا کام انبیاء علیہم السّلام پر اعتراضات کرنا اور لوگوں کو اُن کی پیروی سے روکنے کے لیے دھوکہ اور فریب دینا بتلایا گیا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (انعام ۱۴/۸)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان یعنی شریر آدمیوں اور جنوں کو پیدا کیا۔ جن میں سے بعض دوسروں کو طمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کے لیے سکھاتے ہیں۔

لازمی بات ہے کہ جب کوئی کسی پر ناحق تہمت لگاتا ہے۔ یا جھوٹ بولتا ہے تو اسے رنج ہوتا ہے اور اس رنج کی بناء پر غصّہ آتا ہے جس سے بعض اوقات بڑی بڑی خرابیاں۔ فتنے اور فساد رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے حق تعالیٰ نے متذکرہ بالا خبر کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ہدایت و تلقین فرمائی کہ شیاطین والجنّ والانس کی جماعت دانستہ پیدا کی گئی ہے ان کی باتوں کی طرف ہرگز التفات نہ کیا جائے۔ نہ اس سے مناظرہ و مباحثہ کیا جائے۔ بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے فریضہ کی طرف توجّہ دی جائے۔ کیونکہ ہدایت دینا میرا کام ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے کہ

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ۔

(اگر اللہ چاہتا تو ایسا نہ کر سکتے۔ سو ان لوگوں کو اور جو کچھ

یہ افترا پردازی کر رہے ہیں (ان کے حال پر) رہنے دیجئے۔
(انعام ۱۴/۸)

باب نبوت بند ہونے کے بعد یہ جماعت ورثۃ الانبیاء یعنی اولیاء،
علماء کے درپے آزار ہو گئی اور تا قیام قیامت اس طرح مصروفِ عمل
رہے گی۔

وہابی ایٹم

زمانہ ماسبق میں اس جماعت کے پاس علماء راسخین اور اتقیاء صالحین
کے خلاف استعمال کرنے کے لیے صرف ایک ہی ہتھیار "تیر تکفیر" تھا
جس کی مدد سے یہ اہل اللہ کی محبوبیت و مقبولیت گھٹانے کی کوشش کرتی
تھی۔ مگر یہ اہلِ حق کے لیے اس کی حسبِ خواہش ایٹم بم کی طرح تباہ کن ثابت
نہ ہوا تھا۔ فرقہ وہابیہ کے معرضِ وجود میں آنے سے اس جماعت کی بہت
سی مشکلات آسان ہو گئیں۔ اور اس نے اہلِ حق کو مٹانے اور اس کے اثر
رسوخ کو کم کرنے کے لیے وہابیت کا ایٹم بم چلانا شروع کر دیا۔ جس کی
"ہلاکت آفرینی" کا حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی "نقش حیات"
میں یوں اعتراف کرتے ہیں:۔

"عوام میں اس قدر نفرت نامِ وہابی سے پھیلائی گئی۔ کہ
شرک و کفر۔ عیسائیت و یہودیت ہندوئیت و بت پرستی
سے مسلم عوام کو اتنی نفرت نہیں ہوئی۔ جتنی کہ وہابیت
سے ہوئی مجھ کو بخوبی یاد ہے کہ غالباً ۱۹۲۵ء یا اسی کے
قریب زمانہ میں پنجاب کے اخباروں میں ایک واقعہ چھپا تھا
کہ کسی گاؤں کا امام وہاں کے ایک ہندو بنئے کا مقروض تھا۔

قرضہ بڑھ گیا تھا۔ بنئے نے تقاضا کیا۔ اور آئندہ قرض دینا بند کردیا۔ امام صاحب نے اس کو سمجھایا۔ مگر وہ بنیا نہ مانا۔ اور کہا کہ جب تک پہلا قرضہ ادا نہ کردو۔ میں تم کو کچھ قرض نہ دوں گا۔ امام صاحب دھمکی دے کر چلے گئے۔ اور مسجد میں بعد نماز جمعہ اعلان کردیا کہ فلاں بنیا وہابی ہو گیا ہے۔ اس سے کسی قسم کا معاملہ خرید و فروخت آمد و رفت جائز نہیں ہے۔ تمام باشندگانِ دیہہ نے بنیا کا بائیکاٹ کردیا۔ بنیا بیچارہ دن بھر دکان پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا۔ اور کوئی اس کی دکان پر نہ آتا تھا۔ اس نے بعض لوگوں سے پوچھا۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ امام صاحب فرماتے ہیں۔ کہ تو وہابی ہو گیا ہے۔ اس لیے ہم تم سے لین دین نہیں کرسکتے بالآخر اس بنئے نے جاکر امام صاحب سے صلح کرلی۔ تو امام صاحب نے اگلے جمعہ اعلان کردیا کہ بنئے نے وہابیت سے توبہ کرلی۔ اب لین دین جاری کردو۔ چنانچہ بازار کھل گیا۔ خیال کیجئے۔ کہ بنئے کا ہندو اور بت پرست مشرک ہونا تو لین میں خارج نہ تھا۔ مگر وہابی ہونا خارج ہو گیا۔"

(صہ ۱۲۴ و صہ ۱۲۵)

بریلوی حملہ

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اصلاحی جہاد سے چونکہ اربابِ بدعت کے ایوانِ اقتدار میں ایک زلزلہ سا آگیا تھا۔ اور ان کے حلقوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اس لیے بریلویوں کے اعلیٰحضرت مولوی احمد رضا خاں صاحب نے حضرت تھانوی کی روز افزوں محبوبیت و مقبولیت اور آپ کے تجدیدی

کارناموں کی اہمیت و افادیت کو مٹانے کے لیے یہ چال چلی کہ حضرت تھانویؒ
کے رسالہ "حفظ الایمان" کے دو فقروں اور آپ کے اکابر حضرت مولانا محمد قاسم
نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہم
اللہ تعالیٰ علیہم کی بعض تحریروں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اور ان کا حلیہ بگاڑ
کر ایک رسالہ "حسام الحرمین علی عنق اہل الکفر والمین" کے نام سے ان حضرات
کے خلاف مرتب کیا۔ اور لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے اور ان حضرات کے
خلاف نفرت پھیلانے کی غرض سے اولاً حضرات کو اس رسالہ میں وہابی ظاہر
کیا۔ اور بعدہٗ ان کی مسخ کردہ تحریروں کو پیش کر کے ان کے خلاف کفر کا
فتویٰ صادر کیا۔ اور بڑے دجل و فریب سے اس پر علمائے عرب کے دستخط
بھی حاصل کر لیے۔ علماء حرم چونکہ پہلے سے ہی وہابیوں کے زخم خوردہ تھے۔
اور ان حضرات کی اصل کتابوں سے جو اُردو میں تھیں اور جن کے حوالہ
جات اس رسالہ میں درج تھے۔ واقف نہ تھے۔ اس لیے وہ وہابیت کے
فریب میں جلد آ گئے اور رسالہ حسام الحرمین پر اصل کتب دیکھے بغیر محض
مولوی احمد رضا خاں صاحب کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے فتویٰ کفر
کی تصدیق کر کے اس پر دستخط ثبت کر دیے۔ علمائے حرم کو مولوی احمد رضا
خاں صاحب نے کس طرح فریب دیا۔ اس کی تفصیل حضرت مولانا حسین احمد
صاحب مدنی کے "نقش حیات" اور ان کے رسالہ "الشہاب الثاقب علی المسترق
الکاذب" یا حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ مہاجر مدنی کے رسالہ "المہند
علی المفند" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس فتویٰ کفر کے اجراء سے ملک کے سنجیدہ طبقہ کو بہت ہی صدمہ پہنچا۔
بعض مقامات پر فتنہ و فساد بھی ہوا۔ بعض حضرات یہ اُمید لگائے بیٹھے رہے
کہ اس کی تردید میں دربارِ اشرفیہ سے کوئی جلد اعلان شائع ہو گا مگر حضرت تھانویؒ
نے مذکورالصدر احکامِ قرآنی کے تحت اس جماعت کی افتراء پردازیوں کی

طرف قطعاً کوئی توجہ نہ دی۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ لوگ اس شر انگیزی کے لیے فطرتاً مجبور اور روزِ ازل سے مامور ہیں۔

میدان سے فرار

ایسے سنگین فتویٰ کے اجرا پر حضرت تھانوی کی خاموشی نے ایک طرف تو آپ کے مخالفین و معاندین کو زیادہ شر انگیزی کا موقع دیا۔ دوسری طرف نافہم لوگ یہ سمجھنے لگے کہ شاید یہ حضرات ان اعتراضات کا جواب دینے سے عاجز ہیں۔ اس پر حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ نے مولوی احمد رضا خاں کے اتہامات کا معقول جواب شائع کیا۔ جس کی تردید کی اس ساری جماعت کو آج تک ہمت نہ ہوئی۔ مگر اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے یہ عذر کیا کہ:۔

"مولوی اشرف علی تھانوی جن کی ہار جیت علمائے دیوبند و دہلی کی ہار جیت ہو گی۔ ہم سے مناظرہ کریں یا ہماری تحریروں کا جواب دیں۔ مولوی مرتضیٰ حسن ہمارے مخاطب نہیں۔"

گو اب حضرت تھانوی ایسے مناظروں کو پسند نہ کرتے تھے مگر اتمامِ حجت کے لیے آپ تحریر و تقریر کے لیے تیار ہو گئے۔ بلند شہر میں مناظرہ ٹھہرا۔ آپ نے مولوی احمد رضا خاں صاحب کو اپنے دستخطی لکھ بھیجا کہ میں آپ سے مناظرہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر آپ کو منظور ہو تو مطلع فرمائیے۔ مگر مولوی احمد رضا خاں صاحب حوصلہ چھوڑ بیٹھے۔ اور حضرت تھانوی کو خط کا جواب دینے کی بجائے منتظمین مناظرہ کو ایک بے سروپا خط لکھ مارا۔ اور مناظرہ سے پہلو تہی کی مگر متلاشیانِ حق نے مولوی احمد رضا خاں کو پیچھا چھڑانے کی اجازت نہ دی۔ اور بالآخر مراد آباد میں حضرت

تھانوی اور مولوی احمد رضا خاں کا مناظرہ قرار پایا۔ چونکہ حکومتِ انگریزی وقتاً فوقتاً سیاسی اغراض اور انتشار پیدا کرنے کے لیے اس جماعت کا تعاون حاصل کرتی رہتی تھی۔ اس لیے اسے اس کی ازحد خاطر مطلوب تھی۔ اور آڑے وقتوں میں وہی ان لوگوں کو اپنے "سایۂ عاطفت" میں پناہ دیتی تھی۔ جب مولوی احمد رضا خاں صاحب اور اُن کی جماعت نے دیکھا کہ دیوبندی کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تو اُنھوں نے چالاکی سے پولیس کو اطلاع کر دی کہ اہلِ دیوبند فساد کرانے آئے ہیں۔ جس پر حکومت نے مناظرہ کی مناہی کر کے مولوی احمد رضا خاں کو مناظرہ کی مصیبت سے بچا لیا۔ اور اس طرح اُنھوں نے مجدد الملت کے سامنے آنے کی بجائے راہِ فرار اختیار کی۔ اس سلسلہ میں جو خط و کتابت اور اشتہار و اعلان شائع ہوئے۔ ان کی تفصیل رسالہ "قاصمۃ الظہر فی بلند شہر" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

انکشافِ حقیقت

جماعتِ بریلویہ کے اعلیٰ حضرت کی اس گریز پائی نے گو ان کے دجل و فریب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا تھا۔ اور ان کے کذب و افترا کی قلعی کھل گئی تھی۔ مگر متذبذبین کی ابھی تک تسلّی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری نے بڑی دانائی سے کام لیتے ہوئے انکشافِ حقیقت کے لیے حضرت تھانوی کی خدمت میں مندرجہ ذیل استفسار نامہ بھیجا:۔

بخدمت اقدس حضرت مولانا المولوی الحافظ الحاج الشاہ اشرف علی صاحب فیوضکم العالیہ

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی یہ بیان کرتے ہیں اور حسام الحرمین میں آپ کی نسبت لکھتے ہیں کہ آپ نے "حفظ الایمان" میں اس کی تصریح کی کہ غیب کی باتوں کا علم جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو ہے۔ ایسا ہر بچے اور پاگل بلکہ ہر جانور اور چار پائے کو حاصل ہے اس لیے اُمور ذیل دریافت طلب ہیں :۔

۱۔ آیا آپ نے "حفظ الایمان" میں یا کسی کتاب میں ایسی تصریح کی ہے؟

۲۔ اگر تصریح نہیں۔ تو بطریق لزوم بھی یہ مضمون آپ کی کسی عبارت سے نکل سکتا ہے؟

۳۔ آیا ایسا مضمون آپ کی مُراد ہے؟

۴۔ اگر آپ نے نہ ایسے مضمون کی تصریح فرمائی نہ اشارۃً مفادِ عبارت ہے نہ آپ کا مُراد ہے۔ تو ایسے شخص کو جو یہ اعتقاد رکھے یا صراحتہً یا اشارۃً کہے۔ اُسے آپ مسلمان سمجھتے ہیں یا کافر؟

بندہ محمد مرتضیٰ حسن عفا عنہ (البسط البنان ص۳)

حضرت تھانوی رح نے اس کا یہ جواب لکھا :۔

"مشفق مکرم سلمہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم آپ کے خط کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے

۱۔ یہ خبیث مضمون کسی کتاب میں نہیں لکھا۔ اور لکھنا تو درکنار میرے قلب میں بھی اس مضمون کا کبھی خطرہ نہیں گزرا۔

۲۔ میری کسی عبارت سے یہ مضمون لازم بھی نہیں آتا چنانچہ اخیر میں عرض کروں گا۔

۳۔ جب میں اس مضمون کو خبیث سمجھتا ہوں اور میرے دل میں بھی اس کا خطرہ نہیں گزرا جیسا کہ اُوپر معروض ہوا۔

تو میری مراد کیسے ہو سکتا ہے۔

۴۔ جو شخص ایسا اعتقاد رکھے۔ یا بلا اعتقاد صراحتہً یا اشارۃً یہ بات کہے۔ میں اس شخص کو خارج از اسلام سمجھتا ہوں کہ وہ تکذیب کرتا ہے۔ نصوص قطعیہ کی اور تنقیص کرتا ہے۔ حضور سرور عالم فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

یہ تو جواب ہے آپ کے سوالات کا۔ اب آخر میں اس جواب کی تتمیم کے لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ رسالہ "حفظ الایمان" کی اس عبارت کی مزید توضیح کروں۔ جس کی بناء پر مجھ پر یہ تہمت لگائی گئی ہے۔ حالانکہ وہ خود واضح ہے۔ اول میں نے دعویٰ کیا ہے کہ علم غیب جو بلا واسطہ ہو۔ وہ خاص ہے۔ حق تعالےٰ کے ساتھ۔ اور جو بواسطہ ہو۔ وہ مخلوق کے لیے ہو سکتا ہے۔ اس سے مخلوق کو عالم الغیب کہنا جائز نہیں۔ اور اس دعویٰ پر دو دلیلیں قائم ہیں۔ وہ عبارت دوسری دلیل کی ہے۔ جو اس لفظ سے شروع ہوتی ہے:۔

"پھر یہ کہ آپ کی ذاتِ مقدسہ پر" مطلب یہ ہے کہ آپ کی ذات مقدّسہ پر علم غیب کا حکم کیا جانا۔ یعنی محض اس بناء پر کہ علوم غیبیہ بواسطہ حاصل ہیں۔ آپ کو عالم الغیب کہنا اگر صحیح ہو۔ تو اس سے اگر کل غیر متناہیہ مراد ہوں۔ تو وہ نقلاً یا عقلاً محال ہے اور اگر بعض علوم مراد ہوں۔ گو وہ ایک ہی چیز کا علم ہو۔ اور گو وہ چیز ادنیٰ ہی درجہ کی ہو۔ تو اس میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی کیا تخصیص ہے۔ ایسا علم غیب تو زید۔ عمر وغیرہ کو بھی حاصل ہے۔ تو لفظ ایسا کا یہ مطلب نہیں کہ جیسا علم واقع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ . . . . الخ" (بسط البنان صکہ)

اگر ایسا کی جگہ لفظ اتنا ہوتا۔ تو پھر بات قابلِ گرفت ہو سکتی تھی۔ مگر

آپ نے لفظ اتنا نہیں فرمایا۔ جس کا فرق ظاہر و باہر ہے۔ کیونکہ برابری مقدار میں اتنا میں ہو سکتی تھی۔ لفظ ایسا میں نہیں۔ بہرحال اس سے اتنا تو عیاں ہے کہ اس جماعت کو حضرت تھانوی کی سینکڑوں تصنیفات اور ہزاروں ملفوظات میں اور تو کوئی ایسی تحریر نہ مل سکی۔ جس سے تلبیس و تکفیر کا کام لیا جاسکتا۔ لے دے کے اس کے ہاتھ میں صرف یہی ایک۔۔۔ ایسی سطر آسکی۔ جس کو تلبیسًا سیاق و سباق سے الگ کر کے لوگوں کو دھوکا دیا گیا۔ اور کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ اور اسے وہابیت کے چوکھٹے میں مزیّن کر کے کم علم لوگوں کو فریب دیا گیا۔

وجۂ تاخیر

مذکورہ بالا جواب کے اخیر میں یہ لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے اب تک ایسی لغویات کے جواب دینے کی طرف التفات نہیں کیا تھا۔ کیونکہ تجربہ سے اس پر کوئی معتدبہ نفع مرتب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اضاعتِ وقت سمجھتا ہوں۔ اب جو آپ نے طریقہ سے پوچھا۔ تو میں نے اپنے معلومات ظاہر کر دیے۔ اس سے یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اب تک کیوں نہیں لکھا۔ شاید اب رجوع کر لیا ہو۔ سو وجہ نہ لکھنے کی یہی تھی کہ کسی نے بھلے مانسوں کی طرح پوچھا ہی نہ تھا۔ باقی رجوع تو وہ ہے کہ جو پہلے اور قول اور عقیدہ ہو۔ اور اب اس کو ترک کر کے دوسرا عقیدہ اور قول اختیار کیا ہو۔ بفضلہٖ تعالیٰ میرا اور میرے سب بزرگوں کا ہمیشہ سے آپ کے افضل المخلوقات فی جمیع الکمالات العلمیہ والعملیہ ہونے کے باب میں یہ ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔"

(بسط البنان ص۹)

وہابیت کی تہمت

مولوی احمد رضا خاں صاحب ماشاء اللہ عالم تھے۔ گو ان کا شمار ایسے علماء کے زمرہ میں لکھا جاتا ہے۔ جن کا اپنے علم پر عمل نہیں تھا کیونکہ مولوی احمد رضا خاں "لعنۃ اللہ علی الکاذبین" کی حقیقت سے لاعلم نہ تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خدا کی بھیجی ہوئی لعنت کا اثر سات پشت تک رہتا ہے مگر اس علم کے باوجود اُنھوں نے بہت بڑے تاریخی جھوٹ سے کام لیتے ہوئے حضرت تھانوی پر وہابیت کی تہمت لگائی۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ :-

۱۔ حضرت تھانوی کو محمد بن عبد الوہاب فرقہ وہابیہ سے دُور کا بھی تعلّق نہ تھا۔

۲۔ وہابی حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے سفر ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اور حضرت تھانوی اسے ضروری قرار دیتے ہیں۔ بلکہ اس شرف سے خود بھی مشرف ہو چکے تھے۔

۳۔ وہابی توسّل بالانبیاء و اولیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بعد الوفات حرام قرار دیتے ہیں مگر حضرت تھانوی اسے نہ صرف جائز اور مفید سمجھتے تھے بلکہ اقرب الاجابت قرار دیتے تھے۔

۴۔ وہابی حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور حضرت تھانوی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر ادب و عقیدت کا اظہار فرماتے تھے کہ ظاہر بینوں کو غلو و مبالغہ کا احتمال ہوتا تھا۔ ویسے بھی حضرت تھانوی کی تصنیف لطیف "نشر الطیب" اور "زاد السعید" اس پر شاہد عدل ہیں۔

۵۔ وہابی تصوف و طریقت ذکر و شغل وغیرہ کے منکر ہیں۔ اور حضرت تھانوی ان اُمور کے جامع اور مجدّد تھے۔

۶۔ وہابی تقلید شخصی کے بالکل قائل نہیں مگر حضرت تھانوی سلفِ صالحین کی اتباع اور مجتہدین کی تقلید شخصی کے قائل و عامل تھے۔

کفر کا فتویٰ

مزید براں مولوی احمد رضا خاں صاحب کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ غیر مستحق کی تکفیر کرنا اپنے کفر کا اثبات کرنا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ اگر تکفیر و لعن کسی غیر مستحق کی طرف عائد کی جائے گی تو وہ اسی پر لوٹ آئے گی۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے دیدہ دانستہ ایک بے بنیاد احتمال پر ناحق حضرت تھانوی اور ان کے اکابر پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ جن کا اس بارہ میں اپنا مسلک یہ تھا کہ

> "اگر کسی کے کلام میں ہزار احتمال ہوں۔ جن میں سے نوسو ننانوے احتمالاتِ کفریہ ہوں اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو۔ تو اس کی تکفیر جائز نہیں۔" (مکتوب انوار القلوب)

تنگ ظرفی اور وسعت خیالی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے لیکن جب حضرت تھانوی نے :-

۱۔ اس عبارت کی خود وضاحت کر دی۔ جس کی بناء پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا۔ کہ اس کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو مولوی احمد رضا خاں صاحب سمجھتے ہیں۔

۲۔ اور اس مفہوم کو جو مولوی احمد رضا خاں نے جنم لیا۔ خبیث کہا اور اس عقیدہ کا صریحًا انکار و ابطال کیا۔ بلکہ

۳۔ ایسے عقیدہ رکھنے والے کو خارج از اسلام کہا۔

شرافت کا تقاضا

تو شرافت کا تقاضا یہ تھا کہ مولوی احمد رضا خاں اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیتے

اور آئندہ کے لیے اس کی نشر و اشاعت ممنوع قرار دیتے اور اپنی جماعت سے سختی کے ساتھ اس کی پابندی کرلتے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ حضرت تھانوی کے متذکرہ صدر اعلان کے بعد خود مولوی احمد رضا خاں کی موجودگی میں ان کی زیر نگرانی رسالہ حسام الحرمین کی نشر و اشاعت ہوتی رہی اور ان کی جماعت آج تک اپنے "اعلیحضرات" کی سنت ادا کرتے ہوئے بدستور حضرت تھانوی اور آپ کے اکابر کو کافر اور وہابی کہے جارہی ہے اور وہی فتویٰ ہر سال از سر نو شائع کرا کر اپنے جلسوں میں تقسیم کرتی رہتی ہے چنانچہ امسال (۱۳۷۷ھ) جبکہ یہ سطور لکھی جارہی تھیں۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں ایک پمفلٹ بعنوان "دیوبندی مولویوں کے عقیدوں کی کہانی۔ دیوبندی مولویوں کے پیشواؤں کی زبانی" بانٹا جارہا تھا۔ جن میں انہی باتوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ جو فتویٰ کفر کی بنیاد بنائی گئی تھیں اور جن کی خود ان بزرگوں نے باتردید عرصہ سے کردی ہوئی ہے۔ جن سے وہ منسوب ہیں۔ آخر یہ خیانت و شقاوت نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنا دین وایمان ضائع کرکے اور اپنی عاقبت خراب کرکے ایک بے گناہ اور بے قصور انسان کو متہم کیا جائے۔

ع   بریں عقل و دانش بباید گریست

مسلکِ اشرف

قرآن کریم نے اس جماعت کے متعلق جن الفاظ میں خبر دی تھی متذکرہ بالا واقعات نے اس کی حرف بحرف تصدیق کردی اور اس کے مقابلہ میں جو طریق کار اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس پر حضرت تھانوی نے پورا پورا بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ عمل فرمایا۔ چنانچہ آپ رسالہ "حکایات الشکایات مع ردایات الحکایات" کے دیباچہ میں اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ایک مدت سے مجھ پر عنایت فرماؤں کی طرف سے بے جا اعتراض کی بوچھاڑ ہے جس میں اکثر کا سبب تعصب و تحزب

ہے اس کے جواب کی طرف احقر نے اس لیے کبھی التفات نہیں کیا کہ میں ان اعتراضوں کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا۔ نیز یہ بھی خیال ہوا کہ آج کل جواب دینا قاطع اعتراضات نہیں ہوتا۔ بلکہ کلام اور زیادہ مطول ہوجاتا ہے۔ جس سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور غایت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ تیسرے مجھ کو اس سے زیادہ اہم کام اس کثرت سے رہا کئے کہ اس کام کے لیے مجھ کو وقت بھی نہ مل سکتا تھا۔ چوتھے میں نے جہاں تک دل کو ٹٹولا ایسے اعتراضات کا جواب دینے میں نیت اچھی نہیں پائی۔ میں اہلِ خلوص کو تو کہتا نہیں۔ مجھ جیسے مغلوب النفس کی نیت تو زیادہ یہی ہوتی ہے کہ جواب نہ دینے میں معتقد کم ہوجائیں گے۔ شان میں فرق آجائے گا۔ جس کا حاصل ارضاءِ عوام ہے۔ سو مجھ کو طبعًا اس مقصود یعنی ارضاءِ عوام سے غیرت آتی ہے۔ باقی بعض محبین کی یہ توجیہہ کہ اعتراض سے عام مسلمانوں کو بدگمانی کا گناہ ہوتا ہے تو جواب سے اُن کا اُس گناہ سے بچانا ہے۔ تامّل کے بعد یہ توجیہہ برائے گفتن ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مسلمان دوسرے ہزاروں گناہوں میں مبتلا ہیں۔ ان سے بچانے کا اس قدر اہتمام کیوں نہیں کیا جاتا۔ نیز دوسرے علماءِ حقانی سے اگر ایسی ہی بدگمانی ہوجائے اس کے رفع کرنے کا وہ اہتمام نہیں ہوتا۔ جو اپنے نفس یا اپنے کسی معتقد فیہ کے لیے ہوتا ہے۔ بلکہ اس قدر تو کیا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات تو اگر ان بزرگوں سے چشمک ہوتی ہے تو نفس میں ایک گونہ سرور پایا جاتا ہے۔ کہ اچھا ہوا۔ ان کی ذرا رسوائی تو ہوئی۔ تدین کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اپنے

یا اپنے اکابر کے کسی مخالف سے بھی کسی کو بے جا بد گمانی ہو۔ تو اس کے رفع کرنے کے لیے ویسا ہی اہتمام ہو۔ جیسا اپنے یا اپنے اکابر کے لیے ہوا ہے۔ پھر اس توجیہہ کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور خیر اگر اپنے کسی بزرگ کے لیے ایسا اہتمام کرے۔ تو اس کو نصرتِ مظلوم میں بھی داخل کر سکتے ہیں۔ جو کہ طاعت ہے۔ مگر اپنے نفس کے لیے ایسا کرنا تو کوئی طاعت کبھی نہیں۔ گو جائز ہو۔ مگر ممکن ہے کہ کسی کو بعض جائزہ سے بھی طبعًا انقباض ہوتا ہو۔ چونکہ احقر کو اس سے انقباض ہوتا ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عوام کی خوشامد کی جا رہی ہو۔ کہ ہم سے ناراض نہ ہونا۔ ہم کو برا مت سمجھنا۔ ہماری برائی تم سے غلطی ہو گئی ہے۔ سو جہاں کوئی دنیوی ضرورت ہو۔ وہاں تو ایسا کرنا مضائقہ نہیں۔ اور جہاں یہ بھی نہ ہو۔ تو انسان کیوں تعب میں پڑے۔ اور تقلیل منافع مالیہ یا قوتِ جاویہ کوئی معتد بہ ضرر نہیں۔ جس کے لیے اتنا اہتمام کیا جاوے۔ یہ ہے میرا مذاق اس ملک میں۔ پس ان وجوہ سے میں نے اس کا کبھی قصد نہیں۔ اور نہ اپنے مخصوصین کو اس کی اجازت دی۔ ہاں اگر کسی محض بے تعلق شخص نے بدوں مجھ سے مشورہ لیے ہوئے کبھی جواب دیا۔ تو نفس کو سرور ضرور ہوا۔ مگر پوچھنے پر مشورہ بھی نہیں دیا۔"

مخالفین کی رعایت

یہاں پر بجا طور پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ متذکرہ بالا مسلک پر قائم رہتے ہوئے رسالہ "حکایات الشکایات" لکھنے کی کیوں ضرورت پیدا

ہوئی؟ اس کا جواب سونے پر سہاگہ کا مصداق ہے۔ اس کا جواب خود اسی رسالہ میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"آج کل بعض جو اعتراضات مجھ پر کیے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے بعض معتقدین و موافقین کو اب تک ان اعتراضوں کا علم نہ ہو اور وہ اس لاعلمی کی وجہ سے میرے معتقد ہوں اور اگر علم ہو جاتا۔ تو معتقد نہ رہتے۔ تو گویا زمانۂ بقاءِ عقیدت تک وہ دھوکا میں رہے اور دھوکہ سے مسلمانوں کو بچانا ضروری ہے۔ جیسا کسی تاجر کے سودے میں کوئی کھوٹ ہو۔ تو ظاہر کر دینا شرعًا ضروری ہے۔ لیکن اگر تاجر کے علم میں وہ کھوٹ نہ ہو۔ لیکن بعض مشترین کے زعم میں ہو۔ تب بھی گو شرعًا اس کا اظہار واجب نہیں لیکن خوش معاملگی اور صفائی کا کمال۔ پھر اسی کو مقتضی ہے کہ ایسے امر کو بھی مع اپنی تحقیق کے دوسرے مشتری کے سامنے ظاہر کر دے تاکہ وہ دونوں قولوں کو سن کر آزادی سے رائے قائم کر کے خریدنے نہ خریدنے میں مختار رہے۔ لہذا مناسب ہوا کہ چند ایسے اعتراضات نقل کر کے اپنے نزدیک جو ان کی حقیقت ہے۔ اس کو بھی لکھ دیا جائے۔ تاکہ دیکھنے والے دونوں کو دیکھ لیں۔ پھر جس کا جی چاہے۔ احقر سے تعلق پیدا کرے یا رکھے اور جس کا جی چاہے تعلق نہ کرے یا نہ رکھے۔ ضمنًا یہ بھی مصلحت ذہن میں آئی کہ بعض لوگ واقعی حق کے طالب ہوتے ہیں۔ اور اصل واقعہ معلوم نہ ہونے یا اس کی حقیقت نہ سمجھنے سے تردد میں پڑ جاتے ہیں اور وہ خلوص کے ساتھ تردد کو رفع کرنا چاہتے ہیں۔ ایسوں کا تردد رفع کرنا ہدایت کا ایک شعبہ ہے۔ جو کہ طاعت ہے۔

سو ساتھ ساتھ یہ طاعت بھی ادا ہو جائے گی۔ پس اس عجالۂ مختصر میں ان مضامین کو اس ترتیب سے لکھا جاوے گا کہ اول ایک وہ مضمون جو مبنیٰ ہے اعتراض کا بعنوان حکایت لکھوں گا پھر معترض کے اعتراض کو بعنوان شکایت نقل کروں گا۔ پھر اپنے نزدیک جو اس کی حقیقت واقعیہ ہے۔ بعنوان درایت لکھ کر ختم کر دوں گا۔ وقس علیٰ ھذا اس طرز سے اظہار واقع سنت حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہے کما قال اللہ تعالیٰ فی قصۃ یوسف علیہ السلام فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِلٰى قَوْلِهٖ وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ۔ الآیۃ یعنی مقصود بالذات اس اظہار سے اپنا تبریہ یا تزکیہ نہیں۔ گو برأت مطابق واقع کے بھی ہے۔ بلکہ دوسرے مصالح دینیہ سے اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔

پھر اپنے سے تہمت رفع کرنا سنت بھی تو ہے۔ پس اس وقت اپنی تین حالتیں پیشِ نظر ہیں :۔

ایک محبین کی علامت اور مخالفین کا اعتراض ۔

دوسرے ان سب اعتراضوں کا جن کو دوسرا عیب جو مدتوں میں چھانٹتا۔ از خود ایک جگہ جمع کر دینا تاکہ اسے میرے عیب تلاش کرنے میں تکلف نہ ہو۔

تیسرے اس جمع کرنے میں یہ نیت کہ جس کا جی چاہے تعلق رکھے۔ جس کا جی چاہے نہ رکھے ان تینوں حالتوں پر تین شعر بے ساختہ ذہن میں آئے ہیں۔ اوّل کے متعلق مومن خاں کا شعر ہے

دوست کرتے ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

ثانی کے متعلق اس غزل کا دوسرا شعر

میں گلہ کرتا ہوں اپنا۔ تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

ثالث کے متعلق غالب کا شعر بتصرف یسیر

ہاں وہ نہیں وفا پرست۔ جاؤ۔ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز۔ اس کی گلی میں جائے کیوں"

ایک عجیب اہتمام

حضرت تھانوی بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی:۔

"محض نور کے بنے ہوئے اور تقدس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے کرّوبیوں میں نہیں۔ آب و گل سے ترکیب پائے۔ انسانی دل اور بشری جذبات رکھنے والے انسان تھے"

(حکیم الامت ص۲۴)

اس لیے آپ نے اپنی تحریروں میں سہو و خطا کی جانچ پڑتال کرانے کے لیے اہل علم و دیانت ناقدین کی ایک جماعت اس غرض کے لیے معین کر دی تھی۔

"میری تمام تحریرات کو نظر تنقید سے دیکھ لیا کرے۔ جو ان کی رائے میں قابل اشاعت نہ ہوں۔ ان کو یا حذف کر دیں۔ یا ان پر نشان لگا دیں تاکہ ان کو کوئی شائع نہ کرے باقی اگر کوئی خاص مکتوب الیہ کسی خاص مضمون کا جواب بطور خود بدوں یہاں کے شائع کر دے۔ تو وہ اختیار سے خارج ہے۔ اب

اگر کوئی مضمون جو ناظرین کے نزدیک موہم ہو۔ یہاں سے شائع ہو۔ تو اس کے متعلق خط و کتابت بجائے میرے بنام "جماعت انتخاب التالیف تھانہ بھون" فرمانا مناسب ہے۔"
(اشرف علی تھانوی عفی عنہ آخر جمادی اولیٰ)

عفوِ عام

حضرت تھانوی رح کے مخالفین و معاندین کے سبب سے چونکہ ان بے بنیاد اتہامات و اعتراضات کی نشر و اشاعت اس لیے کی گئی تھی کہ لوگ آپ سے مستفید و مستفیض ہونے کی بجائے آپ کو سب و شتم کریں اور حضرت تھانوی کو نہ مخلوق کی خوشنودی مطلوب تھی۔ اور نہ آپ کسی کو تکلیف میں مبتلا ہونا دیکھ سکتے تھے بلکہ آپ کا مقصودِ زندگی ہی راحت رسانیٔ خلق تھا۔ اس لیے آپ نے رسالہ حکایات الشکایات کے اخیر میں اعلان کر دیا کہ :۔

"ان مضامین (اعتراضات) سے جو کچھ تشویش عوام میں ہوئی۔ اس کا حاصل مجھ کو سب و شتم کرنا تھا۔ بحمد اللہ کسی مقصود دینی میں کوئی اختلال واقع نہیں ہوا۔ سو اپنے سب و شتم کو بامید عفوِ حق سب کو معاف کرتا ہوں۔"

اور ایک دوسرے اعلان کے ذریعہ جس کا ذکر سیرت کے حصہ دوم باب العادات میں گزر چکا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا تھا۔ جو آئندہ ایسی افترا پردازیوں اور کذب بیانیوں کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ تاکہ

"قیامت کے روز ان سے محض میری وجہ سے مواخذہ نہ ہو۔ کیونکہ کسی کو عذاب ہونے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔"

گویا اپنے مخالفین و معاندین کے معاملہ میں آپ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک پر عمل پیرا تھے کہ "خطا کا جواب عطا سے دیا جائے۔"

سیاسی بہتان

مذکورالصدر تہمتوں کے علاوہ آپ پر سیاسی مخالفین کی طرف سے یہ بہتان لگائے گئے:-

۱۔ آپ خلافت کے مخالف تھے۔
۲۔ سلطنتِ اسلامیہ کے مٹنے سے خوش تھے۔
۳۔ مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ کے مخالف تھے۔
۴۔ آپ کے بعض خدام ان کو بُرا کہتے تھے اور آپ انھیں نہ روکتے تھے۔
۵۔ آپ حکومت انگریزی سے تنخواہ پاتے تھے۔

غرضیکہ جتنے منہ ۔ اتنی باتیں۔ جو جس کے جی میں آتا ۔ کہتا رہتا۔ اور عوام میں آپ کے خلاف بدگمانیاں پھیلاتا رہتا۔ اس پر بعض حضرات نے آپ سے ان امور کی تردید کے متعلق بھی کوئی تحریر شائع کرنے کی درخواست کی۔ اور اس کی مصلحت یہ پیش کی کہ ایسی افتراپردازیوں سے آپ کی ذات کو تو نقصان نہ پہنچے گا۔ لیکن بدگمانیاں پھیلانے والوں کا دین و ایمان خراب ہوگا۔ اس پر آپ نے فرمایا:-

جواب باصواب

"یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ نہ میں نعوذ باللہ خلافت کا مخالف ہوں۔ کیونکہ مسئلہ خلافت ایک اجماعی مسئلہ ہے ۔ نہ میں سلطنت اسلام کے ضعف و زوال سے نعوذ باللہ خوش ہوں بلکہ اللہ کو خبر ہے ۔ یہ سب باتیں غلط ہیں ۔ اور میری یہ حالت ہے کہ جب مجھے مسلمانوں کی دینی و دنیوی تباہی کا خیال آجاتا ہے ۔ جس میں زیادہ حصہ خود مسلمانوں کی

ناعاقبت اندیشی کا ہے۔ تو رگ رگ میں غم عظیم پھیل جاتا ہے۔ اور اگر کھانا کھانے میں خیال آجاتا ہے۔ تو کھانا تلخ ہو جاتا ہے اور نہ میں حضرت مولانا (محمود الحسن رح) کا نعوذ باللہ مخالف ہوں۔ بلکہ جس قدر محبت و عظمت حضرت قدس سرہٗ کی میرے دل میں ہے۔ اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ رہا کسی مسئلہ میں رائے کا اختلاف! سو ایسا اختلاف مجھ کو حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ بلکہ اپنے مرشد حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بھی رہا ہے۔ اور اس اختلاف کی ان حضرات کو اطلاع بھی تھی۔ مگر کبھی ان کو تکدر نہیں ہوا۔ اس کو مخالفت کہنا غلو فی الدین ہے۔ امام ابو حنیفہ رح سے امام ابو یوسف رح وامام محمد رح نے باوجود شاگرد ہونے کے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ نعوذ باللہ صاحبین امام صاحب کے مخالف و معاند تھے۔ استغفر اللہ۔ تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ محض بعض امور میں اختلاف رائے کی بنا پر جس کا درجہ میرے اعلان ملقب بہ عنوان "احقر اشرف علی کے مسلک کی شرح" میں بتلا دیا گیا ہے مجھے حضرت مولانا کا مخالف کیوں سمجھا جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ میرا یہ اختلاف حضرت مولانا کے ساتھ آج سے نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ بہت زمانہ پیشتر کا ہے۔ پس اگر یہ اختلاف دینی حیثیت سے مضر تھا۔ تو خود حضرت مولانا نے مجھے اپنی اتباع پر کیوں نہ مجبور کیا۔ یا اس اختلاف کو مذموم کیوں نہیں فرمایا۔ اور اگر یہ اختلاف مخالفت تھا۔ تو حضرت قدس سرہٗ نے اخیر تک مجھ سے وہی بزرگانہ شفقت کا برتاؤ کیوں رکھا۔ یہ واقعات

خود بتلاتے ہیں کہ یہ اختلاف نہ دینی حیثیت سے مُضر تھا۔ اور نہ اس کو مخالفت کہا جا سکتا ہے۔

رہا یہ الزام کہ میرے بعض متعلقین حضرت قدّس سرّہٗ کے مخالف ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے کسی متعلق نے حضرت کی شان میں نہ تقریراً کوئی گستاخی کی اور نہ تحریراً اور اگر کوئی ایسا کرتا۔ تو میں عمر بھر کے لیے اس سے قطع تعلق کر لیتا۔ بعض لوگوں نے یہ تہمت بیچارے (مولانا) مولوی ظفر احمد و (مولانا) مولوی حبیب احمد کی تحریرات پر رکھی ہے۔ مگر ان کی عبادتیں حضرت اقدس کے ساتھ شدّت عقیدت وغایت احترام کو ظاہر کر رہی ہیں۔ مثلاً آخری پیام میں وہ دونوں لکھتے ہیں کہ "ہم نے اپنی متعدد تحریروں میں اس اَمر کو صاف کر دیا ہے کہ نہ ہم کو حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدّس سرّہٗ سے کبھی مخالفت ہوئی اور نہ اب ہے بلکہ ہم ان کے ساتھ حسن عقیدت کو اپنے لیے ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔" نیز یہ بھی غلط ہے کہ میں گورنمنٹ سے تنخواہ پاتا ہوں اگر کسی کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہو تو میں عام طور پر ہر شخص کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ پیش کرے۔ اور اگر وہ پیش نہ کر سکے اور یقیناً نہیں کر سکتا تو اس کو چاہیئے کہ توبہ کرے۔ اگر کوئی مجھ سے ان اُمور میں مباہلہ کرنا چاہے۔ تو میں مباہلہ کر سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی طرف سے کسی ایسے اعلان کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھتا کہ لوگوں کا میرا معتقد ہونا یا معتقد رہنا دین میں ضروری نہیں۔ اہلِ حق میں سے جس کے بھی متبع ہو جائیں۔ ان کے لیے کافی ہے۔"

(النور ماہ جمادی الآخر ۱۳۲۹ھ)

دراصل آپ کو گورنمنٹ برطانیہ کا ایجنٹ مشہور کرنے کی وجہ یہ تھی کہ

الف ۔ حضرت تھانوی ہی پاکستان بننے کے سب سے زیادہ اور اولین خواہاں تھے۔

ب ۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے واجب الاحترام لیڈروں کی موافقت کے باوجود آپ مسلمانوں کے کانگرس میں شامل ہونے کے سخت مخالف تھے۔

ج ۔ آپ قائد اعظم کی دینی تربیت فرما رہے تھے اور مسلم لیگ کی حمایت کر کے قائد اعظم کی پُشت پناہی کر رہے تھے۔ جس کا قائد اعظم نے بعض موقعوں پر فخریہ اظہار فرمایا تھا۔ بلکہ وائسرائے تک سے بھی ذکر کیا تھا۔ تاکہ قائد اعظم کے نیک مقاصد کو نقصان پہنچایا جائے جس کی تفصیل اگلے ابواب میں آ رہی ہے۔

دینی ضیاع

حضرت تھانوی کے متذکرہ بالا جواب باصواب پر جس کی نظیر مشاہیر کی تاریخ وکردار میں ملنی مشکل ہے ۔ مخلصین نے عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہے لیکن لوگوں کا دین بدگمانیوں ۔ افترا پردازیوں ۔ سب وشتم سے برباد ہو رہا ہے ۔ جواب شائع ہونے سے اس کا تدارک ہو جائے گا،" تو آپ نے فرمایا:۔

ازالہ ضیاع

"جب لوگ خود ہی اپنا دین برباد کریں ۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں ۔ کیا وہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی بے گناہ پر تہمت لگانا گناہ ہے؟ ضرور جانتے ہیں ۔ پھر کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ تمام باتیں جو میری طرف منسوب کی جاتی ہیں ۔ ایسی ہیں ۔ جن کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ۔ ضرور نہیں جانتے ۔ تو پھر جب باوجود ان باتوں کے جاننے کے وہ ایسی باتیں میری طرف منسوب کرتے ہیں تو گویا وہ قصداً

گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو ایسی حالت میں مَیں کیا کر سکتا ہوں اگر میں ایسا کروں بھی۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگو! میں اچھا ہوں۔ تم مجھے بُرا نہ کہو۔ سو مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے۔ اور اگر بادلِ ناخواستہ میں گوارا بھی کر لوں۔ تو اس پر شُبہ ہو سکتا ہے کہ اپنی غرض سے ایسا کرتا ہے۔ اس شُبہ کو کیونکر رفع کیا جائے۔ دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ اپنی غرض سے ایسا کرتا ہے۔ اس شبہ کو کیونکر رفع کیا جائے۔ دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ دنیا میں سب ہی نادان نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سمجھدار حضرات بھی ہیں۔ جو میری حالت سے بخوبی واقف ہیں اور یقیناً جانتے ہیں کہ یہ تمام باتیں جو میری طرف عوام منسوب کرتے ہیں۔ غلط ہیں۔ اور لوگ ناحق بدگمانیاں کر کے معاصی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ پس اگر عوام کے دین کی حفاظت کی ضرورت تھی۔ تو اس کی تدبیر یہ تھی کہ واقف حضرات خود ان بدگمانیوں کو رفع کرتے اور لوگوں کو نفع پہنچاتے۔ اور ان کا ایسا کرنا مفید بھی ہوتا۔ کیونکہ وہ بے لوث تھے اور مجھ پر غرض کا شُبہ بھی ہو سکتا ہے۔ جس کو میں دُور نہیں کر سکتا۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ میں نے معاملہ خدا کے سپرد کر رکھا ہے۔ مقصود صرف اس سوال کے جواب میں اس طریق سے اطلاع کر دینا ہے۔ ان وجوہ سے جو تدارک میرے اختیار میں تھا۔ وہ صرف یہ تھا کہ میں ان تمام لوگوں کو جو ناحق بدگمانی افترا۔ سب و شتم کر کے گناہ میں مبتلا ہوئے ہیں معاف کر دوں۔ سو میں نے دل سے ان کو معاف کر دیا ہے۔ اس سے آگے میرے قبضہ سے باہر ہے۔" (بحوالہ صدر)

شرافت نفس

انہی بہتان طرازیوں کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے بھی مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۳۲ء کو حضرت تھانوی رح کو حسب ذیل اطلاع بھیجی کہ:۔

"پچھلے دنوں جناب والا سے متعلق عجب عجب اتہامات سننے میں آئے۔ ایک صاحب نے ایک مشہور مولوی صاحب کے حوالہ سے بیان کیا کہ جناب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جزو نہ ہوگا۔ نماز درست نہ ہو گی۔ معاذ اللہ ایک دوسرے صاحب نے بیان کیا کہ آپ نے "بیان القرآن" سورۃ المائدہ کی آیت وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً کے تحت میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات و مودّت فرض قرار دی ہے۔ پہلے افترا کی تو زبانی تردید کر کے خاموش رہا۔ اس دوسرے افتراء کی تردید اصل تفسیر سے اقتباس دے کر اب کی ہفتہ کے پرچہ "سچ" میں کر رہا ہوں۔" (حکیم الامّت صہ ۲۲۴)

آپ نے انھیں لکھا کہ:۔

"یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر مجھ کو تو طبعًا اچھا نہیں ہوتا۔ اس اتہام میں ان کا ضرر نہ ہوا۔ بلکہ جواب دینے میں ان کا ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ۔"

ایسے حالات میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ؎

ہیں مطابق فہم انسانی کے سب اس کے اصول
علم وحکمت کے قریب اور عقل و دانش کے قریں

اور خسرو دربارِ اشرفیہ یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ؎

کہیں نہ دیکھا کہیں نہ پایا جمال ایسا کمال ایسا
دکھائے کوئی اگر ہو دعویٰ جمال ایسا کمال ایسا

اِخلاف واِلتفات

بہترین لوگ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

"تم میں بہترین لوگ وہ ہیں۔ جن کی صورت دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جن کی بات سے علم میں ترقی ہوتی ہو اور جن کے عمل کو دیکھ کر آخرت کی رغبت پیدا ہوتی ہو؟" (جامع الصغیر)

یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے کہ اگر تعصّب کی عینک اُتار کر خالی الذہن ہو کر۔ رنج اور غصّہ کے جذبات سے علیٰحدہ ہو کر دیکھا جائے۔ تو یہ تینوں خصوصیات مندرجہ ذیل بزرگوں میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جن کا نہ صرف مشاہدہ بلکہ اعتراف خلق کثیرہ کو ہے۔

۱۔ حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ
۲۔ حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
۳۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی

اعلانِ جنگ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اللہ جل شانہ' فرماتے ہیں کہ:۔

"جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے۔ میری طرف سے اس کو اعلانِ جنگ ہے۔" (مشکواۃ و بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے کہ:۔

"جو میرے کسی ولی کی اہانت کرتا ہے۔ وہ میرے ساتھ مقابلہ کے لیے سامنے آتا ہے۔" (فتح الباری)

صاحبِ مظاہرِ حق نے لکھا ہے کہ:۔

"اللہ سے بندہ کی لڑائی دلالت کرتی ہے۔ اس کے خاتمہ بد ہونے پر۔"

حق تعالیٰ نے سود کھانے والوں اور اپنے بہترین لوگوں یعنی اولیاء اللہ کو ستانے والوں کے سوا اور کسی کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں فرمایا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو ستانا یا ان کو بُرا بھلا کہنا کتنا گناہِ عظیم ہے۔

نتیجۂ جنگ

اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذکور الصدر حضرات کے خلاف زبان لعن و طعن دراز کرنے والے اہلِ علم ہیں جو بوجہ بغض و حسد ان کے اجتہادی اختلافات کو دانستہ اہمیّت دے کر لوگوں کو ان بزرگوں سے بدگمان کرتے میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں آگاہ فرمایا:۔

"ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت

فرمایا کہ تم لوگ مفلس کس کو کہتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ جس کے پاس مال نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مفلس نہیں ہے بلکہ حقیقتاً مفلس وہ شخص ہے کہ جو قیامت کے دن بہت سی نیکیاں لے کر حاضرِ دربار ہوگا۔ مگر اس نے دنیا میں کسی پر ظلم کیا تھا۔ کسی کو گالیاں دی تھیں۔ کسی کا مال چھینا تھا۔ قیامت میں روپیہ پیسہ تو ہے ہی نہیں۔ وہاں تو سارے حساب نیکیوں اور گناہوں سے پورے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے ان مظالم کے بدلے میں اس شخص کی نیکیاں ان لوگوں کو دلائی جائیں گی جن پر ظلم کیا تھا اور ان کو برا بھلا کہا تھا۔ اور جب اس شخص کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی۔ تو بہر حال ان کے تو حقوق کو پورا کرنا ہی ہے۔ اس لیے بقدر ان حقوق کے جس قدر گناہ ان لوگوں کے وزن میں آئیں گے۔ وہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے تو اصل مفلس یہ ہے۔ جو بہت کچھ کمائی (نماز۔ روزہ اور دینی کاموں کی) لے کر گیا تھا اور ملا یہ کہ دوسروں کے گناہ بھی سر پڑ گئے"۔

گویا سوءِ خاتمہ کے امکان کے ساتھ حبطِ اعمال کی سزا کا بھی امکان ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان نہ اللہ تعالیٰ سے جنگ مول لے سکتا ہے اور نہ عاقبت کا یہ خسارہ برداشت کر سکتا ہے۔ اس لیے لازمی طور پر یہ لوگ وہی ہو سکتے ہیں جن کو شیاطین الجن والا کہا گیا ہے اور حضرت تھانویؒ کا ایسے لوگوں کو بامیدِ عفوِ حق معاف کر دینا انھیں یومِ حساب کے عذاب سے بچانے سے سعیِ بلیغ کرنا ہے۔ جو آپ کے "بہترین لوگوں" کے زمرہ سے ہونے کی بے نظیر مثال ہے۔

پروپاگنڈا کا نتیجہ

متذکرہ بالا ہر سہ بزرگوں کے خلاف اشرار کی پھیلائی ہوئی افتراپردازیوں کذب بیانیوں اور بدگمانیوں سے جن کی تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ جہاں عوام دھوکہ کھا بیٹھے تھے۔ وہاں اہلِ علم بھی پریشان ہو کر اپنے اکابر سے ان کی وضاحت چاہنے لگے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں

۱۔ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان نے حضرت تھانوی سے ان سوالات کا جواب چاہا:۔

الف:۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب و مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (مدظلہم) کو حضرت والا کیسا سمجھتے ہیں۔ اور کیا اپنے مخصوص و معلوم سیاسی معتقدات کے باوجود یہ حضرات لائقِ احترام ہیں۔

ب۔ جو افراد یا اخبارات ان حضرات اور ان کی شان میں بے باکانہ کلمات استعمال کرتے ہیں مثلاً شیخ الاصنام۔ شیخ الہنود۔ اجودھیا باشی اور لآ اِلٰہ مہاشہ وغیرہ ان کو حضرت کیسا سمجھتے ہیں اور وہ شرعی مجرم ہیں یا نہیں۔

ج۔ حضرت والا ان حضرات کو سیاسیات اختلاف رائے کے باوجود نیک نیّت اور دیانت دار سمجھتے ہیں یا بددیانت اور خائن۔ اور ان حضرات کی سیاسی جدّوجہد کیا حضرت کے نزدیک اخلاص اور مِلّت کی خیر طلبی پر مبنی ہے یا کسی خود غرضی اور خود مطلبی پر۔ (بوادر النوادر ص ۹۶۳)

۲۔ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مدظلہ العالی شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور سے آپ کے ایک مرید نے بھی استفسار کیا کہ:۔

الف۔ حضرت تھانوی اور حضرت مدنی میں باوجود دونوں کے مخلص اور اہل اللہ ہونے کے اتنا شدید اختلاف کیوں ہے۔ کیا مخلصوں اور دینداروں میں بھی ایسا اختلاف ہو سکتا ہے۔

ب ۔ آپ کے نزدیک کون حق پر ہے ۔ اور ان مسائل میں آپ کی کیا رائے ہے ۔
ج ۔ علماء کا وقار عمداً گرایا جا رہا ہے ۔ بے تکلف سب وشتم کیا جاتا ہے ۔
د ۔ علماء کے اختلاف سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے ۔ مسلمان تباہ ہو رہے ہیں ۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے ۔ وغیرہ (الاعتدال فی مراتب الرجال)

یہ سوالات چونکہ اہلِ علم کی طرف سے تھے ۔ اس لیے دونوں حضرات نے ان کے جواب بھی علمی دیئے ۔ جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں ۔ حضرت تھانوی کے جوابات رسالہ "شق الغین عن حق علی وحسین" (جو بوادر النوادر اور ص ۹۶۳ پر موجود ہے) اور مولانا محمد زکریا صاحب کے جوابات رسالہ "الاعتدال فی مراتب الرجال" میں ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں ۔

اشرار کی طرف سے چونکہ ان بزرگوں کے خلاف اب تک پروپاگنڈا جاری ہے ۔ اور ان کو ایک دوسرے کا مخالف ظاہر کرکے عوام میں تفریق کا بیج بویا جا رہا ہے ۔ اس لیے ان حضرات کے باہمی تعلقات اور اختلافات پر روشنی ڈالنی ضروری ہے ۔ تاکہ ایک بہت بڑے تاریخی فریب کا پردہ چاک کیا جائے ۔

نوعیّتِ مسائل

جن مسائل کو وجہِ اختلاف بنا کر اکابر کے خلاف شدومد سے پروپاگنڈا کیا جاتا رہا اور کیا جا رہا ہے ۔ ان کی نوعیّت حضرت تھانوی کے الفاظ میں اس سے زیادہ نہیں کہ :۔

"بعض مسائل قطعی ہوتے ہیں ۔ ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی ۔ بعضے اجتہادی وظنی ہوتے ہیں ۔ ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ ۔ مرید نے پیر کے ساتھ قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ ۔ واحد

نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ اور علمائے اُمّت نے اس پر نکیر نہیں کی۔ اور نہ ایک دوسرے کو ضال اور عاصی کہا ہے نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متّفق ہونے پر مجبور کیا۔ نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے باہم بغض و عداوت ہُوا نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا۔ چنانچہ مشاجرات میں صحابہ کا اختلاف اور علیحدہ رہنے والوں کی علیحدگی کو سب کا جائز رکھنا معلوم ہے۔

ایسے مسائل اجتہادیہ ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہُوا ہے۔ ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرأت خلف امام کے مسئلہ میں۔ دوسرے واقعات یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین میں نکاح صابیات کے مسئلہ میں کہ جن کو تحقیق ہُوا۔ کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں۔ اُنھوں نے اس نکاح کو جائز رکھا۔ اور جن کو تحقیق ہُوا کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں۔ اُنھوں نے اس کو ناجائز رکھا۔ مگر اس واقعہ کی تحقیق میں اختلاف ہو گیا کہ آیا وہ کتابی ہیں یا غیر کتابی۔ اس لیے فتویٰ میں اختلاف ہُوا۔ یا حنفی شافعی میں تعیین سورۃ فی الصلوٰۃ کے مسئلہ میں کہ شافعی نے نفس عمل کو منقول عن الشارع دیکھ کر اس کو جائز کیا۔ اور امام صاحب نے عارض اعتقاد یا ایہام اعتقاد وجوب حالاً یا مآلاً پر نظر رکھ کر اس کو مکروہ فرمایا۔"

شیخ الہند سے اختلاف

بعینہٖ یہی حالت متذکرہ صدر ہر سہ بزرگان دین کے اختلافات کی

تھی۔ جس کی وضاحت خود حضرت تھانوی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے "تذکرِ محمود" میں یوں فرمائی:۔

"حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جب مالٹا سے تشریف لائے۔ تو بعض خاص اسباب سے بعض خاص معاملات میں بعض خاص خیالات ظاہر فرمائے۔ اور اعلاناً و عملاً ان میں حصّہ لیا۔ جس کا مبنیٰ محض خلوص کے ساتھ اسلام اور اہلِ اسلام کی خدمت تھی۔ چونکہ وہ مسائل اجتہادی تھے۔ جن میں شرعاً گنجائش اختلاف کی ہوتی ہے۔ اور ان میں بعضے پہلو دنیوی و دینی خطرات بھی رکھتے تھے۔ جو شرعاً واجب التحرز تھے۔ بعض اہلِ علم نے ان خطرات و مضرات پر نظر کر کے ان تحریکات میں رایاً و عملاً شرکت نہیں کی۔ اور احقر کا خیال بھی ان ہی علیحدگی رکھنے والوں کے موافق تھا اور اس علیحدگی کو اکثر اہلِ محبت مفرط نعوذ باللہ حضرت کی مخالفت سمجھتے تھے۔"

حضرت تھانوی نے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے حضرت شیخ الہندؒ کی یوں وکالت فرمائی کہ:۔

"حامیان کانگرس میں سے بعض حضرات کانگرس کے اشتراک کو اُستاذی مولانا دیوبندی کا اتباع سمجھتے ہیں۔ اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثل اختلاف حنفی و شافعی کے خیال کرتے ہیں۔

سو میرے نزدیک یہ دونوں خیال محض غلط ہیں۔ حضرت مولانا کا اشتراکِ مصالحت تھا۔ نہ کہ مطابعت۔ یعنی اس وقت تحریک خلافت نہایت قوت پر تھا۔ جس سے حضرت مولانا کو قوی اُمّید تھی کہ حکم اسلام کا غالب ہو گا۔ اور ہم لوگوں کا خیال قرائن اور وجدان سے اس کا عکس تھا۔ سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف

تھا۔ اور مثل اختلاف حنفی و شافعی کے اجتہادی تھا۔ اس اشتراک میں متابعت کے شائبہ کا وہم بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی شعار اسلامی کے ضعف یا کسی شعار کفر کی قوت کا ذرا شبہ بھی ہوتا تھا۔ فوراً اس پر نکیر شدید فرماتے۔ چنانچہ مشاہدہ متواترہ اس کا شاہد ہے۔ بخلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگریس کی قوت سے کفر و شرک کا حکم غالب ہے۔ اس کی ہر تجویز سے موافقت و مداہنت کی جاتی ہے۔ اس وقت کا اشتراک بصورت ادغام بالکل متابعت ہے۔ جو کہ ناجائز ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو تقویت اور تنظیم مستقل لازم ہے تاکہ اس کے بعد جو اشتراک ہو۔ وہ مصالحت ہو۔ متابعت نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اشتراک ایک لفظ مشترک ہے۔ مگر اس کے دو فردوں کا یعنی مصالحت و متابعت کا حکم جدا جُدا ہے۔ پس حقیقی امتیاز کے بعد محض لفظی اشتراک سے اشتباہ نہ ہو جائیے۔" (بوادر النوادر ص ۹۶۹)

شیخ الہند کی عنایات

انہی اختلافات کے زمانہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی سے استفسار فرمایا کہ ان مسائل میں جب اختلاف ہے تو مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ آپ نے جواب دیا کہ "حضرت (شیخ الہند) ہم سب کے بڑے ہیں۔ مجھ کو ان پر ترجیح دینا چاہیئے۔ باقی میرا معاملہ جُدا ہے۔

اور جب حضرت شیخ الہند کی توجہ حضرت تھانوی کے اختلاف کی طرف دلائی گئی تو انھوں نے آپ کی طرف نکیر نہیں فرمائی بلکہ فرمایا کہ:۔

الف۔ "میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ کیا مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ میری ایک رائے ہے سو اس کی (یعنی) حضرت تھانوی کی بھی ایک

رائے ہے۔ اس میں اعتراض وشکایات کی کیابات ہے"؟

ب ۔ "اختلاف تو ٹھیک نہیں۔ میرے جی میں یہ آتا ہے کہ میں ہی اپنی رائے سے کچھ ہٹ جاؤں"۔

ج ۔ یہاں تک کہ ان سے حضرت کی مخالفت سُنی بھی نہ جاتی تھی۔ چنانچہ ایک اور موقع پر ایک صاحب نے بیرونی پروپیگنڈا سے متاثر ہوکر حضرت تھانوی کو حضرت شیخ الہند کا مخالف سمجھتے ہوئے ان سے گفتگو کے دوران میں آپ کی شان کے خلاف کوئی کلمہ کہہ دیا۔ اس پر انھوں نے اسے تنبیہہ فرمائی کہ:۔

"تمھیں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ جو میرا خیال ہے۔ وہی صحیح ہے۔ اور حق ہے۔ اور مولانا تھانوی کا جو خیال ہے۔ وہ سراسر غلط ہے۔ تم نے جس جس جگہ مولانا تھانوی کی نسبت کچھ کہا ہے۔ وہاں مولانا تھانوی کی مدح وتعریف کرو۔ تاکہ اس کا تدارک ہوجائے"۔

د ۔ ایک اور موقع پر بعض نادان دوستوں نے حضرت شیخ الہند کو تحریکات کی تقویت کے لیے تھانہ بھون لیجانا چاہا۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ:۔

"وہاں مولوی اشرف علی موجود ہے۔ میرے جانے سے اس کو تنگی ہوگی۔ کیونکہ موافقت تو اس کی رائے کے خلاف ہوگی۔ اور عدم موافقت سے شرمائے گا اس لیے وہاں نہیں جاتا"۔

س ۔ اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا:۔

"تم کیوں بار بار اس پر اعتراض کرتے ہو۔ وہ بھی دین کا ایک کام کررہا ہے"۔

شیخ الاسلام کا رجوع

"شیخ الاسلام حضرت مولانا شبّیر احمد عثمانی حضرت تھانوی کے خلیفہ

خاص تھے۔ مگر تحریک خلافت وغیرہ کے دوران میں ہر دو بزرگوں کے درمیان بھی شدید اختلاف ہو گیا۔ حضرت تھانوی کی تحریک خلافت سے علیحدگی کے سلسلہ میں لوگوں نے جوش میں آپ کو مطعون کرنا شروع کر دیا۔ تو اس وقت کے مسائل حاضرہ پر علماء دیوبند نے ایک فتویٰ دیا۔ جس میں تحریر تھا کہ :-

"مسائل حاضرہ میں ہمارا مسلک تو بالکل وہی مسلک ہے۔ جو حضرت اُستاذ مولانا مولوی محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقرر فرما گئے ہیں۔ لیکن بہ نسبت مولانا اشرف علی صاحب کے بسبب حسنِ ظن کے ہمیشہ تاویل کی ہے۔ کبھی تفسیق نہیں کی اور نہ کسی کو اجازت دی"۔

اِس فتویٰ پر دیوبند کے دیگر بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بھی دستخط تھے۔ جس پر اُنھوں نے اپنی طرف سے یہ الفاظ بھی بڑھا دیے تھے کہ اما انا فمولانا التھانوی یسئل عنی ولا اسال عنه کہ میرا یہ رتبہ نہیں کہ مجھ سے مولانا تھانوی کے متعلق پوچھا جائے۔ بلکہ اگر ان سے میری نسبت پوچھا جائے تو زیبا ہے اور جو کسی کی سمجھ میں کچھ اور آوے۔ تو خود صاحب عبارت سے پوچھ لیا جاوے۔

جب یہ جوش کا زمانہ گزر گیا۔ اور آہستہ آہستہ سب کو ہوش آنے لگا تو حضرت شیخ الاسلام نے بھی فوراً اپنے شیخ کی طرف رجوع کر لیا۔ جس کی اطلاع حضرت تھانویؒ نے ان الفاظ میں مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کے استفسار پر دی کہ :-

"مولوی شبّیر احمد صاحب نے ہمّت کی کہ اعلان تجویز شدہ کو خود لطیف بنا کر مجھ سے موافقت حاصل کر کے شائع کرا دیا۔ خود بھی آئے تھے۔ مگر اعلان کے قبل بھی ملنے آئے تھے۔

میں اکرام و احترام سے ملا۔ باتیں بھی کیں۔" (حکیم الامت ص۴۳۸)
مولانا عثمانیؒ کے رجوع سے حضرت کو اتنی مسرت ہوئی کہ ان کی مریدانہ حیثیت کو مساوی بنادیا۔ اور اس کے متعلق آپ نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھا کہ:۔

"جب اعلان آیا۔ وہ موجود نہ تھے۔ ورنہ بلاکر خود ملتا۔ اب آئیں گے تو بشاشت بھی ہو گی۔ البتہ یہ کہہ دوں گا کہ اب ملنا پہلی حیثیت سے نہیں۔ اس لیے اب میرے ساتھ تعظیم یا استفادہ کا برتاؤ نہ کیا جاوے۔ مساویانہ یارانہ برتاؤ رکھا جائے۔ اور ان کو بھی چاہیئے کہ اس کو قبول کر لیں۔" (بحوالہ صدر)

اکابر دیوبند کا اختلاف

سیرت کے حصہ دوم میں اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ حضرت تھانوی نے مدرسہ دیوبند کے اہتمام سے بعض متذکرہ الصدر نوعیت کے اختلافات کی بناء پر خود کو بذریعہ اعلان اخبار معزول کر لیا تھا۔ مگر لوگوں نے اسے بھی خوب پھیلایا۔ جس سے متاثر ہو کر مولانا عبدالماجد نے حضرت تھانوی کو لکھا:۔

"دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دل دکھتا ہے۔ خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف دیکھ کر۔ صحابہ کرام کے اختلافات تسکین و تشفی کے لیے سامنے نہ ہوتے۔ تو دل بالکل مایوس ہی ہو کر رہ جاتا۔" (حکیم الامت ص۴۶۰)

اس کے جواب میں حضرت تھانوی نے لکھا:۔

"واقعی سچی محبت اور خیر خواہی یہی ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔ اب میں بھی صدق و خلوص سے حقیقت عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ حقیقت اس تحقیق کی میری بھی سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ بالکل مبہم

سمجھنے کی عادت نہیں۔ ضرورت کہ حسبِ ذیل نقشہ پُر کر کے مجھ کو عطا فرمایا جاوے۔ تاکہ مجھ کو موقع ملے نظر کرنے کا اور نظر کرانے کا۔

اختلاف کا واقعہ جو اشرف علی کے متعلق ہوُا	معلوم ہونے کا ذریعہ	مشورہ جس پر اشرف علی کو کاربند ہونا مناسب ہے

مگر مولانا عبدالماجد صاحب کی طرف سے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں بھی حضرت تھانوی کو ناحق معتوب و مطعون کیا جارہا تھا۔ فی الاصل بات اتنی نہ تھی۔ جتنی بڑھائی گئی تھی۔ جس کی تائید حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے حسب ذیل گرامی ناموں سے ہوتی ہے:۔

۱۔ مولانا نے ایک معترض کو اس کے خط کے جواب میں لکھا:۔

"سلام مسنون۔ لفافہ آپ کا پہنچا۔ حالات معلوم ہوئے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب سے حالات حاضرہ میں ہم کو اختلاف ضرور ہے۔ لیکن یہ اختلاف ایسا نہیں ہے کہ جس سے ہم مولانا کی توہین اور گستاخی کو گوارا کریں۔ مولوی صاحب نے جو کچھ کیا یا کہا، یا اپنی طرف سے کیا۔ ہم اس کو پسند نہیں کرتے۔ اور نہ اس کی اجازت دے سکتے ہیں۔"

۲۱ جمادی الآخری ۱۳۳۹ھ

۲۔ مولانا موصوف نے ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ کو حضرت تھانوی کو اختلافات کے باوجود دیوبند آنے کی دعوت دی اور دعوت نامہ میں لکھا کہ:۔

"یہاں بحمد اللہ کسی کو انقباض و تکدر۔ ۔ ۔ نہیں۔ اگر فی الواقع ایسا

ہو بھی۔ تب بھی مجھے جناب سے یہی توقع رکھنی چاہیئے کہ اس عُقدہ کو حل فرما کر جماعت کو انتشار و تشتت سے بچالیں مجھے خود بھی جناب سے بعض رایوں میں اختلاف تھا لیکن الحمدللہ تنقیص و توہین کو سننا بھی گوارا نہیں کیا۔ اختلاف آرامسائل کی صورت میں اعتراض کرنا شرعًا مذموم نہیں سمجھا گیا۔ سب سے اول مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا جائے کہ جلیل القدر صحابہ یہاں تک کہ عشرہ مبشرہ بلکہ خلفائے راشدین میں بوجہ اختلاف اعتراض کیے گئے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ قتال کی نوبت پہنچ گئی۔ لیکن یہ اسی حد تک تھا۔ جہاں تک اختلاف رائے کا تعلّق تھا۔ اور جب نفس ذات پر نظر جاتی تھی۔ تو وہی اصل ارتباط معلوم ہوتا تھا۔

اس کے بعد مجتہدین اور ان کے اتباع کے اختلافات موجود ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ حضرت امام اعظم پر اور اُن کے متبعین پر سخت الفاظ میں اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن جب نفس ذات امام اعظم اور اُن کے فضل و کمال پر نظر جاتی ہے۔ تو غایت درجہ کا ادب کرتے ہیں یہاں تک کہ نماز صبح میں قنوت بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اس طرح امام شافعیؒ اپنے اُستاد امام مالک پر سختی سے اعتراض کرتے ہیں۔ یہ بھی بطور قاعدہ کلیہ کے ہے کہ اختلاف اگرچہ اصولی نہ ہوں۔ فرعی ہوں۔ حقیقی نہ ہوں لفظی ہوں۔ مگر ابتدا میں بوجہ جوش و ہیجان ایک دوسرے کے خلاف جوشیلے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بسا اوقات یہ جزوی اختلاف فساد

کی طرف منجر ہو جاتے ہیں مگر انجام کار سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ اشاعرہ و ماتریدیہ اصولاً متفق ہیں۔ صرف چند مسائل میں اختلاف کی وجہ سے کیسے کیسے خلاف ہوئے۔ طعن و تشنیع کے دروازے کھلے۔ نوبت بمخاصمت و تذلیل پہنچی۔ مگر انجام جب صلح ہوئی۔ تو معلوم ہوا کہ اکثر اختلافات صرف لفظی تھے اور جو بعض حقیقی تھے۔ تو ان سے تضلیل و تفسیق ہوئی۔ بجنسہٖ یہی حالت ہم لوگوں کی جناب کے ساتھ تھی۔ اختلاف ضرور تھا۔ اعتراض بھی کرتے تھے۔ لیکن جناب کی ذات سے وہی تعلق تھا کسی حالت ناراضی میں کوئی لفظ بھی کہا تو وہ اس حالت کا اقتضا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں اور ہم میں سے اکثروں نے بالکل احتیاط کا طریقہ رکھا۔ اور اکثروں کا طریقہ یہ رہا کہ نفس مسئلہ میں اختلاف کے ساتھ جناب کی طرف سے مدافعت بھی کرتے رہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ اس سے میری غرض یہ ہے کہ ایسے شدید ہیجان جوش اور اختلاف رائے کے وقت اگر کسی سے کوئی امر خلاف شان سرزد ہوا۔ تو ایسی حالت میں کہ اصولاً سب متفق ہیں اختلاف ہے تو صرف مصالح دینی کی بناء پر۔ جس کے نزدیک جو جانب راجح معلوم ہوئی اس پر عمل کیا۔ تو میرے نزدیک اس میں زیادہ کنج وکاؤ نہ کی جائے۔ بلکہ اصول کو مدّنظر رکھ کر عارضی اختلافات کو رفع کر دیا جائے۔ خلاصہ عرض یہ ہے کہ بہت سی روایات اور واقعات اصلی حالت میں نہیں پہنچے اور اس میں شک نہیں کہ اختلاف پیدا ہوا۔ اور اس کی وجہ سے شکوہ شکایت

اور اعتراضات کی نوبت پہنچی۔ لیکن بایںہمہ یہ اعتراضات مخالفانہ یا معاندانہ نہ تھے۔ بلکہ جیسا کہ اہل حق کی دو جماعتوں میں اکثر ہوا ہے۔ تھے۔ اکثر اختلافات کا مبنیٰ عزیمت و رخصت پر تھا۔ ایسی حالت میں باوجود اختلاف کے دینی تعلقات برابر قائم رہے۔ اور ہیں۔ جن اکابر یا بالخصوص اصاغر کی طرف جناب کو خیال ہے۔ ان کی طرف بہت سی باتیں غلط طور پر منسوب ہوئیں۔ صورت حال ایسی تھی کہ جو کچھ روایت ہوا۔ چھپاں ہو گیا۔ اور اس میں کسی ایک جانب کی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ تعلقات کبھی بھی منقطع نہیں ہوئے۔ فریقین نے اختلاف رائے کی وجہ سے اعتراض تو کیے ہیں۔ توہین و تنقیص نہیں کی اور نہ ان کا مقصود یہ تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ جناب ان روایات پر توجہ نہ فرمائیں گے۔ اور میری نیازمندانہ عرض قبول فرما کر یہاں (دیوبند) تشریف لانے کا قصد فرماویں گے۔"

صُلح کی مسرّت

یہ دعوت نامہ اس بات کا مظہر ہے کہ مخالفین و معاندین نے کس طرح رائی کو پہاڑ بنا کر حضرات دیوبند اور حضرت تھانوی کے اجتہادی اختلافات کو ہوا دی۔ حضرت تھانوی کے دل میں تو کسی کے خلاف کدورت تھی ہی نہیں۔ آپ تو سب مخالفین و معاندین کو ہمیشگی معاف کر چکے تھے۔ بس اس دعوت نامہ کو پڑھتے ہی آپ دیوبند چلنے کو تیار ہو گئے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:۔

"اس کے بعد میں نے عذر کی کوئی گنجائش نہیں دیکھی اور چہار شنبہ ہی کے روز دیوبند حاضر ہو گیا۔ اور پنجشنبہ کو تمام دن

لقاءِ احبا سے جانبین میں عید کا لطف حاصل رہا اور اس لطف کی تکمیل شبِ جمعہ کے ایک وعظ پر ختم ہوئی۔ جس کی احقر کو فرمائش کی گئی اس وعظ کا نام "آداب التبلیغ" ہے۔ جو چھپ چکا ہے۔ اس صلح کی مسرّت کے ساتھ ایک دوسری صلح کی مسرّت نورٌ علیٰ نور ہو گئی۔ یعنی زمانِ مکاتبت میں ایک عزیز کے خط میں یہ خبر نظر سے گزری کہ آج ترکوں کا معاہدہ اپنے مخالفین سے مکمّل ہو چکا ہے اور دستخط ہو گئے ہیں۔" (یوم الجمعہ ۱۳۴۱ھ)

مولانا مدنی کا معاملہ

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت تھانوی کے درمیان بھی ویسے ہی اختلافات تھے۔ جیسے حضرت شیخ الہندؒ کے درمیان مگر مخالفین نے کاندھلہ میں غالباً ۱۳۳۹ھ میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے حضرت تھانوی کے متعلّق سوال کیا تو مولانا بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ:۔

"یہ کیا واہیات سوال ہے: ہم تو ان کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ اپنے دوسرے بڑوں کو۔"

بعد ازاں معاندین نے ان اختلافات کو اتنی اہمیّت دی کہ مولانا عبد الماجد دریابادی جیسی شخصیّت بھی اس پروپاگنڈا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ:۔

۱۔ "کانوں نے بیشک سُنا تھا۔ کہ اُن کے اور اِن کے درمیان بے لطفی ہے ناچاقی ہے۔" (حکیم الاُمّت ص ۴۶۰)

۲۔ "دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دِل دُکھتا ہے۔ خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف دیکھ کر۔" (حکیم الاُمّت ص ۴۶۰)

لیکن جب مولانا عبدالماجد صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی معیت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے اور یہ دونوں بزرگ صبح کی نماز حضرت تھانوی کے پیچھے پڑھ کر فارغ ہوئے۔ تو مولانا عبدالماجد صاحب کیا دیکھتے ہیں؟ اس کی تفصیل خود ان کی زبانی یہ ہے کہ :-

"نماز ختم ہوئی۔ سلام پھیرا۔ دُعا مانگ کر جونہی حضرت (تھانوی) اُٹھے۔ نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی۔ اُن کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات سے ملے۔ لوگ تو کہتے تھے کہ بڑے خشک مزاج ہیں۔ خشک مزاج ایسے ہوتے ہیں؟ یہ نرم بشاش چہرہ۔ یہ ہنستا مُسکراتا ہُوا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو سکتا ہے؟ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے اور ان کے درمیان بے لُطفی ہے۔ ناچاقی ہے۔ کانوں نے بیشک یہی سُنا تھا لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں۔ کہ دو دشمن نہیں۔ دو دوست گلے مل رہے ہیں۔ تعظیم و تکریم مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے تو خیر ہوتی بھی۔

عادت طبعی ہونے کی بناء پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بناء پر بھی۔ لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ اُدھر سے بھی آداب و رواسم تکریم میں کوئی کمی نہ تھی"۔ (حکیم الامت ص ۱۶-۱۷)

حضرت تھانوی کے آداب و احترام کے بعد حضرت مدنی کا اخلاص و اکرام بھی قابلِ قدر ہے۔ جب مولانا مدنی صاحب کے مرید باصفا مولانا عبدالماجد صاحب حضرت تھانوی کے ہاں چند دنوں کے لیے تھانہ بھون جاکر قیام فرماتے ہیں۔ تو انھیں تھانہ بھون میں حضرت مولانا مدنی کا یہ خط موصول ہُوا۔

"محترم المقام زید مجدکم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"
والانامہ محررہ ۱۶ اکتوبر (۱۹۲۹ء) باعث سرفرازی ہُوا تھا۔
ب توجناب خانقاہ میں پہنچ گئے ہوں گے۔ خداوند کریم
وہاں کی حاضری باعثِ برکات لاتتناہیہ کرے۔ آمین

چوں با جبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر محبان بادہ پیما را

مجھ کو قوی اُمیّد ہے کہ آنجناب وہاں پر اپنے اوقات
کو مشاغل حقیقیہ میں صرف فرمادیں گے جن کے متعلق ہدایت
کرنے کی ضرورت نہیں۔

البتہ ایک ضروری عرضی محض اخلاص کی بناء پر کرتا ہوں۔
اور اُمّید وار ہوں کہ کسی غیر محمل پر حمل نہ فرمائیں گے۔ میں
نے حسب الارشاد حضرت (تھانوی) دامت برکاتہم اور آپ
حضرات کے اصرار پر اس وقت آپ کو بیعت کر لیا تھا۔
مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی۔ روسیاہی۔ ناکامی پر
نہایت درجہ گریہ کناں ہوں۔ اور سخت شرمندہ ہُوا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دامت برکاتہم کے دربار میں
پہنچادیا ہے۔ اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے
انس اور تعلّق پیدا ہو گیا ہے۔ و للہ الحمد۔ اللّٰھم زد فزد۔
اب مناسب اور ضروری ہے کہ آپ مولانا سے بھی بیعت کر خود
لیں۔ مجھے قوی اُمّید ہے کہ مولانا برکاتہم آپ کو نہ ٹالیں
گے۔ میں نے خود ان دنوں جب حاضر ہُوا تھا۔ عرض
کیا تھا کہ آپ جب تشریف لائیں۔ اور درخواست کریں۔
توجناب ان کو ضرور بیعت کر لیں۔ قواعد طریقت کے

اصول پر بیعت کر لینا ہی زیادہ تر مفید اور کار آمد ہے ۔ اسی کی بناء پر فیض کی زیادہ تر اُمّید ہے ۔

مجھ روسیاہ کو بھی کبھی دعوات صالحہ سے یاد فرمایا کریں۔

نیز مولانا دامت برکاتہم سے بھی دُعا کی التجا کر دیا کریں۔

ننگ اسلام حسین احمد غفرلہٗ دیوبند ۲۰ جمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ“

(حکیم الاُمّت ص۹۰)

اس گرامی نامہ کا جواب مولانا عبدالماجد صاحب کی بجائے حضرت تھانوی نے یہ دیا :-

”مخدومی و مکرمی مولانا حسین احمد صاحب دامت فیضہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مولوی عبدالماجد صاحب کے نام جو گرامی نامہ آیا۔ اس میں مشورہ تحویل بیعت کا پڑھا۔ گو اس وجہ سے کہ میں اس کا مخاطب نہیں۔ مجھ کو جواب عرض کرنے کا استحقاق نہیں لیکن چونکہ اخیر تعلق مجھ سے ہی ہے ۔ نیز اس میں مجھ کو مخاطب بنانے کی یاد دہانی بھی ہے اس لیے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں ۔

مجملاً تو وہی عذر ہے ۔ جو زبانی عرض کیا تھا۔ اور قدرے مفصّلاً یہ عرض ہے کہ اس میں مولوی صاحب کا ضرر ہے اس لیے اُمّید ہے ۔ کہ اس مشورہ سے رجوع فرمائیں گے۔ وہ ضرر یہ ہے کہ میری خشونت و سوءِ خلق تو مشہور ہے ۔ مگر مولوی صاحب کی یہ رعایت و دلجوئی جو صمیم قلب سے ہے۔ وہ آپ ہی کے انتساب سے مسبب ہے ۔ کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ وہ اس رعایت سے محروم کر دیئے جائیں ۔ دوسرے ان کو مجھ سے مؤانست کافی ہے ۔ لیکن نفع کا مدار اعظم مناسبت ہے ۔ اس کو میں پہلی

ملاقات میں طے کر چکا تھا۔ اور اسی بناء پر آپ نے میری سفارش کو قبول فرمایا۔ جس کا میں شکر گزار ہوں۔ اور اگر ان بناؤں کو آپ ضعیف خیال فرمائیں۔ تو میں بھی ان کی تقویت پر زور نہیں دیتا۔ لیکن جب اوّل بار میں یہ قول خود۔ میری خاطر منظور تھی۔ سو اب بھی میری خاطر منظور فرمائی جائے۔ اور جس طرح کام چل رہا ہے۔ چلنے دیا جائے۔ کہ آپ اُن کے مخدوم رہیئے اور مجھ کو خادم رہنے دیجئے۔ اس جدید تبدل میں میری اور اُن کی دونوں کی پریشانی مضمر ہے۔ جس کا گوارا کرنا اخلاق سامی سے بعید اور بہت بعید ہے۔ اور جب اس کا مجھ پر مدار ہے۔ اور میری طرف سے محض انکار ہے۔ تو مولوی صاحب کو ایسی بات کا حکم فرمانا۔ جو اُن کی قدرت سے خارج ہے تکلیف مالایطاق ہے۔ جو ہر پہلو سے منفی ہے۔

والسلام

ناکارہ ننگ انام۔ اشرف برائے نام از تھانہ بھون۔ جمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ

(حکیم الامّت ص ۹۲-۹۱)

یہ خط و کتابت عین اختلافات کے زمانہ یعنی ۱۹۲۵ء کی ہے۔ اسی لیے مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"سیاسی اختلافات مولانا حسین احمد صاحب سے اس وقت بھی تھے۔ اس پر بھی اس وقت تک اُن کا پورا لحاظ و احترام قائم تھا"۔

(حکیم الاُمّت ص ۱۱۳)

زمانہ گزرتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اختلافات کی خلیج بھی وسیع ہوتی گئی۔ پورے آٹھ سال بعد بھی ان دو حضرات کے درمیان عزت و عظمت کے وہی قابل رشک نظارے دیکھے گئے۔ خود مولانا حسین احمد صاحب کے مرید باتمیز مولانا عبدالماجد صاحب اس بات کی شہادت ان الفاظ میں دیتے ہیں:-

"تھانہ بھون اور دیوبند کے سیاسی مسلک میں اختلاف کچھ آج سے نہیں۔ مدّت دراز سے بالکل واضح و غیر مخفی تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں بزرگوں کے ذاتی تعلقات بڑے خوشگوار اور شگفتہ تھے۔ نہ شفقت میں کوئی کمی حضرت کی جانب سے تھی اور نہ احترام و بزرگداشت میں کوئی فرق مولانا حسین احمد کی طرف سے ؟"

(حکیم الامت ص۵۱۰)

یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ جن اکابر کو دانستہ یا نادانستہ ایک دوسرے کا سخت ترین مخالف ظاہر کیا جاتا تھا۔ ان میں کس درجہ التفات و ارتباط تھا۔ اور ان کے اختلافات بھی کیسے اصول صحیحہ کے موافق اور حدود شرعیہ کے اندر تھے۔ جس کی کسی دوسرے مکتبۂ فکر میں مثال ملنی مشکل ہے۔ بلکہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:۔

افراط و تفریط

"قوم عجیب افراط و تفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے کسی سے خوش ہوئے تو اسے پوجنے لگے۔ خفا ہوئے تو گالیاں دینے پر لعنت برسانے لگے۔ گویا ان کا لیڈر یا امیر فرشتہ ہو۔ اگر فرشتہ نہیں ہے۔ تو پھر شیطان کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ توازن و اعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے اور اشخاص و رجال کو۔ ان کے صحیح مقام پر رکھنا ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں۔ شیعیّت اور خارجیّت دونوں بے اعتدال کی پیداوار ہیں۔ اور اہلِ سُنّت کا مذہب جو بین بین اور سارے پہلوؤں کے درمیان حکیمانہ توازن کے ساتھ قائم ہوا تھا۔ افسوس کہ وہ خود اب اسی بدبختی کا شکار ہوا جارہا ہے۔"

(حکیم الاُمّت ص۹۱)

ذکر و فکر

میانہ روی

اسلام کی تمام تعلیمات اعتدال پر مبنی ہیں۔ وہ سکھلاتا ہے کہ:۔

الف۔ "اگر کسی کا کوئی ایسا فعل دیکھو۔ جو بظاہر محل نظر ہو۔ تو اس کے متعلق فی الفور بلا تحقیق فتویٰ صادر نہ کرو۔ اگر کسی شرعی دلیل سے اس کے جواز کا پہلو نکلتا ہو۔ تو پھر تاویل سے کام لو۔ اسے ذلیل نہ کرو۔"

ب۔ "اگر آپ حُسنِ ظن سے کام نہیں لے سکتے اور اس کی برائیاں نمایاں کرنے پر مجبور رہیں تو حق پسندی و حق شناسی سے کام لیتے ہوئے۔ اس کی خوبیاں بھی بیان کر دو۔"

ج۔ "اگر اس کی خوبیاں بیان نہیں کرنا چاہتے۔ تو نرمی اور مروّت سے کام لیتے ہوئے اس کا ذکر اسی انداز سے کرو کہ اسے یا اس کے ہم خیال لوگوں کو ناگوار نہ گزرے۔"

د۔ "اگر اس کی بھی ہمّت نہیں۔ تو احترامِ انسانیّت کے تحت اس کی بُرائیوں کو بھی بُرا سمجھو اس کی ذات کو سب و شتم کا نشانہ نہ بناؤ۔"

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں بڑے بڑوں کے پائے استقلال میں لغزش آگئی اور وہ کم فہمی یا بغض و حسد کی وجہ سے اعتدال کا دامن چھوڑ بیٹھے اور تشتت و تفریق کی خلیج وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے۔

اس دورِ افراط و تفریط میں اگر کوئی جادۂ اعتدال سے سر مو نہیں بھٹک سکا۔ تو وہ صرف تھانہ بھون کا یہ مردِ حق تھا۔ جس نے بقول لے:-

"اپنے اُوپر پرایوں کو قرآن و حدیث کی میزان پر تولا۔ اور جو جتنا اُترا۔ اس کا حق ادا کیا۔ ان کی طبعی جبلی مجبوریوں۔ ذہنی و فکری خطاؤں۔ حالی و مقالی لغزشوں کی حدودِ شرع کے اندر تاویلات کیں۔ اور حُسنِ ظن کی تلقین فرمائی۔ جو باتیں دائرۂ شریعت کے اندر نہ آسکیں۔ ان پر سکوت فرمایا۔ جو چیزیں حرم شریعت سے ٹکرائیں ان کا صاف صاف ردّ کیا۔ مگر صاحبِ قول پر لعن و طعن اور سب و شتم سے پھر بھی گریز کیا۔" (حیاتِ اشرف ص۲۲۱)

جس کی تائید آپ کی مندرجہ ذیل آرا و افکار سے ہوتی ہے۔ جو آپ نے وقتاً فوقتاً ایسی جماعتوں اور شخصیتوں کے متعلق ظاہر فرمائیں۔ جن کے متعلق رائے قائم کرنے میں بڑے علماء و فضلاء نے غلو و مبالغہ یا تنگ نظری و تنگ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔

شیخ ابنِ عربی

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی المعروف بہ شیخ اکبر کو صُوفیاء کی ایک جماعت تو امام مانتی ہے۔ اُدھر علماء کی دوسری جماعت ان پر کُفر کا فتویٰ صادر کرتی ہے۔ مگر حضرت تھانوی کی میانہ روی ملاحظہ ہو۔ آپ لکھتے ہیں کہ:-

"میرا مسلک حضرت شیخ قدّس سرہٗ کے باب میں یہ ہے بنا بر شہادت جم غفیر اکابرِ اُمّت جس کی حجیّت انتم شهداء فی الارض سے ثابت ہے۔ شیخ کی مقبولیّت و ولایت کا عقیدہ کامل رکھتا ہوں۔ اور شیخ کے اکثر علوم جواز قبیل اسرار

ہیں اور میرے فہم سے خارج ہوں۔ عقلاً نہ ان کے اثبات کا حکم رکھتا ہوں بامتثال لا تقف ما لیس لک بہ علم اور نہ ان کی نفی کا بایماء آیت بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ اور بلا ضرورت شرعیہ ان کی اشاعت اشتغال کو مضر سمجھتا ہوں۔ بحکم آیت واما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ اور طبعاً ان کے قول کی طرف توجہ کرنے سے قلب میں اطمینان نہیں پاتا ہوں۔ اس لیے مطابق حدیث دع ما یریبک الی ما لا یریبک ان کا استحضار نہیں کرتا۔ اور جن علماء نے حفاظت شریعت کے لیے حدودِ شرعیہ کے اندر رہ کر اقوال شیخ بلکہ شیخ پر نکیر کیا ہے۔ ان کو جب آیت لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا اور حدیث انما الاعمال بالنیات اور اس مجموعی مسلک میں اپنے کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ موافق دیکھتا ہوں۔ جیسا کہ ان کے بعض مکتوبات سے ظاہر ہے۔ البتہ مجدد صاحب میں یہ امر مزید ہے کہ وہ ان کے اقوال پر کلام بھی کرتے ہیں۔ جو بوجہ ان کے محقق و صاحب کشف ہونے کے ان کا حق ہے اور ہم یہ منصب نہیں رکھتے۔ بقول عارف رومی رح ؎

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ
برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

حسین ابن منصور

زمرۂ عشاق میں سب سے زیادہ بدنام شخصیت حسین ابن منصور حلاج

کی ہے۔ جو خود اپنے شیخ کے قول کے مطابق مردود ہے۔ ان کے متعلق حضرت تھانوی نے ایک تحقیقی رسالہ "القول المنصور فی ابن منصور" کے نام سے لکھوایا ہے۔ جس کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ:۔

"کسی غیر مقبول کے ساتھ حُسنِ ظن رکھنا مضر نہیں۔ اور مقبول سے بلاوجہ بدگمانی کرنا مضر ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی رذیل کے ساتھ شریفوں جیسا معاملہ کرنا بُرا نہیں۔ لیکن کسی شریف کے ساتھ رذیلوں جیسا برتاؤ بہت بُرا ہے۔"

اس کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایسی سخت سزا اور سنگین مصیبت کو اس درجہ صبر و استقلال کے ساتھ اور خندہ پیشانی سے تحمل کرنا نہ کسی زاہدِ خشک سے ممکن ہے نہ کسی ساحر زندیق سے اور عین اس حالت میں نشہ توحید سے سرشار ہو کر محبت و عشق الٰہی کا ایسا درد انگیز اظہار کرنا کہ مشائخ وقت بھی نعرۂ حسب الواحد افراد الواحد لہ سُن کر رقت پذیر ہو گئے اور درد انگیز حالت میں شبلیؒ جیسے امام طریقت کے سوالات کا جواب دینا ابن منصور کی جس شانِ یکتا کو ظاہر کرتا ہے زمانہ کی نگاہ نے ان کا نظارہ بہت کم کیا ہوگا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ ابن منصور کا واقعہ قتل اور سانحہ ہوش ربا ہی ان کے "سچے صوفی۔ عاشقِ فانی محبوب سُبحانی اور صاحب استقلال لاثانی ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ رہا یہ امر اس مجمع میں کسی نے بھی ان کی اس حالت استقامت اور مستی محبت درجۂ کمال سے اُن کی ولایت و معرفت پر کیوں نہ استدلال کیا؟ تو اہلِ بصیرت نے ضرور کیا ہوگا۔"

ان کی ولایت و معرفت پر کیوں نہ استدلال کیا

حضرت تھانویؒ کو چونکہ ہر وقت اپنے ہیچ ہونے کا استحضار رہتا تھا۔ اور آپ ابدیت میں فنا رہتے تھے۔ اس لیے آپ اپنے شدید ترین مخالفوں کو بھی بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کی زیادتیوں کے مقابلہ میں آپ ہمیشہ حُسنِ ظن اور تاویل سے کام لیتے تھے۔ اور آپ کی نظر عیوب پر نہیں بلکہ صفات پر رہتی تھی۔ جس کا اندازہ ذیل کے تاثرات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں

بریلویوں کے سب سے بڑے "امام" گزرے ہیں۔ جو اہلِ حق سے بے حد دُشمنی رکھتے تھے۔ اور حضرت تھانوی کے سخت ترین مخالف تھے۔ یہاں تک کہ حدودِ تہذیب سے بھی تجاوُز کر جاتے تھے۔ مگر حضرت تھانوی کی ان کی ذات اور ان کی جماعت کے متعلق یہ رائے تھی:-

"ممکن ہے ان کی مخالفت کا سبب واقعی حُبِّ رسول ہی ہو۔ اور وہ غَلط فہمی سے ہم لوگوں کو نعوذ باللہ حضور صلّی اللہ کی شان میں گستاخ سمجھتے ہوں"

یہ فرما کر آپ اپنے مخلصین کو اپنے مخالفین کی مخالفت سے باز رکھتے تھے۔ مگر ان کی طرف سے بھول کر بھی ایسی رواداری اور وسیع النظری کا کبھی مظاہرہ نہیں ہوا۔

سر سیّد احمد خاں

مسلمانوں کے مخلص خادموں میں سے گزرے ہیں جن کے خلاف عرب و عجم کے علماءِ کرام نے کُفر کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ مگر حضرت تھانوی کی نظروں میں وہ کچھ اور ہی تھے۔ اس لیے حضرت تھانوی ان کے ذکر آجانے پر

فوراً فرمایا کرتے تھے کہ :-

"عیب می جملہ بگفتی - ہنرش نیز بگو - سرسید کو مسلمانوں کے دنیوی فلاح کی بہت ہی دھن تھی - اور اس معاملہ میں بڑی دلسوزی تھی - کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اسی صفت پر فضل فرما دیں"۔

آپ اکثر سرسیدؒ کی اس صفت کے متعلق نیز بعض اکابر کے ساتھ ان کے حُسنِ عقیدت کے واقعات نقل کر کے فرمایا کرتے تھے کہ :-

"سرسیدؒ کا عقیدہ توحید و رسالت کے متعلق جس درجہ کا بھی تھا - وہ نہایت پختہ اور بلا وسوسہ تھا - جیسا کہ ان کی تصانیف سے مجھ کو اندازہ ہوا ہے - اور قرآن و حدیث میں انھوں نے جو جو تاویلات و توجیہات کی ہیں ان کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو سکے - گو یہ طرز جو انھوں نے اختیار کیا تھا - وہ غلط تھا - اس لیے میں انھیں نادان دوست کہا کرتا ہوں"۔

ان کو فاسق فاجر کہنے والوں کو آپ یہ جواب دیا کرتے تھے کہ "بعضے فاسقوں میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے - جو بڑے بڑے مشائخ میں نہیں ہوتی - لہٰذا کسی کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے"۔

اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں آپ انھیں بڑے بڑے فاسقوں اور فاجروں کے لیے ایسے واقعات سنایا کرتے تھے - جن سے ان کا عاشقِ دین ہونا ثابت ہوتا تھا - چونکہ سرسیدؒ کے خلاف فتویٰ دینے والوں نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا - اس لیے انھوں نے ٹھوکر کھائی اور اس محقق تھانوی کو ان کی رائے سے اختلاف کرنا پڑا -

مولانا محمد علی جوہر رح

مشاہیر ہند میں سے مسلمانوں کے محبوب اور مخلص رہنما تھے - مگر حضرت

تھانوی سے سخت سیاسی اختلاف رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت کی آمادگی کے باوجود یہ مسائل اختلافیہ پر حضرت سے گفتگو کرنے کے لیے بھی بخوشی آمادہ نہ ہوئے مگر حضرت تھانوی کے دل پر اس کا ذرّہ بھر ملال نہ آیا۔ بلکہ وہ بدستور حضرت کی نظر میں محبوب ہی رہے۔ جس کا اظہار حضرت نے ان کی وفات کے بعد ان الفاظ میں فرمایا:۔

"محمد علی کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بناء پر مجھے محبت ہے۔ وہ صرف ایک صفت۔ مسلمانوں کی سچّی۔ بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اس لیے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روحِ صفات سمجھتا ہوں"

(حکیم الامت ص۱۷۶)

اَرْبابِ بدْعَت

جو اربابِ بدعت حضرت تھانوی کے اس ردِّ بدعات کو برداشت نہ کرکے آپ پر کفر کے فتوے لگانے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"عُلَمَاء کے وجود کو میں دین کے بقا کے لیے اس درجہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر سارے عُلماء بھی ایسے ہی مسلک کے ہو جائیں۔ جو مجھ کو کافر کہتے ہیں۔ تب بھی میں ان کی بقاء کی دُعائیں مانگتا ہوں۔ کیونکہ گو وہ مسائل میں غلو کریں اور مجھ کو بُرا کہیں۔ لیکن وہ تعلیم تو قرآن وحدیث ہی کی دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے دین تو قائم ہے۔ میں ان کو دہریئے مدعیانِ اسلام کے مقابلہ میں ہزار درجہ غنیمت سمجھتا ہوں۔ جو سرے سے دین کو اڑانا چاہتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ اس وسعت رائے

میں میری کوئی ذاتی مصلحت نہیں۔ بلکہ اس کا منشاء محض حفظ حدود ہے"

پیرانِ زر

دُنیائے تصوّف میں ایسے "پیرانِ پارسا" کی بھی کمی نہیں جنھوں نے تصوف کی "دکانیں" کھول رکھی ہیں۔ اور جن کا مقصودِ حیات صرف لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔ ان کے متعلق حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ :-

"ان کھاؤ کماؤ پیروں پر بھی مجھے رحم ہی آیا کرتا ہے کہ بیچارے اور تو کسی کام کے نہیں۔ آخر کیا کریں۔ پیٹ تو پالنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں کھانے پینے کو دے رکھا ہے۔ ورنہ اگر کھانے پینے کو نہ ملتا۔ تو خدا جانے ہم بھی کس حال میں ہوتے۔ اور ہماری نیت بھی کیسی ہو جاتی۔ یہ استغنا بھی پیٹ بھرنے کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ابتلاء و امتحان سے محفوظ رکھے۔ گو عقلاً و اعتقاداً میں ان کے طریقہ کو بُرا سمجھتا ہوں۔ لیکن طبعًا ان پر رحم بھی آتا ہے۔ جس کا یہ اثر ہے کہ بجائے صرف غصہ آنے کے بناء بر ترحم ان کی اصلاح و ہدایت کے لیے دُعا بھی دل سے نکلتی ہے۔

اسی طرح باوجود بھک منگوں کے پیشہ سے نفرت ہونے کے ان کی یہ صفت پسند ہے کہ بیچارے سب کے لیے ہر حال میں دُعا گو ہیں۔ اور سوائے مانگنے کے اور کسی فتنہ انگیزی۔ شور و شر یا فرقہ بندی میں شامل نہیں۔ بس اپنے بھیک مانگنے سے کام ہے۔

اسی طرح گو کفار پر اعتقاداً اور ایک کافی حد تک طبعًا

بھی غصّہ ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ تکوینی حیثیت سے اس میں بھی حکمتیں ہیں۔ غیظ طبعی میں اعتدال رہتا ہے"۔

تحقیق و اعتدلال کا یہ درجہ بھلا کسے نصیب!

اربابِ علم و فکر

بصیرت محض مطالعہ سے پیدا نہیں ہوا کرتی۔ اس کے لیے اہل اللہ کی صحبت بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس وقت جو نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے ہیں وہ سب اس بصیرت کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کے بانی تمام تر وہی مفکرّین ہیں۔ جنھوں نے کسی صاحبِ علم و نظر کے سامنے زانوئے اُدب تہہ نہیں کیے۔ بلکہ صرف کتابی مطالعہ ہی ان کے علم و فکر کا منبع و مآخذ ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی نظر میں وسعت تو پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر عمق پیدا نہیں ہوتا اس لیے حضرت فرماتے تھے کہ:-

"آج کل رسالوں کے باعث لوگوں میں کتب بینی کا مذاق بہت پھیل گیا ہے۔ اور معمولی طالب علم بھی خوب خوب کتابیں پڑھنے لگے ہیں۔ لیکن نظر کی وسعت نے نظر کے عمق کو غارت کر دیا ہے۔ لوگوں کی نظریں پھیلی ہوئی تو بہت ملتی ہیں لیکن گہری نلیند نہیں ہوتیں۔ صرف سطح پر رہتی ہیں۔ اپنے مضامین اور مقالات میں حوالے تو خوب دے دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یوں لکھا ہے لیکن فہم مسائل کی استعداد نہیں ہوتیں۔ صرف سطح پر رہتی ہیں۔

سمندر سے موتی وہی نکال کر لا سکتے ہیں۔ جو گہری غواصی کر سکتے ہیں۔ محض سطح سمندر پر دو رنگ پیرتے ہوئے چلے جانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اگلے علماء مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت ہی کم تھا۔ لیکن نکتے کیسے کیسے ان حضرات نے پیدا کیے"۔

(حکیم الامّت ص ۳۰۰)

جو "مفکرین" فقہاء وصوفیاء کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے ہیں ۔ وہ سب ظاہر بین ہیں ان کی نظر میں گو وسعت ہے مگر عمق نہیں ۔ بصیرت کے فقدان کے ساتھ ان کی آنکھوں پر خود بینی کی عینک بھی چڑھی ہوئی ہے ۔ اور ان کے دلوں میں خود غرضی اور ہوس اقتدار کار فرما ہے ۔ جس کی وجہ سے وہ ان حضرات کے مقالات کو نہیں پہچان سکتے ۔ جن کے متعلق حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ :۔

فقہاء وصوفیاء

"میرے دل میں حضرات صوفیہ کا تو ادب بڑے بھائی کا سا ہے اور حضرات فقہا کا ادب باپ کا سا ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی حضرات صوفیاء کے ساتھ چھوٹے بچے کا سا معلوم ہوتا ہے ۔ اور حضرات فقہاء کے ساتھ بڑے لڑکے کا سا ۔ کہ حرکتیں تو بچے کی اچھی معلوم ہوتی ہیں ۔ اور اس کو بہت سی باتوں میں غیر مکلف سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن کام بڑے لڑکے سے ہی لیا جاتا ہے ۔

یہ فقہا در حقیقت اُمّت کے عقلاً اور ملّت کے حکماء ہوتے ہیں ۔ نظم ملّت انہی کے دم سے وابستہ ہے ۔ اُنھوں نے اگر کتاب وسنّت کی روشنی میں عقلی ۔ منطقی قاعدوں کے ماتحت اور فطرت بشری کے روزانہ تجربوں کی مدد سے اتنے جزئیات ہر شعبۂ زندگی کے متعلق نہ مرتب کر دیئے ہوتے تو آج ہم لوگ خدا معلوم کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہوتے ۔ اور اُمّت منتشر ہو کر کیسی کیسی گمراہیوں میں بٹ چکی ہوتی ۔ فقہا وصوفیاء دونوں درحقیقت اسلام کی فوج کے اہم بازو ہیں رہے ان کے " بدنام

کنندہ نکو نامے چند" تو ظاہر ہے کہ کس گروہ میں ایسے لوگ نہیں ہوتے یا نہیں ہو سکتے۔ رائے ہر گروہ کے بہترین ہی نمائندوں سے قائم کرنی چاہیئے۔ نہ کہ ان کے بدترین نمائندوں کو دیکھ کر۔"

(حکیم الامّت صـ ۸۸)

عُلَمَاءِ کرام

بعض تعلیم یافتہ فتنہ پرداز علماء کرام کی عزت و عظمت پر ہاتھ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور اس طرح وہ اسلام کی بیخ کنی کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ بقول حضرت تھانوی:-

"صوفیاء سے زیادہ علماء کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انہی کی بدولت انتظام دین قائم ہے۔ ورنہ کسی کو احکام دین اور اُن کے حدود کا ہی پتہ نہ چلے۔ درویشی تو اس کے بعد کی چیز ہے۔ میرے قلب میں محبت تو درویشوں کی زیادہ ہے۔ مگر عظمت علماء کی ہے۔"

اہل حدیث

بعض ارباب غرض ذاتی یا سیاسی ضرورتوں کے ماتحت اکثر مقلد و غیر مقلد کے مباحثے و مناظرے کرا کر فضا کو خراب کرتے رہتے ہیں۔ اور بعض تنگ نظر حضرات اہلحدیث کو اچھی نظر سے نہ دیکھنے کے عادی ہیں۔ مگر حضرت تھانوی اہلحدیث حضرات کو بُرا نہ کہتے تھے۔ بلکہ بعض شرائط کے ماتحت انہیں بیعت بھی کر لیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ:-

"اگر یہ بدگمانی اور بدزبانی نہ کریں۔ تو خیر یہ بھی سلف کا ایک طریق ہے گو خلف کا قیاس سلف پر اس باب میں مع الفارق ہے۔

مجھ سے متعدد غیر مقلد بیعت بھی ہیں۔ مَیں اس میں سخت نہیں ہوں۔ انھیں بھی بیعت کر لیتا ہوں۔ بشرطیکہ تقلید کو جائز سمجھتے ہوں۔ گو واجب نہ سمجھتے ہوں۔ مگر معصیت بھی نہ سمجھتے ہوں۔ لیکن جس کو دل ملنا کہتے ہیں۔ وہ باوجود قلب کو متوجہ کرنے کے بھی نہیں ہوتا۔ ان کی نیکی میں شک نہیں۔ لیکن نیکی بدرجۂ محبوبیت نہیں۔ کیونکہ ان حضرات میں عموماً ادب کی کمی ہوتی ہے۔ بلیباک ہوتے ہیں۔ اور تقویٰ کا اہتمام بھی بہت کم کرتے ہیں۔ جس سے ایک گونہ انقباض ہوتا ہے۔"

جماعتِ اسلامی

سیاسی اغراض کے لیے اسلام اور قرآن کے نام پر نشوونما پانے والے فتنوں کی داغ بیل حضرت تھانوی کے زمانہ میں ہی پڑ چکی تھی۔ اگرچہ حق تعالےٰ نے آپ کو ان کے مہلک اثرات دیکھنے سے قبل اُٹھا لیا تھا۔ مگر آپ کی نظرِ فراست سے اُن کی فتنہ سامانیاں اوجھل نہ تھیں۔

مودودیت کا صالح فتنہ آپ کے زمانہ میں ہی پر پرزے نکال چکا تھا۔ حامیانِ دینِ متین اور شیدایانِ اسلام کے لیے یہ بڑی کشش کا باعث بن رہا تھا۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی "دینی خدمات" کو بہت سراہا جا رہا تھا۔ اور ظاہر بین اور خوش فہم لوگوں نے ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔

لکھنؤ کے مشہور ماہنامہ "اَلْفُرْقَان" کے ایڈیٹر اور جماعت اسلامی کے سابق رکن مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے مودودی صاحب کی تحریک اسلامی میں شرکت اور اس کے موافقِ شریعت ہونے کے متعلق گفتگو کرنے

کے لیے حضرت کی خدمت میں بریلی سے آنا چاہا۔ اور اجازت چاہی۔ تو حضرت نے صاف لکھ دیا کہ :۔

" اگرچہ کوئی اعتراض شرعی لحاظ سے بظاہر نہ وارد کیا جا سکے۔ لیکن میرا دل اس تحریک کو قبول نہیں کرتا۔ یہ ہی زبانی بھی عرض کر دوں گا۔ لہٰذا اس ضرورت کے لیے زحمتِ سفر نہ فرمائی جاوے۔" (خاتمۃ السوانح ص۲۴)

اس صاحبِ قال کو کیا علم تھا کہ " قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید" چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا موصوف اس تحریک میں شریک رہ کر اور اس میں قابل اعتراض اُمور کا خود مشاہدہ کر کے ذاتی تجربہ کے بعد اس سے الگ ہو گئے اور بزبانِ حال اعتراف کر لیا کہ :۔

اتّقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ

ان کی علیحدگی کی خبر سُن کر خود ہم نے بھی انہیں اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے خط لکھا کہ کیا آپ اس جماعت کے امیر میں روحانیت کی بجائے انانیت دیکھ کر تو علیٰحدہ نہیں ہوئے تو مولانا موصوف نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۷ شوال المکرم ۱۳۶۴ھ میں لکھا کہ :۔

محترمی سلام مسنون

" جماعتِ اسلامی کے نظام سے میری علیٰحدگی کے بارہ میں آپ کا فکر ایک حد تک صحیح ہے۔" محمد منظور نعمانی

اس واقعہ کے دس بارہ سال بعد ہونے والے واقعات نے بھی حضرت کے ارشاد کی حرف بحرف تائید کر دی۔ جس سے اخبار بین طبقہ بخوبی واقف ہے۔ غرضیکہ ذکر و فکر میں بھی حضرت تھانوی کے ہاتھ سے اعتدال کا دامن نہیں چھوٹتا تھا۔"

تخیلِ پاکستان

داستانِ پاکستان

پاکستان کے لفظ سے دنیا پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں چودھری رحمت علی ہوشیارپوری کی زبانی آشنا ہوئی۔ جبکہ چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصّہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال علامہ اقبالؒ نے مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں ظاہر کیا۔ جس کا ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں ملّی نصب العین کے طور پر ایک قرارداد کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ مگر علامہ اقبالؒ کے خطبہ اور لاہور قرارداد میں لفظِ پاکستان کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اسے ہندو اور برطانوی پریس نے تمسخر و استہزاء کے طور پر اچھالا۔ جو قائد اعظم کی کوششوں سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو حقیقت بن کر منصّۂ شہود پر آگیا۔

تاریخی مغالطہ

اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے متذکرہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا۔ بالکل وہی خیال ان سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجلسِ عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے۔ بلکہ

اس کا مکمّل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔ جون ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (جو ابتداً کانگرس کے بہت بڑے حامی تھے) کے معتمد خاص بلکہ دست راست حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلم کے مرید باتمیز مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ اور اپنی اس اوّلین ملاقات کا حال اپنی کتاب "نقوش و تاثرات" میں ان الفاظ میں درج کیا:۔

"۱۹۲۸ء تھا۔ اور مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائرکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اپنی گفتگو معقولیّت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت گورنمنٹی آدمی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا بے جانے۔ بہر حال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرت ملّی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیّل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑی۔ بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتّفاق نہ تھا لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفسِ مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلو خلاصی اور دار السلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی۔ وہ اس کے "کافرانہ" ہونے کی بنا پر تھی۔ نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر"۔ (نقوش و تاثرات ص۲۳)

یہ اعتراف دانکشاف ہندوستان کے اس مردِ مجاہد کا ہے۔ جو شروع شروع میں سیاسی لحاظ سے حضرت تھانوی کے ہم خیال نہ تھے۔ بلکہ کانگرس کی حامی جماعت سے تعلّق رکھتے تھے۔ اور آج ارباب کانگرس کو بالخصوص اور عام دنیا کو بالعموم "سچی باتیں" سنانے میں ہندوپاکستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ممکن ہے آپ کے لیے ان کا یہ انکشاف موجبِ حیرت ہو۔ کیونکہ یہ بات علاّمہ اقبالؒ کے اظہار کے پورے پچیس سال بعد منظرِ عام پر لائی جا رہی ہے مگر کسی بات کا علم نہ آنا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ اور نہ واقعات انسان کی طرح جھوٹ بول سکتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کو عقیدت کے پردہ میں زیادہ دیر تک چھپایا جاسکتا ہے۔

حضرت تھانویؒ ان "رہنماؤں" میں سے نہ تھے جو اپنی "ملکی و ملّی خدمات" اور اپنے حقیقت افروز بیانات" اخبارات میں شائع کرانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ایک ایسے رہنما اور مصلح تھے۔ جو انبیائی طریق پر نہایت خاموشی کے ساتھ اصلاحِ اُمّت اور خدمتِ خلق میں مصروف تھے۔ جو ایسی خدمات کا اظہار نمود و نمائش اور ریا میں داخل سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے وہ اپنی سوانح حیات کا لکھا جانا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ جس کی تفصیل "سیرت کی صورت" میں آچکی ہے۔ مؤرخِ اسلام علاّمہ سیّد سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں :-

"یہ مردِ درویش ایک پُرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہُوا۔ مسلمانوں کے سارے احوال اور اُن کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے

یں مصروف تھا اس نے پوری زندگی اس امر میں صرف کردی کہ مسلم کی تصویر حیات کو اس خبلیہ کے مطابق بنا دے۔ جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔" (جامع المجددین ص ۲۸)

بنائے پاکستان

مفکّرِ اسلام علاّمہ اقبال کی لوگوں کے دلوں میں عظمت ان کی اسلام آموز شاعری کی وجہ سے ہے مگر ہمارے دل میں ان کی عزّت اس نورِ معرفت کی وجہ سے ہے جو ان کی شاعری کی رُوح ہے اور جسے وہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اور اسی پر اُنھوں نے اپنے نظریۂ پاکستان کی بُنیاد رکھی ہے۔ وہ اپنے مذکور الصدر تاریخی خطبہ صدارت میں لگی لپٹی رکھے بغیر اس بات کا صاف طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ:۔

"اسلام پر ابتلاء و آزمائش کا کبھی ایسا وقت نہیں آیا۔ جیسا کہ آج درپیش ہے۔"

اِسی ابتلاء کے وہ دو سبب بتاتے ہیں:۔

الف۔ "ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کا وجود نہیں۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ اردن کی تشخیص بالکل صحیح تھی۔ جب اُنھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ملّتِ اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا"۔ رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں۔ جن کی اعانت ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کرسکیں۔ یہی لوگ ہیں۔ جن پر کسی قوم کی قوّتِ عمل کا انحصار ہوتا ہے۔

ب۔ دُوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے۔ یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

اِس ابتلاء سے بچنے کی وہ یہ صورت بتلاتے ہیں:۔

"مسلمانانِ ہند اس وقت اپنی زندگی کے نازک دَور میں سے گزر رہے ہیں۔ اس کے لیے کامل تنظیم اور اتّحادِ عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے (کیونکہ) ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے۔ یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیّل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

اِسی لیے وہ اکابر قوم کو دعوت دیتے ہیں کہ:۔

"تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں۔ فرض ہوگا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور صرف قرار دادیں منظور نہ کریں۔ بلکہ اپنے مقاصد میں کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں کے لیے کوئی راہِ عمل پیش کریں۔"

تاکہ قوم کو اس دورِ ابتلا و آزمائش سے نکالا جائے۔

راہِ عمل

دیکھنا یہ ہے کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء سے قبل کسی دوسرے رہنما کو بھی انہی حالات

کا احساس ہوا اور اس نے قوم کے سامنے کوئی ایسی راہ عمل پیش کی جس کے لیے علامہ اقبالؒ نے اکابر قوم کو دعوت دی تھی۔ اس سوال کا جواب ہمیں حضرت تھانوی کے ایک ملفوظ اور ایک مکتوب سے ملتا ہے۔

عین اس زمانہ میں جبکہ جنگِ پاکستان شباب پر تھی اور اطراف و اکنافِ ہند سے روزانہ دربارِ اشرفیہ میں لیگی اور غیر لیگی حضرات کی طرف سے رہنمائی کی درخواستیں پہنچ رہی تھیں۔ حضرت تھانوی سے سوال کیا گیا۔ وہ کون سے اسباب ہیں کہ جن کو اختیار کرنے سے مسلمان موجودہ پستی اور تنزّل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"بفضلہ تعالیٰ ایسی تدابیر موجود ہیں اور ان کو ضبط کر کے رفاہِ عام کے لیے شائع بھی کر دیا گیا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے مسلمانوں کی موجودہ تباہی و بربادی سے بے چین ہو کر دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن میں سے ایک کا نام .... صیانۃ المسلمین ہے اور دوسری کا نام حیات المسلمین۔ ان دو کتابوں کے اندر میں نے ان مصائب کا جو اس وقت مسلمانوں پر آ رہے ہیں۔ پورا پورا علاج کر دیا ہے۔ مسلمان پہلے ان ہی دو کتابوں پر پورا پورا عمل کر کے دیکھیں کہ ان کو کتنا نفع ہوتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ عمل تو کرتے نہیں۔ پس شکایت کرتے ہیں کہ علماء ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہماری رہبری نہیں کرتے۔"

(ملفوظ نمبر ۳۰ از ملفوظات حصہ ششم)

مسلم لیگ کا دعوت نامہ

۲۲ تا ۲۶، اپریل ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا دہلی میں اجلاس شروع

ہونے والا تھا۔ اس تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے ارکانِ مسلم لیگ نے حضرت تھانوی کی خدمت میں ایک خصوصی دعوت نامہ بھیجا تاکہ آپ آکر ہمیں ہدایات دیں۔ جس کے الفاظ یہ تھے :۔

"آپ اس موقع پر خود دہلی تشریف لاکر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت دیں تو بہتر ہو۔ لیکن اگر حضور تشریف نہ لا سکیں۔ تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرمادیں اور دعا فرماویں کہ اللہ پاک اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دلوں کو مسحور کردے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوادے۔ تاکہ سلطنت اسلامی قائم ہوسکے۔" الخ (خاتمۃ السوانح صـ۸۵)

حضرت تھانویؒ کی وفات سے تین ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ جبکہ آپ ضعف اور مرض کی شدت میں مبتلا تھے۔ اس لیے بہ امر مجبوری آپ نے شرکت اجلاس سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے ان کو یہ تاریخی خط لکھا :۔

حضرت تھانوی کا جواب

از ناکارہ۔ آوارہ۔ ننگِ انام۔ اشرف برائے نام

بخدمت ارکان مسلم لیگ نصرہم اللہ ونضرہم اللہ

"السلام علیکم۔ لیگ کے عزائم معلوم کرکے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلك فلیفرحوا لیکن اس کے ساتھ ہی عذر نہ ہوتا۔ تو اس آیت پر بھی عمل ہوتا۔ انفروا[1] خفافا و ثقالا لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر

---

[1] (جہاد کے لیے) نکل پڑو تھوڑے سامان سے (خواہ) زیادہ سامان سے۔

پر عمل کی اجازت مل گئی۔ لیس[1] علی الضعفآء ولا علی المرتضٰی ولا علی الذین لا یجدون ما ینفقون حرج اذا نصحوا للّٰہ ورسولہٗ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہو گیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں۔ جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے پیامِ عمل ہے۔ ایک حیات المسلمین۔ شخصی اصلاح کے لیے۔ دوسری صیانۃ المسلمین۔ جمہوری نظام کے لیے۔ ان کے مضامین اپنے موضوع میں گو رنگین نہیں مگر سنگین ہیں۔ جن میں وہی فرق ہے جو ذوق و غالب کے اشعار میں اور حکیم محمود خاں۔ حکیم محمد صادق خاں کے نسخوں میں۔ اور نمائندہ وہ کام نہیں کر سکتا۔ جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں مگر عمل شرط ہے۔ جیسے اعلیٰ درجہ کا ماء اللحم بوتلوں میں بھرا ہوا قیمتی ہے۔ مگر نتیجہ خیز نہیں۔ اس کا نفع اس وقت ظاہر ہو گا۔ جب حلق سے اُترے گا۔ ورنہ بدوں عمل یہ سب کوششیں اس کا مصداق ہوں گی۔ نشستند و گفتند و برخاستند۔ باقی دُعا ہر حال میں خصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا۔ بقول کسی شاعر کے ؎

لا خیل[2] عندك تهديها ولا مال
فليسعد النطق ان لم يسعد الحال

---

[1] کہ ناتوانوں اور بیماروں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ ان لوگوں پر جن کو خرچ کو میسر نہیں۔ جبکہ یہ لوگ اللہ اور رسول ؐ کے ساتھ خلوص رکھیں۔

[2] یعنی تیرے پاس امداد کرنے کے لیے نہ گھوڑے ہیں نہ مال ہے ایسی حالت میں تیری زبان (نطق) تو کام دیتی ہے

نوٹ:۔ یہ دونوں کتابیں اگر یہاں مل گئیں۔ تو ۲۲ اپریل کو ڈاک سے ہدیتہً روانہ کردوں گا۔ ورنہ دہلی کے کسی کتب خانہ تجارتی سے تلاش کی جائیں۔ والسلام

بعد تحقیق معلوم ہوا کہ حیاۃ المسلمین بلاقیمت جاسکتی ہے۔ سو اس کا نسخہ روانہ کر رہا ہوں نیز یہ معلوم ہوا کہ صیانۃ المسلمین یہاں نہیں ہے لہذا وہاں تلاش کرائی جائے۔"

احقر اشرف علی تھانہ بھون (بحوالہ صدر)

یہ دونوں کتابیں اسی دعوت کی داعی ہیں جو حضرت تھانویؒ نے مسلم لیگ کو ۱۹۳۸ء میں اپنے پیغام میں دی تھی کہ:۔

"جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی۔ مسلمانوں کو بجز خدا کے کسی کی امداد کی ضرورت نہیں۔ اور امدادِ الٰہی کی شرط احکامِ الٰہی کی پابندی ہے جس کا سیکڑوں برس تک تجربہ کیا جاچکا ہے۔ جب تک مسلمان سچ مچ مذہبی دیوانے بنے رہے۔ دنیا ان کی جوتیوں سے لگی رہی اور جوں جوں اس میں کمی آتی گئی۔ مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے۔" (آثار رحمت ص۱۰۹)

وحدتِ خیال

ارباب مسلم لیگ نے اسلامی سلطنت قائم کرنے کے سلسلہ میں حضرت تھانوی نے جو ہدایات طلب کیں۔ ان کے جواب میں حضرت تھانوی اپنی دو مذکورہ الصدر کتابیں پیش کرتے ہیں۔ جو

الف۔ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے پیامِ عمل ہیں۔ اور

ب۔ جن میں وہ راہِ عمل مذکور ہے۔ جس کے متعین کرنے کے لیے علامہ اقبالؒ نے ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کو اکابر قوم کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔

ج۔ جو انھی حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔ جن کا علامہ اقبال نے مذکورا بالا تاریخ کو لیگ کے تاریخی اجلاس میں اظہار کیا تھا۔ جیسا کہ ان کتابوں کے دیباچوں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

حیواۃ المسلمین کے دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں :۔

"اس وقت مسلمانوں پر عالم میں عموماً اور کشور ہند میں خصوصاً مصیبتوں پر مصیبتیں اور بلاؤں پر بلائیں نازل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مگر نہ ان کی طرف ان کے ذہن کو مطلق التفات ہوتا ہے نہ ان کی زبان پر اس کا نام آتا ہے۔ نہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلتا ہے۔ اگر کسی کو علاج و تدبیر کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ تو وہ نسخے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن کے متعلق بے تکلف یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ مرض کے خلاف ہوتے ہیں۔ جو مزاج میں برائے درستی کے نادرستی پیدا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان مصاحب کی تشخیص میں ان کو نصوص الٰہیہ و نبویہ (قرآن و حدیث) کی پوری تصدیق نہیں ہوتی۔"

صیانۃ المسلمین کے شروع میں درج ہے کہ

"ہمارے بھائیوں میں اجتماع۔ اتفاق۔ تنظیم قریب قریب مفقود ہے۔ اس لیے ہر مسلمان بجائے خود اپنے کو تنہا دیکھ کر اپنے ضعف سے پریشان ہے۔ ورنہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہلِ حق کی پریشانی کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا اور اگر کہیں برائے نام تنظیم ہے تو اس سے محض اغراض دنیویہ مقصود ہیں۔ بلکہ اکثر تو دین کو ان اغراض

میں مخل سمجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں ان میں دو طریق مشروع ہیں۔ ایک ضعفاء کے لیے کہ سکوت محض سے کام لیں۔ نہ حفاظت کا کوئی سامان کریں۔ نہ مدافعت کا اہتمام کریں۔ دوسرا اقریاء کے لیے کہ حفاظت و مدافعت کی تدبیر کریں اپنے لیے بھی اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے بھی۔"

اِسی زمانہ اشاعتِ صیانۃ المسلمین میں آپ نے فرمایا:۔

"کانگرس ایک منظم جماعت ہے اور اہلِ حق کی کوئی منظم جماعت نہیں۔ ہر شخص تنہا ہے اس لیے ہر شخص خوف زدہ ہے ضرورت اس کی ہے کہ اہل حق کے اندر ایک جماعت ایسی منظم ہو جو ان ظالموں (ہندوؤں) کو دفع کر سکے (کیونکہ) ان لوگوں کی اتنی جرأت بڑھ گئی ہے کہ بعض مقامات پر مسلمانوں پر یہ لوگ چڑھ آئے ہیں۔ اور حملہ کر دیا۔ حالانکہ مسلمان کا کوئی قصور نہ تھا بیچارے مسلمان حیران و پریشان تھے اور کچھ نہ کر سکے۔ اس لیے مسلمانوں کو ضرور اپنی حفاظت کا سامان کرنا چاہیے۔ ورنہ ان لوگوں کی جرأت "بڑھ گئی۔ تو پھر مسلمانوں کا جان و مال سب خطرہ میں ہے مگر اب مشکل یہ ہے کہ ایسی منظم جماعت آئے کہاں سے ۔" (جمہوری نظام ص۲۵-۲۶)

حیاۃ المسلمین اور صیانۃ المسلمین کی ان وجوہِ تصنیف کو اگر علامہ اقبالؒ کے ان ارشادات کے آئینہ میں دیکھا جائے جو شروع میں نقل کیے گئے ہیں۔ تو یہ دونوں حکمائے اُمّت تشخیص مرض اور تجویز علاج میں متفق اللسان نظر آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت تھانویؒ جن خطوط پر مسلمانوں کی بہبودی اور مستقبل کے متعلق راہِ عمل تجویز کر چکے تھے۔ اس کی طرف

علّامہ اقبالؒ کا ذہن بعد میں کارفرما ہُوا۔

اس مرحلہ پر یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حضرت تھانوی جن خطرات کو جولائی ۱۹۳۰ء میں دیکھ رہے ہیں۔ قوم نے ان کا خونیں نظّارہ پورے سترہ سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ع

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

شرفِ اوّلیت

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنی جن دو کتابوں کو حصولِ پاکستان اور بقائے پاکستان کے لیے بطورِ رہِ عمل میں پیش کیا ہے۔ وہ کب منظرِ عام پر آئیں۔

ملکی اور ملّی حالات کے برسوں مشاہدہ اور جائزہ کے بعد حضرت تھانویؒ نے مسلمانوں کی شخصی اصلاح کے لیے وسط ۱۹۲۵ء سے حیاۃ المسلمین لکھنی شروع کی جو اڑھائی سال میں لکھی گئی۔ اور مورخہ ۲۷، نومبر ۱۹۲۷ء کو جیساکہ اس کے دیباچہ کی تاریخ سے ظاہر ہے) مکمّل ہو کر ۱۹۲۸ء کے آغاز میں شائع ہوئی۔ صیانۃ المسلمین" جو جمہوری نظام کے متعلق تھی۔ جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ جیساکہ اس کے اختتامی نوٹ کی تاریخ سے ظاہر ہے۔

یہ تاریخیں صاف بتلا رہی ہیں کہ جن مصائب کا علاج حضرت تھانوی ۱۹۲۸ء یا جولائی ۱۹۳۰ء میں تجویز فرما چکے تھے انھی مصائب کا علاج سوچنے کے لیے علّامہ اقبالؒ ۲۹، دسمبر ۱۹۳۰ء کو اکابرِ قوم کو دعوت دے رہے تھے۔

نظامِ پاکستان کا خاکہ

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت تھانویؒ بھی ویسا ہی

ہی نظامِ پاکستان چاہتے تھے۔ جس کا نقشہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ نے اپنے خطبات و اعلانات میں پیش کیا تھا اور جس کا قوم آج تک مطالبہ کر رہی ہے۔

اس سوال کا جواب حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کی اس اوّلین ملاقات کی تفصیل سے ملتا ہے جو انھوں نے جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانوی سے کی اور جس کے ضمن میں انھوں نے لکھا کہ:-

"پاکستان کا تخیّل خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔"
(نقوش و تاثرات ص۲۳)

ہماری درخواست پر اس "بالکل صاف جزو" کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا دریا بادی اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۵۵ء میں لکھتے ہیں کہ:-

"حضرتؒ کو بعض معاصر علماء کی طرح "جنگ آزادی"، "جنگِ حقوق"، "آزادی وطن" وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں۔ تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی۔ تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطّہ پر خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکامِ شریعت کے مطابق ہو بیت المال ہو۔ نظامِ زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علیٰ ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے۔ اور اسی کو یہ

کوشش کرنی چاہیئے۔

گویا دربار اشرفیہ میں حصول و بقا پاکستان کا لائحہ عمل اور نظامِ پاکستان کا پورا نقشہ اس وقت پیش ہوا۔ جبکہ پاکستان چاہنے والوں کو ابھی اس کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنے دار الاسلام کا جو نقشہ پیش کیا تھا۔ قائد اعظم بھی اسی کے مطابق نظامِ پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائد اعظم جب حیدر آباد تشریف لے گئے۔ تو ان سے "اسلامی حکومت" کی وضاحت چاہی گئی۔ انھوں نے اس سوال کے جواب میں نوجوان طلباء کو بتایا کہ :-

"اسلامی حکومت کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لیے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی و پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے"

(حیات قائد اعظم ص۴۲۸)

غرضیکہ

۱۔ انہی اصولوں پر قائد اعظم نے پاکستان کی جنگ لڑی۔

۲۔ انہی اصولوں کی حکومت کے لیے قوم نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ جو جنگِ پاکستان کے ہر مرحلہ پر پوچھتی تھی کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ تو اسے جواب دیا جاتا تھا۔ لا الہ الا اللہ۔

۳۔ انہی اصولوں کے مطابق (دربارِ اشرفیہ کے فیض یافتہ) شیخ الاسلام

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی کوششوں سے "قرارداد مقاصد" پاس ہوئی۔

۴۔ انہی اصولوں پر مجلس دستور ساز نے نظامِ مملکت کی بنیاد رکھی کہ آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا۔ جو کتاب وسنّت کے خلاف ہو۔ اور

۵۔ انہی اصولوں کی تعلیم مجلس دستور ساز نے مملکت کے مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دی تھی اور

۶۔ انہی اصولوں پر چلنے میں پاکستان کے بقا کا راز مضمر ہے۔

عملی جدّوجہد

حضرت تھانویؒ نے حصولِ پاکستان کے لیے راہِ عمل یا نظامِ پاکستان کا خاکہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہ فرمایا تھا۔ بلکہ اس کے لیے عمل جدوجہد بھی اُسی زمانہ سے شروع کردی تھی۔

۱۔ سب سے پہلے آپ نے ہی ہندوستان میں اسلامی قوانین رائج کرنے کی مہم شروع کی تھی جس کی تفصیل آپ کو "آئینی سرگرمیوں" کے باب میں ملے گی۔

۲۔ سب سے پہلے کانگریس کے خلاف اور مسلم لیگ کی حمایت میں جماعت علماء میں سے دربار اشرفیہ ہی سے اعلان جاری ہوا۔ جس کی تفصیل آپ کو "سیاسی کشمکش" کے باب میں ملے گی۔

۳۔ سب سے پہلے حضرت تھانویؒ نے مسلم لیگ کی تطہیر اور قائد اعظمؒ میں تدیّن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جس کی تفصیل اگلے باب میں ملے گی۔ اور

۴۔ سب سے پہلے حصولِ پاکستان کے لیے جہاد کی تیاری بھی حضرت تھانوی نے فرمائی جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جہاد کی تیاّری

حضرت مولانا جلیل احمد صاحب علی گڑھیؒ لکھتے ہیں کہ :۔

"احقر بعونہ تعالیٰ تقریباً تیرہ چودہ سال مستقل طور پر محی السنت حکیم الامت مجدد الملت مرشدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ' کے دربار گہر بار میں رہا اس عرصہ میں احقر نے وقتاً فوقتاً خود اس کا مشاہدہ کیا کہ جب مسلمانوں پر کفار کے ظلم و ستم کا بیان ہوتا۔ تو حضرت حکیم امت ؒ پر ایک خاص کیفیت کا ورود و مشاہدہ کیا جاتا۔ آنکھیں سرخ نظر آنے لگتیں۔ اور حاضر باش کو بداہتًہ محسوس ہوتا تھا کہ حضرت بے چینی کے ساتھ کسی چیز کے متمنی اور کسی وقت کے منتظر ہیں۔ ایک بار قرب و جوار کے ایک مسلمان نے اپنی کسی مستعدی کا اظہار کیا۔ مسکرا کر فرمایا کہ اچھا اگر ضرورت ہوئی۔ تو تم سے جہاد کا کام لیں گے۔ اسی طرح ایک بار صوبہ سرحد کے ایک والی ریاست نے دوستانہ تعلقات کو وسیع کرنا چاہا۔ تو حضرت نے اس سے عذر فرمایا۔ مگر یہ بھی فرمایا کہ ہاں وقت آئے گا۔ تو آپ سے جہاد کا کام لیا جائیگا۔"

(آثار رحمت صہ۱۰۷)

مرکز اور امام کی ضرورت

جہاد خواہ کسی نوع کا ہو۔ اس کے لیے مرکز اور امیر کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ جس کے لیے حضرت تھانوی ؒ بڑے متفکر تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جب مسلم لیگ کے نام آپ کے تاریخی پیغام کا مسودہ تیار کیا گیا تو مسودہ تیار کرنے والے مولوی صاحب نے اس میں ایک یہ فقرہ بھی لکھ دیا تھا کہ لوگوں کو جب نماز روزہ کی ترغیب دی جاتی ہے۔ تو یورپ زدہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کیا ہو سکتا ہے تو اس فقرہ کی تصحیح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی سے کیا دخل ہے۔ اسی

طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لیے کافی ہے۔ بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتالِ جہاد ہے۔ کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہؓ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے۔ لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی۔ قتال ہُوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اُٹھا کر دیکھ لو۔ کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہُوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت نماز روزہ اور اطاعت ہو گی۔ تو غلبہ ہو گا۔ اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے۔ اور جہاد فرض کفایہ ہے۔ مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال نہ ہو گا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسّر نہیں ہو سکتی۔ اور جہاد کے لیے مرکز ضروری ہے۔ لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المؤمنین ہو اور جس کو امیر المومنین بنایا جائے۔ اس کے اندر تین صفات ہوں۔ ایک تدیّن یعنی وہ دین دار ہو۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس

کے اندر ہمّت ہو۔ اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔"

(آثارِ رحمت صہ ۱۰۴)

چونکہ قائدِ اعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمّت بھی۔ اس لیے آپ نے ان میں تدین پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی۔ تاکہ وہ ان تمام ضروری صفات سے متصف ہو جائیں جو ایک امیر المومنین کے لیے ضروری ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی یہ تمام جدّوجہد ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس کے اندر قرارداد پاکستان پاس کرنے سے پہلے کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ نے نہ صرف سب سے پہلے پاکستان کا تخیّل پیش کیا۔ بلکہ اس کے حصول کے لیے عملی جدّوجہد کرنے والوں میں بھی آپ کا درجہ السابقون الاوّلون کا ہے۔

اِصلاحِ معمارِ پاکستان

احساسِ تبلیغ

حضرت تھانویؒ کو جنھوں نے سب سے پہلے نظریۂ پاکستان پیش کیا تھا۔ فراستہً معلوم ہو گیا تھا کہ پاکستان ایک نہ ایک دن معرضِ وجود میں آ کر رہے گا۔ جس کے حصول کا سہرا قائد اعظم کے سر ہو گا۔ مگر قائد اعظم انگریزی ماحول میں تعلیم و تربیت پانے کی وجہ سے دین کی تعلیم سے کما حقہٗ واقف نہ تھے۔ اور نہ ہی ان کے رفقاء کار دیندار قسم کے لوگ تھے۔ اس لیے حضرت تھانوی نے محسوس کیا کہ جنگِ پاکستان لڑنے والوں کو دین کی تبلیغ کی جائے اور انھیں کتاب و سنّت کی پیروی کی تلقین کی جائے۔

اس غرض کے لیے آپ نے مئی ۱۹۳۸ء میں مولانا شبّیر علی صاحب مہتمم خانقاہ امدادیہ کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ:۔

"میاں شبّیر علی ہوا کا رُخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جاویں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی۔ وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی۔ جن کو آج سب فاسق فاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے ہی رہی۔ لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ لوگ دیندار بن جاویں۔ اور بھائی آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں۔ اور سچ

تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیا داروں ہی کا کام ہے۔ مولوی کو یہ کرسیاں اور تخت زیب بھی نہیں دیتا اگر تمھاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے اور پھر سلطنت ان ہی کے ہاتھ میں رہی۔ تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ کہ ہم خود سلطنت کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو۔ وہ دیندار اور دیانت دار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور بس تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔"

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص۹۶)

مولانا شبیر علی صاحب نے یہ سن کر عرض کیا کہ پھر تبلیغ نیچے کے طبقہ یعنی عوام سے شروع ہو۔ یا اوپر کے طبقہ یعنی خواص سے؟ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"اوپر کے طبقہ سے؟ کیونکہ وقت کم ہے۔ خواص کی تعداد کم ہے اور الناس علیٰ دین ملوکھم اگر خواص دیندار اور دیانت دار بن گئے۔ تو انشاء اللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔"

تبلیغی ہدایات

۴ رجون ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ جس میں اکابر لیگ نے جمع ہونا تھا۔ اس لیے حضرت تھانوی نے وہاں ایک تبلیغی وفد بھیجنے کا فیصلہ فرمایا اور علامہ شبیر احمد عثمانی کو اس کا امیر الوفد مقرر کر کے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور مولانا عبدالکریم گمھلوی ارکان وفد کو مولانا عثمانی کے نام ایک خط دے کر ان کے پاس دیوبند روانہ کیا۔ تاکہ وہاں سے وہ انھیں ہمراہ لے کر آگے روانہ ہو

جائیں۔ آپ نے مولانا شبیر علی صاحب کو قائد اعظم سے گفتگو کرنے کے لیے حسب ذیل ہدایات دیں۔

"جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں۔ وہ میں نے مولانا شبیّر احمد کو خط میں لکھ دی ہیں۔ وہ امیر الوفد بھی ہیں۔ اور گفتگو کا سلیقہ بھی ان کو بہت بہتر آتا ہے۔ لیکن اگر کسی سے گفتگو کا تم کو اتفاق ہو جائے۔ تو گفتگو میں اس کا لحاظ رکھنا کہ گفتگو نرم لہجہ میں ہو اختلافی مسائل درمیان میں بالکل نہ آویں۔ اگر مخاطب اختلافی مسائل درمیان میں لانا چاہے تو بہ لطائف الحیل اس سے گریز کرنا۔ اور اور دوسری گفتگو شروع کر دینا اگر مخاطب کے کسی عمل کے متعلق کچھ تنقید کرنا ہو۔ تو لہجہ تنقیدی نہ ہو بلکہ ہمدردانہ اور تبلیغی ہو۔ الفاظ بھی نرم ہوں اور کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب ایسا دینا جس کو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے۔ جس کی میں ایک مثال دیتا ہوں۔ کہ میں فتح پور ہسوہ سے الہ آباد جا رہا تھا۔ ریل میں کچھ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان ہم سفر ہو گئے۔ مجھے وہ پہچانتے نہ تھے۔ مگر صورت سے مولوی سمجھ کر پوچھنے لگے کہ مولانا شریعت نے کتّا پالنا کیوں منع کیا ہے۔ حالانکہ اس میں تو بہت سی صفات اچھّی ہیں۔ وہ زمانہ تھا جب قومی ہمدردی کا علی گڑھ میں بہت زور تھا۔ میں اگر ان کے سامنے شرعی مسائل بیان کرتا اور اللہ و رسول کے احکام بیان کرتا تو بحث کا دروازہ کھل جاتا۔ اور وہ مقصد کہ ان

کے دل میں کُتّے کے پالنے کی بُرائی بیٹھ جائے۔ حاصل نہ ہوتا اس لیے میں نے کہا کہ کتے میں ساری صفات مسلّم مگر ایک عیب ایسا ہے کہ سب صفات پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ مولانا وہ عیب کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں۔ اپنی قوم کے کسی فرد کو دیکھتا ہے۔ تو فوراً لڑنے مرنے کو تیاّر ہو جاتا ہے۔ اس پر وہ سب نوجوان بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ واقعی یہ جنس پاس رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ ورنہ ہم میں بھی یہ اثر آوے گا۔ تو یہاں اس کا لحاظ رہے۔ کہ مقصد ہاتھ سے نہ جائے۔ لیکن مخاطب کے فہم کا ضرور لحاظ رہے''۔ (بحوالہ صدر ص۲۰۷)

تبلیغی وفود

جب یہ حضرات مولانا شبیّر احمد عثمانی رح کی خدمت میں پہنچے۔ تو ان کی والدہ صاحبہ سخت بیمار تھیں۔ اس لیے اُنھوں نے روانگی سے عذر کر دیا۔ اور چونکہ کوئی دوسرا امیر الوفد نہ مل سکا۔ جو قائد اعظم سے گفتگو کر سکتا۔ اس لیے یہ وفد روانہ نہ ہو سکا۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمقام پٹنہ ہونا قرار پایا۔ اس اجتماع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے حضرت تھانوی نے دوسرا وفد تیار کیا۔ جو مولانا شبیّر علی صاحب تھانوی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔ مولانا عبد الجبار صاحب رح ابوہری۔ مولانا عبد الغنی صاحب پھولپوری اور مولانا معظم حسین صاحب امروہوی پر مشتمل تھا جس کے رئیس الوفد مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری رح تھے۔ حضرت نے وفد کو اپنے دو رسائل دیئے کہ وہ ممبران لیگ میں تقسیم کیے جاویں اور جو زیر بحث رہیں۔ وہ

عوام کو تقسیم کر دیئے جائیں۔ ان میں سے ایک رسالہ میں حضرت تھانویؒ کا مسلم لیگ کے نام وہ تاریخی پیام تھا۔ جس میں اربابِ لیگ کو دینی شعائر اور وضع اسلامی کی پابندی کی تلقین کی گئی تھی۔ جس کی روشنی میں اُنھوں نے قائداعظم سے گفتگو کرنی تھی۔

وفد نے پٹنہ پہنچنے کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خاں کی معرفت قائداعظم سے گفتگو کا وقت لیا۔ جو پانچ بجے شام کا مقرر ہوا۔ وقت مقررہ پر ارکانِ وفد قائداعظم کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ قائداعظم نے کھڑے ہو کر ارکانِ وفد سے مصافحہ کیا اور عبدالعزیز صاحب بیرسٹر پٹنہ نے جن کے قائداعظم مہمان تھے۔ ارکانِ وفد کا تعارف کرایا۔ اور ایک گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی جس میں قائداعظم کو نماز پڑھنے کی تبلیغ کی گئی۔ اور قائداعظم نے فرمایا:۔

"میں گنہ گار ہوں۔ خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں۔ میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھوں گا۔" (بحوالہ صدر)

جس کی تفصیل "مشاہدات و واردات" اور "تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مولانا شبیّر علی تھانوی اپنی اس پہلی ملاقات کا اثر یوں بیان کرتے ہیں کہ:۔

"میں نے حضرت کی ہدایات کے مطابق ان سے گفتگو کی۔ جناح صاحب نے نہ یہ کہ جوابات تسلی بخش عنایت فرمائے۔ بلکہ ان کے جوابات ایسے تھے کہ ہم سب اور خصوصیّت سے میں تو بہت متاثر ہوا۔ کیونکہ اگر دورانِ گفتگو میں ان کے کسی دینی عمل کی کوتاہی کے متعلق عرض کیا گیا۔ تو بغیر کسی تاویل یا حجّت کے اُنھوں نے اپنی کوتاہی کو تسلیم

کیا۔ اور آئندہ اس عمل کی اصلاح کا وعدہ کیا اور ہم سے
کہا کہ آپ بھی دُعا کریں کہ میں اپنی اصلاح کر سکوں"
(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی صـ۸۴)

حضرت تھانوی جب بھی قائد اعظم میں کوئی خلافِ شریعت بات دیکھتے فوراً اُن کے پاس وفد بھیج کر ان کی اصلاح کی کوشش کرتے۔ اس طرح مختلف اوقات پر مختلف وفود ان کے پاس بھیجے۔ دو تین مرتبہ تو مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی بھی مولانا شبیر علی صاحب کے ہمراہ گئے مگر بعد میں مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اکیلے ہی بطورِ سفیر دربارِ اشرفیہ قائد اعظم کے پاس حضرت تھانوی کے پیغامات لے جاتے رہے اور اصلاح طلب اُمور کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ قائد اعظم سفیر دربارِ اشرفیہ سے بڑی عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے۔ ان کی باتوں کو بغور سُنتے اور ایسی ملاقات کے لیے یوں اشتیاق ظاہر کرتے کہ :-

"آپ تو کبھی تشریف لاتے ہیں حضرت تھانوی کی باتیں مجھے سمجھاتے ہیں اور علماء بھی میرے پاس آتے ہیں۔ مگر سب مجھ سے موجودہ سیاست میں بات کرتے ہیں۔ جس سے وہ حضرات ناواقف ہیں اور میں مذہب سے ناواقف ہوں۔ حضرت تھانوی نے آپ کو ایک مرتبہ بھی کسی سیاسی اَمر میں گفتگو کے لیے نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کے ذریعہ خاص مذہبی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جو اور جگہ نصیب نہیں ہوتیں۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو۔ تو بیٹھ جائیے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا۔" (ایضاً صـ۸۵)

تبلیغی خطوط

قائداعظم کے پاس تبلیغی وفود بھیجنے کے علاوہ حضرت تھانوی وقتاً فوقتاً انھیں اور دیگر اربابِ لیگ کو تبلیغی خطوط بھی لکھتے رہتے تھے۔ جیسا کہ "اعلام نافع" میں درج ہے کہ:۔

"میں خود اس (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں کو اس کام کے لیے دہلی روانہ کیا۔ غرضیکہ جتنا بھی ہو سکتا ہے لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً علماء بھی مل کر ان پر زور دیتے ان کو نماز روزہ وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔"

اسی طرح "افاداتِ اشرفیہ و رسائل سیاسیہ" میں درج ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا:۔

"جس زمانہ میں کانگرس مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے اس لیے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں۔ بلکہ علماء محققین سے پوچھ کر عمل

فرمادیں۔ تو اُنھوں نے نہایت شرافت و تہذیب سے
جواب لکھا اور اطمینان دلایا کہ اس ہدایت کے مطابق عمل
کیا جائے گا۔" (صہ ۹۶)

حضرت تھانوی کے خطوط اُردو میں ہوتے تھے۔ مگر خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ان کا انگریزی ترجمہ کر کے اصل خط کے ساتھ منسلک کر دیتے تھے۔ تاکہ انھیں سمجھنے میں آسانی ہو۔ اور اس تمام خط و کتابت کا ریکارڈ مولانا شبیر علی تھانوی مہتمم خانقاہ امدادیہ محفوظ رکھتے تھے۔ جو انقلاب ۱۹۴۷ء میں ضائع ہو گئی۔ مگر قائد اعظم نے اس کا جو فائل مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے ممبران کو حضرت تھانوی کی وفات کے بعد دکھلایا تھا۔ وہ یقیناً مس فاطمہ جناح کے پاس ہو گا۔ جس کے متعلق اُنھوں نے متعدد درخواستوں کے باوجود کوئی جواب نہ دیا۔

نتائج تبلیغ

حضرت تھانوی کی تبلیغی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ قائد اعظم نے شیعہ طریق پر نہیں بلکہ مسنون طریق پر پابندی کے ساتھ پانچ وقت نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اتباعِ سنّت میں خود کو شیعہ کہلانا پسند نہیں کیا۔ بلکہ جب انھیں ایک شیعہ وفد نے کوئٹہ میں احساس دلایا کہ آپ ہمارے فرقہ سے ہیں۔ تو اُنھوں نے بڑی جرأت سے فرمایا NO! I am muslim چنانچہ بعد وفات ان کی تجہیز و تکفین بھی اسی طریق پر ہوئی اور نمازِ جنازہ بھی مسنون طریقہ پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھائی۔ ان پر اکثر خوفِ خدا طاری رہتا۔ وہ پہلے سیاست و مذہب کو الگ الگ سمجھتے تھے۔ مگر بعد میں مذہب کو سیاست پر ترجیح دینی شروع کر دی۔ ہر وقت انگریزی لباس میں ملبوس رہنے کی عادت ترک کر کے اکثر و بیشتر اسلامی لباس میں منظرِ عام پر آنے لگے۔ قرآن اور اسلامی لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا۔ توکل و تضرع و انکسار و عاجزی اور دنیا سے نفرت کا جذبہ ان میں پیدا ہو گیا۔ جس

کی وجہ ان کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ جس کی تفصیل "تعمیرِ پاکستان اور علماءِ ربانی" کے باب تدینِ قائدِ اعظم میں دیکھی جا سکتی ہے۔

تصدیقِ صدیق

اسی لیے حضرت تھانویؒ کے مریدِ خاص اور قائدِ اعظم کے یارِ غار نواب جمشید علی خاں صاحب جن کے پاس اکثر قائدِ اعظم اپنی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کے ہمراہ موسمِ سرما میں باغپت جا کر رہا کرتے تھے اور جو انھیں حضرت تھانوی کے مواعظ و ملفوظات سنایا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ:-

"یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائدِ اعظم کی تمام تر دینی تربیت حضرت تھانوی کا فیضان تھا۔ اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا کی بدولت تھا۔ مولوی شبّیر علی صاحب تھانوی نے قائدِ اعظم کو حضرت والا کے قریب لانے میں بڑا کام کیا۔ قائدِ اعظم باغپت کے دوران قیام میں حضرت والا کا بہت خلوص اور ادب سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قائدِ اعظم کو تھانہ بھون حاضر ہونے کا انتہائی شوق تھا۔ لیکن افسوس کہ چند در چند وجوہات کی بناء پر ان کی یہ تمنّا پوری نہ ہو سکی۔

قائدِ اعظم پر آخری زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا۔ اور جس کو ہم سب نے دیکھا وہ حضرت رحمۃ اللہ کی جوتیوں کا صدقہ تھا۔" (تعمیرِ پاکستان اور علماءِ ربانی صـ۹۲)

تائیدِ اشرف

حق تعالیٰ (جو اپنے نیک بندوں کی مساعی خیر کی بناء پر ان کی ہر وقت تسلّی کے سامان کرتے رہتے ہیں) نے حضرت تھانویؒ کو بھی ان کی تبلیغی جدّ و جہد

کے نتائج کا مشاہدہ ان کی زندگی میں کرا دیا تھا۔ حضرت تھانوی کے خواہرزادہ مولانا ظفر احمد عثمانی کا ارشاد ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا:۔

"میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں۔ مگر آج میں نے عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا کہ میدانِ حشر سا معلوم ہوتا ہے۔ اس مجمع میں اولیاء صلحاء کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح مجمع کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے؟ تو مجھ سے کہا گیا کہ محمد علی آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اس واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۱)

گویا جس طرح پاکستان کا تخیّل پیش کرنے کا شرف حضرت تھانوی کو حاصل ہے اسی طرح معمارِ پاکستان کی اصلاح و دینی تربیت کا شرف بھی انھیں ہی حاصل رہا۔

آئینی سرگرمیاں

شرعی قوانین

جہاں تک امن وامان اور عدل وانصاف کا تعلّق ہے۔ نتائج کے اعتبار سے کسی مملکت کا قانون شرعی قانون پر فضیلت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس وقت دنیا کے کسی خطہ میں ماسوائے سعودی عرب کے اس کا نفاذ نہیں مگر وہاں کے امن وامان اور عدل وانصاف پر وہی مہذب قومیں حیران وششدر ہیں جو اسلامی قوانین کو غیر مہذب بتلاتی ہیں۔ وہ پہلا اسلامی ملک ہے۔ جہاں سب کے دکاندار کھلی ہوئی دکانیں اکیلی بلا کسی پہرہ بٹھائے چھوڑ کر اذان سنتے ہی مسجدوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور جب واپس آتے ہیں تو ہر چیز جوں کی توں پڑی ملتی ہے۔ کیا مجال کہ کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے اور شرعی قوانین کے نفاذ کی برکت ہے وہاں جیل خانوں کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں ایک ایک مقدمہ کی سماعت میں کئی کئی برس لگ جاتے ہیں۔ اور وہاں چوبیس گھنٹے کے اندر مقدمہ کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہاں فریادیوں کو عدالتوں کے چکّر کاٹنے پڑتے ہیں۔ وہاں وقوعہ کی اطلاع پاتے ہی عدالت خود بخود موقع پر پہنچ کر معاملہ کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہاں عدالتیں گو ہر چھوٹے چھوٹے علاقہ میں یعنی محلوں میں موجود ہیں۔ مگر مقدمات اتنے کم ہوتے ہیں کہ قاضی اکثر بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔ اور وکلاء کا تو وہاں وجود ہی نہیں۔

حضرت تھانویؒ کے پیش نظر بھی یہی چیز تھی کہ یہاں ایک دارالاسلام

قائم ہو جائے تاکہ ہم شرعی عدالتیں قائم کر سکیں۔ اور معاشرہ کو جن روز افزوں جرائم نے تباہ کر رکھا ہے۔ اس کی اصلاح کی جا سکے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے حضرت نے ہی سب سے پہلے کوشش شروع کی۔ مسلمانوں کے سرزمینِ ہند پر قدم رکھنے کے فوراً بعد ہندوستان کے ساحلی علاقہ کے ہندو راجاؤں کے عہد حکومت میں مسلمانوں کے مقدمات فیصلہ کرنے کے لیے الگ مسلمان افسر مقرر ہوتا تھا۔ جو اسلامی قانون کی رُو سے ان پر حکم لگاتا تھا۔ جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کا نوجوان سیاح ابن حوقل ہندوستان کے ساحلی علاقہ کے دورہ کے حالات میں لکھتا ہے کہ :-

"ان تمام علاقوں میں مسلمان کسی حکم اور فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ جب تک ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہو ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ کا یا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ خواہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔" (داستان عمل صہ ۱۵۲ ابن حوقل صہ ۲۲۸)

حضرت تھانوی بھی اسی طرح یہاں مسلمانوں کے معاملات ان کی شریعت کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے تھے۔

تحریک تقرر قضاۃ

ہندوستان میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے حضرت تھانوی نے شروع کی۔ آپ نے حضرت حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ انھوں نے حضرت کی تحریک پر مسٹر مانٹیگو سابق وزیر ہند سے اس کی ضرورت کو ظاہر فرمایا۔ بعض ممبران کو اسمبلی اور کونسل میں یہ معاملہ پیش کرنے کی ترغیب دی۔

بعض ذرائع سائمن کمشن کے سامنے بھی اس کی ضرورت کو ظاہر کیا گیا میرٹھ میں حضرت کے ایماء پر انجمن نصب القضاء قائم ہوئی۔ اس نے رسالہ "القول الماضی" وغیرہ شائع کر کے لوگوں کو اس طرف متوجّہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی میں سلسلہ میں ایک خاص جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں تمام ممبرانِ اسمبلی اور عمائد شہر دہلی کے علاوہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری اور مولانا محمد علی صاحب جوہر اور ممتاز علماء دیوبند و سہارنپور تشریف لائے۔ دربار اشرفیہ کی طرف سے مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے نمائندگی کے فرائض انجام دیئے اور ممبرانِ اسمبلی پر پوری طرح اس مسئلہ کی اہمیت واضح کردی گئی۔ انھوں نے بھی اس کی اہمیت و افادیت کا احساس کرتے ہوئے اس سلسلہ میں کوشش کرنے کا یقین دلایا لیکن یہ سعی کارگر ثابت نہ ہوئی۔

قانونِ وراثت

ایک مرتبہ حضرت کی مجلس میں ذکر آیا کہ پنجاب میں وراثت کا قانون شریعتِ مقدسہ کے خلاف ہے۔ بہن بیٹی وغیرہ کو میراث سے حصّہ نہیں ملتا۔ وہاں کے لوگ رواج کے پابند ہیں۔ شرعی قانون وراثت کی بجائے "قانون رواجِ عام" رائج ہے اور کسی کو اس کا احساس نہیں۔ نہ اس طرف توجّہ ہے۔ تو حضرت نے بڑے اہتمام سے فرمایا کہ وہاں کے مسلمانوں کو اس طرف توجّہ دلانا نہایت ہی ضروری ہے۔ مولوی عبدالکریم گمتھلوی نے عرض کیا کہ حضرت علمائے کرام اگر خاص سعی فرمائیں تو ممکن ہے کہ کچھ لوگ سمجھ جائیں۔ ورنہ ایسے معاملہ میں معمولی سعی سے تو نفع کی اُمید نہیں۔ فرمایا جس قدر کوشش ہو سکے۔ اس میں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ نفع کی فکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے اپنے وطن جاکر

اپنے نواح میں اس مسئلہ کی طرف لوگوں کی توجہ دلانی شروع کی۔ امرتسر اور لاہور میں بھی اس غرض کے لیے جلسے کیے۔ مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

حضرت تھانوی جب مولوی صاحب کے سسرال موضع اڑدن میں تشریف لے گئے اور راجپورہ میں قیام فرمایا تو وہاں پھر یہ مسئلہ وراثت پیش ہوا۔ تو حضرت نے اس کے لیے مولوی صاحب کو پنجاب کے سفر کی پھر ترغیب دی۔ انھوں نے مصارف کا عذر کیا تو آپ نے واپس جاتے ہی ابتدائی مصارف کے لیے اپنی طرف سے تیس روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیئے۔ مولوی صاحب نے اس سلسلہ میں ایک سوال نامہ مرتب کر کے علماء کرام کی تائید حاصل کرنے کے لیے چالیس پچاس جگہ مشاہیر علماء کو روانہ کیا اور خود توکلاً علی اللہ پنجاب روانہ ہو گئے۔ سرہند وغیرہ اُترتے ہوئے لاہور پہنچے۔ وہاں زیادہ تر وقت اہلِ علم اور اسلامی انجمنوں کو اس جانب توجہ دلانے میں صرف کیا۔ اتفاق سے انھیں یہاں ایک ایسی جماعت بھی مل گئی۔ جس کے بعض ارکان کو کسی قدر اس مسئلہ کا خیال تھا۔ اور تھوڑی بہت جزوی کوشش کا بھی ارادہ تھا۔ مگر لوگوں کی مخالفت کے سبب کامیابی کی کوئی سبیل نظر نہ آنے پر اُنھوں نے حضرت کو اطلاع دی۔ تو آپ نے لکھا کہ :۔

”جب تک نا اُمیدی نہ ہو ایک دفعہ جان توڑ کوشش کر لینی چاہیئے۔“

اس پر مولوی عبد الکریم صاحب آگے بڑھے۔ آپ ابھی وزیر آباد تک ہی پہنچے تھے کہ علماء حضرات کی طرف سے ان کے استفتاء کا جواب موصول ہو گیا۔ جسے چھپوانے کی غرض سے تھانہ بھون واپس آ گئے۔ اور ان کو ”ظلم پنجاب کے متعلق خدائی وصیت“ کے عنوان سے چھپوا کر پنجاب روانہ ہونے والے تھے کہ ہندوؤں نے اطراف آگرہ میں شدھی کی تحریک شروع کر دی۔ جب اس کی خبر تھانہ بھون پہنچی۔ تو حضرت تھانوی نے مولوی صاحب

موصوف سے دریافت کیا کہ اگر تم وہاں چلے جاؤ تو قانونِ وراثت کی سعی میں تو کچھ حرج واقع نہ ہوگا۔ انھوں نے عرض کیا کہ صرف تاخیر ہو جائے گی اور تو کچھ حرج نہیں فرمایا:

"بس تو پھر الاہم فالاہم پر عمل کرنا چاہیئے۔ بسم اللہ کر کے آگرہ اور اس کے نواح میں جا کر پہلے مسلمانوں کو ہندو ہونے سے بچاؤ"

چنانچہ مولوی صاحب آگرہ کی طرف روانہ ہو گئے اور فتویٰ بذریعہ ڈاک پنجاب کے شہروں میں بغرض تقسیم بھیج دیا۔ تاکہ وہاں بھی کام جاری رہے اور ایک دوسرا رسالہ "غضب المیراث" کے نام سے بھی شائع کر کے تقسیم کیا گیا۔ جب یہ ختم ہو گئے۔ تو دوبارہ چھپوائے گئے۔ اور ان کے اخراجات کا حضرت تھانوی نے انتظام فرمایا۔

حضرت تھانوی جمیعتہ العلماء کو اس طرف توجہ دلانے کے لیے برابر تین جلسوں میں مولوی عبدالکریم صاحب کو بھیجتے رہے۔ دو دفعہ تو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ تیسری دفعہ اتنی کامیابی ہوئی کہ ۱۳۴۷ھ ۲۵-۱۹۲۶ء میں بمقام مراد آباد ایک پُرزور قرارداد اس سلسلہ میں منظور ہوئی جب فتنہ ارتداد کی آندھی کچھ تھمی تو پھر مولوی صاحب کو حکم ہوا کہ:

"میرا خیال ہے کہ ان سب قصّوں کو چھوڑ کر پنجاب کا سفر تحریک عدل فی المیراث کیا جائے"

اور اس مرتبہ ان کے ہمراہ مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی کو بھی بھیجا گیا۔ اس دورہ سے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ بہت سے لوگوں نے قانون رواجِ عام بدلوانے کی سعی شروع کر دی۔ اور بالآخر پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء میں اس قسم کا قانون معرضِ وجود میں آگیا۔

۲

جبری تعلیم

۱۹۲۸ء میں ریاست الور میں دینی تعلیم حکماً بند کر دی گئی اور تمام چھوٹے بڑے دینی مدارس و مکاتب یک قلم توڑ دیئے گئے۔ اس کی اطلاع مولوی عبدالکریم صاحب نے جو ان دنوں مدرسہ معین السلام قصبہ نوح ضلع گوڑگانواں کے متعلق تھے۔ حضرت تھانوی کو بھیجی۔ اور دعا کے لیے لکھا کہ کسی طرح یہ قانون منسوخ ہو جائے۔ حضرت نے دعا کے ساتھ لکھا کہ اس سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ اور اخراجات کے لیے ان کے تخمینہ کے مطابق مبلغ یک صد روپیہ پیش کرنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ مولوی صاحب اس مسل کے ضروری کاغذات کی نقل حاصل کر کے جس کی رو سے تعلیم دین بند کرنے کا حکم دیا گیا تھا وکلاء وغیرہ سے مشورہ لینے کے لیے دہلی پہنچے۔ کاغذات کے ملاحظہ سے یہ راز کھلا کہ جس طرح فلسطین کے مسلمانوں نے طمع نفسانی میں وہاں کی زمینیں خود یہودیوں کے پاس بیچ دیں تھیں اور اسلامی دنیا فلسطین میں یہود کے غلبہ کے خلاف ڈھول پیٹتی رہی تھی۔ اس طرح یہاں بھی ہندوؤں نے چالاکی کر کے دینی مکاتب کے بند کرنے کی درخواستیں خود مسلمانوں سے دلوا رکھی تھیں۔ اور ان کی بناء پر حکام ریاست نے تعلیم دین بند کر دی تھی۔ گو وکلاء نے کہا کہ اب کچھ نہیں بن سکتا مگر حضرت کی تاکید کے پیش نظر مولوی صاحب نے ہمت نہ ہاری اور حکام متعلقہ کو اس سازش کے خلاف درخواستیں وغیرہ دینی شروع کر دیں۔

یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا کہ دہلی سے خبر آئی کہ وہاں بھی جبری تعلیم کے قانون کے تحت تمام دینی مدارس توڑے جا رہے ہیں۔ مولوی عبدالکریم صاحب تمام حالات معلوم کر کے فوراً تھانہ بھون پہنچے اور اطلاع دی کہ اس وقت تک گیارہ مکاتب ٹوٹ چکے ہیں جن میں تقریباً اڑھائی سو

طلباء قرآنی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور یہی وبا ملحقہ اضلاع میں بھی پھیل رہی ہے اس پر حضرت تھانوی بہت پریشان ہوئے اور آپ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپ کے حکم سے مولوی صاحب نے اس بارہ میں ایک استفتاء مرتب کیا۔ حضرت نے اس کا جواب تحریر فرما کر دیگر علماء کرام کے دستخط حاصل کرنے کا امر فرمایا۔ چنانچہ مولوی عبدالکریم صاحب نے اس پر علماء دیوبند۔ سہارنپور۔ دہلی اور میرٹھ کے دستخط حاصل کر کے اسے شائع کر دیا۔ اور اس تحریک کو چلانے کے لیے انجمن خدام القرآن قائم کی۔ حضرت کی دعا اور مالی امداد سے اس تحریک کو بڑے زور سے چلایا گیا۔ اور تھوڑی مدت بعد بفضلہ تعالیٰ تمام دینی مدارس کھل گئے یہاں تک کہ مراد آباد۔ سہارنپور وغیرہ مقامات پر بھی روک تھام ہو گئی۔ پھر جہاں جہاں سے خبر آتی کہ وہاں دینی مدارس بند کیے جا رہے ہیں۔ وہاں فی الفور مناسب کارروائی کر کے ان کو اس ارادہ سے باز رکھا جاتا۔ اگر اس وقت فی الفور حضرت اس طرف توجہ نہ فرماتے تو نتائج یقیناً روح فرسا ہوتے۔

قانون اوقاف

۱۹۳۰ء میں نواب جمشید علی خاں صاحب کی ہمراہی میں چند اعلیٰ طبقہ کے وکلاء اور رؤسا کے ایک باضابطہ نیم سرکاری وفد نے جس کے صدر حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر کانپور تھے۔ تھانہ بھون حاضری کی اطلاع دی۔ حضرت نے قصبہ کے رئیس اعظم اور اپنے بھتیجے حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کو ان کے استقبال کے لیے تاریخ مقررہ پر اسٹیشن پر بھیجا۔ اور ان کے قیام کا انتظام بھی مولانا کے دولت خانہ پر کیا۔ یہ وفد اس امر کی تحقیق کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ آیا مسلمانوں کے اوقاف کے انتظامی معاملات میں غیر مسلم حکومت کو دخیل بنانا جائز ہے یا

نہیں۔ اس سلسلہ میں ان حضرات نے ایک سوال نامہ جو قریباً سو سوالات پر مشتمل تھا۔ شرعی تحقیق کے لیے حضرت کی خدمت میں اپنی آمد سے قبل ہی بھیج دیا تھا۔ تاکہ حضرت سوچ بچار کر رکھیں۔ مگر حضرت کو کثرتِ مشاغل کی وجہ سے انھیں ابھی دیکھنے کا اتفاق ہی نہ ہوا تھا کہ وفد پہنچ گیا۔ چونکہ وفد کے ارکانِ اعلیٰ طبقہ کے افراد پر مشتمل تھے۔ اس لیے حضرت ان کو خانقاہ میں آنے کی تکلیف دینے کی بجائے خود ان کی قیام گاہ پر گفتگو کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔

اصول بحث

حضرت نے ارکان وفد سے گفتگو کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور بطور اصول موضوعہ پیش کیے:۔

۱۔ مسائل کا جواب عرض کرنے کے لیے میں حاضر ہوں۔ مگر مشورہ و مصلحت کے متعلق کچھ عرض کرنے سے مَیں اس لیے معذور ہوں کہ مجھ کو اس سے مناسبت نہیں۔

۲۔ بعض مسائل عین وقت پر مستحضر نہیں ہوتے۔ ان کے جوابات سے معذور ہوں گا۔ البتہ اگر ان کی یادداشت لکھ کر مجھ کو دے دی جائے۔ تو کتابیں دیکھ کر اطمینان سے جواب دے سکتا ہوں۔

۳۔ مسائل پر اگر کچھ شبہات ہوں۔ تو ان کا جواب دینا ہم لوگوں کے ذمّہ نہیں کیونکہ ہم لوگ مسائل کے ناقل ہیں۔ بانی نہیں۔ جیسے قوانین کے متعلق اگر کوئی شبہ یا خدشہ ہو اس کا جواب مجلس قانون ساز کے ذمّہ ہے۔ جج یا وکیل کے ذمّہ نہیں۔

حاضر جوابی

متذکرہ بالا اصولوں پر جب گفتگو شروع ہوئی۔ تو حضرت نے ان

حضرات کو صاف کہہ دیا کہ چونکہ یہ مذہبی فعل ہے۔ اس لیے اس کے اندر غیر مسلم کا دخل دینا مذہبی دست اندازی ہے اور مذہبی دست اندازی کرنا یا اور کسی طرح سے اسی میں مداخلت کی کوشش کرنا صاف جُرم ہوگا۔ جیسے کہ نماز جو ایک خالص مذہبی فعل ہے۔ اس کے اندر کسی طرح جائز نہیں کہ غیر مسلم کو دخیل بنایا جائے۔

اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہوگا کہ کسی غیر مسلم سے دست اندازی کی درخواست کی جائے۔ یا کوئی ایسی کوشش کی جائے کہ وہ غیر مسلم وقف کے انتظامی معاملہ میں دخیل ہو۔

وفد کی طرف سے گفتگو ہندوستان کے ایک مشہور بیرسٹر[۱] کر رہے تھے۔ جو فن جرح میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور لوگ انھیں جرح کا بادشاہ کہتے تھے۔

حضرت تھانوی کی مذکورہ بالا تصریح سُن کر بیرسٹر صاحب موصوف نے کہا کہ معاف فرمائیے نماز میں اور وقف میں فرق ہے۔ اس لیے کہ نماز کا تعلق مال سے نہیں ہے اور وقف کا تعلّق مال سے ہے۔ اس وقت چونکہ متولیوں کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ اس لیے اوقاف کے اندر وہ بڑی گڑبڑ کرتے ہیں اس کی آمدنی مصارفِ خیر میں صرف نہیں کرتے خود کھا جاتے ہیں۔

---

[۱] ہم نے چاہا کہ یہ واقعہ ان کے نام سے لکھا جائے۔ اس لیے مولانا شبیر علی صاحب مہتمم خانقاہ سے ان کا نام دریافت کیا گیا تو انھوں نے لکھا کہ:۔

"حضرت کے اندر ایثار اور عیب پوشی کا بہت اہتمام تھا۔ وہ اگر ضرورت ہوتی تو ہار مان لیتے تھے اور اگر کہیں بہ ضرورت دوسرے کی ہار کا اظہار بہ ضرورت دینی کرنا ہوتا تھا۔ تو پھر اس کا نام ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ لہٰذا میں بھی اتباعاً ان کا نام ظاہر کرنے سے معذور رہوں۔ حالانکہ مجھے ان کا نام و پتہ معلوم اور یاد ہے۔"

(مکتوب گرامی مورخہ ۱۷ رمئی ۱۹۵۵ء)

حکیم الامت نے فرمایا! اچھا اگر آپ کے نزدیک نماز کی نظیر ٹھیک نہیں ہے تو زکوٰۃ کو ہی لے لیجئے۔ کہ ایک خالص مذہبی فعل بھی ہے اور اس کا تعلق مال سے بھی ہے۔ اور بہت سے مسلمان ایسے بھی ہیں۔ جو اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں نکالتے۔ مگر چونکہ مذہبی فعل بھی ہے اس لیے اس میں غیر مسلم کی مداخلت جس قسم کی بھی ہو۔ ناجائز سمجھتے ہیں۔

بیرسٹر صاحب نے کہا اچھا صاحب نکاح اور طلاق بھی آپ کے نزدیک خالص مذہبی فعل ہے یا نہیں۔

حضرت نے جواب دیا۔ جی ہاں۔

اس پر انھوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ اگر ایک عورت کو شوہر نے طلاق دی۔ مگر اب وہ عورت اس مرد سے جُدا ہونا چاہتی ہے اور مرد اس کو نہیں جانے دیتا۔ بلکہ روکتا ہے۔ اور طلاق سے انکار کرتا ہے۔ تو ایسی صورت میں کیا اس عورت کو جائز نہیں کہ عدالت میں اس کے متعلق استغاثہ دائر کرے۔ اور شہادت سے طلاق کو ثابت کر کے حکومت سے اپنی آزادی میں مدد حاصل کرے۔ تو دیکھئے نکاح و طلاق مذہبی فعل ہیں۔ مگر اس میں غیر مسلم کا دخل جائز ہوا۔

حضرت نے جواب دیا۔ آپ نے غور نہیں کیا۔ یہاں دو چیزیں جُدا جُدا ہیں۔ ایک تو وقوع طلاق اور ایک اثر طلاق یعنی وہ حق جو اس عورت کو مرد کے طلاق دے دینے سے حاصل ہو گیا ہے اور مرد اس حق کو چھیننا چاہتا ہے۔ جس میں عورت کا ضرر ہے۔ تو یہاں وہ عورت غیر مسلم حکومت کا دخل قصداً خود طلاق میں نہیں چاہتی۔ بلکہ طلاق سے اس کو جو حق آزادی حاصل ہوا ہے۔ جس کے استعمال نہ کر سکنے سے اس کو ضرر پہنچتا ہے۔ اس ضرر کو دفع کرنے کے لیے وہ عورت عدالت سے مدد چاہتی ہے۔

بیرسٹر صاحب نے کہا کہ معاف فرمائیے۔ اسی طرح ہم یہاں بھی

کہہ سکتے ہیں کہ جیسے یہاں عورت کا ضرر ہے۔ اسی طرح اوقاف کے اندر گڑبڑ ہونے میں مساکین کا ضرر ہے۔ سو جیسے وہاں اس ضرر سے بچنے کی خاطر غیر مسلم کے دخل کو جائز رکھا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں اوقاف میں ضرر سے بچنے کے لیے غیر مسلم کا دخل جائز ہونا چاہیئے۔

حضرت نے جواب دیا کہ آپ نے غور نہیں کیا۔ وہاں تو شوہر کے حبس سے اس عورت کا ضرر ہے اور یہاں اوقاف میں متولی کی خیانت سے مساکین کا ضرر نہیں بلکہ صرف عدم النفع ہے۔ ضرر اور چیز ہے۔ عدم النفع اور چیز ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً آپ کی جیب میں ایک سو روپے کا نوٹ تھا۔ ایک شخص نے آپ سے وہ چھین لیا۔ تو یہ ضرر ہوا۔ اور اگر میں آپ کو ایک نوٹ دینا چاہتا ہوں۔ مگر پھر کوئی اس نوٹ کے دینے سے منع کر دے۔ تو اس میں آپ کا ضرر کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ صرف عدم النفع ہوا۔

اعترافِ وفد

اس پر سب لوگوں نے بے ساختہ سبحان اللہ اور صلِّ علیٰ کہنا شروع کر دیا۔ اور بیرسٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ اور پھر کوئی شبہ پیش نہیں کیا۔ مگر حضرت کی حاضر جوابی سے بشاش ہو گئے۔ اور یہاں سے بہت ہی خوش خوش رخصت ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ:۔

"بعض لوگوں نے ہم کو بہت ہی خشک جواب دیئے۔ جس سے ہماری بہت دل شکنی ہوئی۔ مگر یہاں حاضر ہو کر جو ہم کو نفع ہوا۔ اور جو علوم ہم کو اس مجلس میں حاصل ہوئے وہ کہیں حاصل نہیں ہوئے۔ ہم نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ استفادہ کی غرض سے گاہ بگاہ یہاں حاضر ہوا کریں گے۔"

جب ارکانِ وفد واپس اسٹیشن کو روانہ ہوئے۔ تو حضرت بھی انھیں رخصت کرنے کی غرض سے اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ اور فرمایا کہ جب آپ یہاں اسٹیشن پر اُتر ے تھے۔ اس وقت اس لیے نہیں آیا کہ اس وقت میرا آنا آپ کی جاہ کی وجہ سے ہوتا۔ اور اب جو میں آیا ہوں۔ اب تو یہ آنا آپ کی چاہ یعنی محبت کی وجہ سے ہوا ہے۔

نقلِ یادداشت

حضرت تھانوی نے ارکانِ وفد کی رہنمائی کے لیے اس وقت مندرجہ ذیل ایک مختصر سی یادداشت لکھ دی تاکہ اس کی روشنی میں اگر یہ کوئی تجویز اصلاحِ اوقاف کے سلسلہ میں کر سکیں تو کریں :-

۱۔ "وقف کرنا ایک مالی عبادت ہے اور خالص عبادت ہے۔ جیسے زکوٰۃ دینا عبادت ہے اور خالص عبادت ہے۔

۲۔ گو وقف کا نفع بسا اوقات عباد کو بھی پہنچتا ہے۔ جبکہ ان عباد کے لیے کوئی استحقاق مقرر کر دے۔ مگر پھر بھی وقف خالص عبادت رہے گا۔ معاملہ نہ ہو گا۔ جیسے زکوٰۃ خالص نفع عباد کے لیے ہی موضوع ہے۔ دوسرے مصارف مساجد وغیرہ میں صرف نہیں ہو سکتی۔ بخلاف وقف کے کہ وہ ان مصارف میں بھی شرطِ وقف کے موافق صرف ہو سکتا ہے جس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ کا تعلق عباد کے ساتھ بہ نسبتِ وقف کے زیادہ ہے۔ مگر باوجود اس کے زکوٰۃ خالص عبادت ہے معاملہ نہیں۔ پس وقف خالص عبادت ہونے میں زکوٰۃ سے بھی زیادہ ہے۔

۳۔ جب وقف مثل زکوٰۃ کے بلکہ زکوٰۃ سے بھی زیادہ خالص عبادت

ہے۔ اس میں کسی خرابی کا ہونا ایسا ہو گا۔ جیسے زکوٰۃ میں کسی خرابی کا ہونا۔ اور اس خرابی کی اصلاح کے لیے گورنمنٹ کا دخل دینا ایسا ہو گا۔ جیسا زکوٰۃ کی خرابی کی اصلاح کے لیے گورنمنٹ کا دخل دینا۔

۴۔ زکوٰۃ میں ایسا دخل دینا یقیناً دخل فی المذہب ہے۔ اسی طرح وقف میں دخل دینا دخل فی المذہب ہو گا۔ خواہ خود دخل دیا جائے۔ خواہ کسی کی درخواست پر دخل دیا جائے۔ پھر سوال یہ ہے کہ پھر وقف کی خرابیوں کا کیا انسداد ہو یہ ایسا دخل ہے۔ جیسا یہ سوال کیا جائے کہ اگر کوئی نماز روزہ حج یا زکوٰۃ میں کوتاہی کرے۔ اس کا کیا انسداد ہے۔ کیا اس کا کوئی شخص یہ جواب تجویز کر سکتا ہے کہ گورنمنٹ کو ان کوتاہیوں پر جرمانہ وغیرہ مقرر کرنے کا حق ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس کا انتظام خود مسلمان کر سکتے ہیں۔ خواہ اس کو افہام تفہیم کریں۔ خواہ اس کو تولیت سے معزول کریں۔ جبکہ واقف نے ان کو اس قسم کے اختیار دیئے ہوں۔ خواہ اس سے قطع تعلق کریں۔ اگر ایسا نہ کریں۔ تو ان کی کوتاہی ہی ہو گی۔ گورنمنٹ کو پھر بھی دخل دینے کا حق نہیں۔"

مسوّدہ پر غور و خوض

اگرچہ حضرت تھانوی کی رائے یہی تھی کہ ایسا قانون بنانے کا حکومت کو قواعد شرعیہ کی رُو سے اختیار نہیں۔ اور دیوبند اور سہارنپور کے علماء کرام بھی حضرت تھانوی کی تائید میں تھے۔ مگر بعض حلقوں سے وفد کو حسب خواہش جواب مل گیا۔ اور اہلِ وفد نے ایک مسوّدہ قانون مرتّب کر کے کونسل میں پیش کر دیا۔ جو رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا گیا۔ اس کی مشتہری پر مولانا حافظ

عبد اللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم سہارنپور نے حضرت تھانوی کی اس طرف توجہ مبذول کرائی۔ ان کی تحریک اور حضرت کی تائید سے علماء دیوبند و سہارنپور ۲۴ ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ کو تھانہ بھون جمع ہوئے اور بعد غور و خوض سب کی یہی رائے ہوئی کہ حضرت تھانوی کی زیر نگرانی اس پر تفصیلی نظر کر کے اس کے نقائص واضح کیے جاویں اور اس میں ایسی ترامیم کر دی جائیں کہ یہ مسوّدہ شریعت کے موافق ہو جائے۔ اس غرض کے لیے حضرت نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان) مولوی جمیل احمد صاحب تھانوی مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور اور مولوی عبد الکریم صاحب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی۔ اور انھوں نے ہر ہر جزو میں حضرت سے استصواب کر کے غور و خوض کے بعد ترمیمی مسوّدہ مرتب کیا۔ حضرت نے اس کو تحقیقی نظر سے دیکھنے کے بعد دستخط فرمائے۔ اور اس کو ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۴ کو دیوبند میں آخری بار غور و خوض کے لیے روانہ کیا گیا۔ جہاں صبح سے عشا تک اس پر بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ اور بالآخر یہ بالاتفاق منظور ہوا۔ جس پر تیس علماء کرام کے دستخط ثبت ہوئے اور یہ ترمیمی مسوّدہ کونسل کو بھیج دیا گیا۔ اس مسودہ پر مکالمہ کی غرض سے ۲۲ اپریل ۱۹۳۴ء کو اس مسوّدہ کے مجوّز حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر و ممبر کونسل آف اسٹیٹ نواب جمشید علی خاں صاحب ممبر لیجسلیٹو اسمبلی حاجی وجیہہ الدین صاحب ممبر اسمبلی حاجی رشید احمد خاں صاحب سوداگر اسلحہ دہلی تھانہ بھون پہنچے۔ اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مہتمم صاحب دیوبند۔ مفتی صاحب دیوبند۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور سہارنپور سے ناظم صاحب مظاہر العلوم۔ مولانا محمد زکریا صاحب و دیگر علماء کرام تشریف لائے۔ حضرت تھانوی کی موجودگی میں پانچ گھنٹے تک اس مسوّدہ پر مفصل گفتگو ہوئی۔ بالآخر حافظ ہدایت حسین صاحب نے مجوزہ مشورہ میں اصلاحات کو تسلیم کر لیا۔ بعض میں کچھ عذر کیا اور بعض پر غور کا وعدہ کیا۔

اس سلسلہ میں جس قدر اخراجات ہوئے۔ ان کا ایک تہائی حصّہ حضرت تھانوی رح نے انہ گرہ خود ادا کیا۔

قانون تنسیخ نکاح

ایک عرصہ سے تقرر قضاۃ کا سلسلہ موقوف ہونے کی وجہ سے مسلمان عورتیں سخت مصائب و مشکلات میں گرفتار تھیں اور ستم رسیدہ مستورات کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بپتسمہ لے کر تبدیلی مذہب کی آڑ میں ظالم خاوندوں سے نجات حاصل کریں۔

ان کے حالِ زار پر بھی حضرت تھانوی کو ہم سب سے پہلے توجہ فرمانے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے ان کے مسائل پر علماء مدینہ منورہ۔ دیوبند۔ سہارنپور سے بار بار فتویٰ حاصل کیے اور کامل تحقیق فرما کر پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک رسالہ حیلۃ الناجزہ تصنیف فرمایا اور ایک ہزار روپیہ کی لاگت سے اسے چھپوا کر اور اس پر دوسرے علمائے کرام کی تصدیق کرا کر ممبران اسمبلی میں تقسیم کیا کہ اس کے مطابق ایک مسوّدہ قانون تنسیخ نکاح مرتب کر کے بغرض منظوری اسمبلی میں پیش کیا جائے۔

تقریباً تمام علماء ہند نے اس رسالہ کی تائید و تصدیق فرمائی اور ممبران اسمبلی نے بہت جلد قانون بنوانے کی سعی شروع کر دی۔ اور ایک مسودہ مسلم قانون فسخ نکاح کے نام سے کاظمی صاحب نے اسمبلی میں پیش کر دیا۔ مگر اس مسوّدہ میں وہ قیود و شرائط نظر انداز کر دیں۔ جو حضرت نے فقہ کی ورق گردانی اور علمائے محققین سے مراجعت کے بعد تحریر فرمائی تھی۔ بہر حال ۱۹۳۹ء میں ایکٹ نمبر ۸ انفساخ نکاح منظور ہو گیا۔ جس کے ذریعہ عورتوں کے لیے ظلم و تشدّد سے نجات پانے کی سبیل نکل آئی۔ اور تب سے اس قانون پر عمل درآمد ہوتا چلا آ رہا ہے۔

آرمی بل

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے پر گورنمنٹ نے اسمبلی میں ہندوستان کی طرف سے فوجی امداد دینے کا ایک بل پیش کیا۔ جس کی کانگرس نے بڑی مخالفت کی۔ مگر قائد اعظم نے اس کی حمایت کی قائد اعظم اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرسیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اور بلطائف الحیل قائد اعظم کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اس واویلا کا اثر خانقاہ تھانہ بھون تک بھی جا پہنچا۔ اور کانگرس زدہ لوگوں نے آرمی بل کی آڑ میں حضرت تھانوی کو قائد اعظم سے برگشتہ کرنے کے لیے طرح طرح کی چالیں چلنی شروع کر دیں۔ مسلسل پروپاگنڈا سے حضرت کو بھی کچھ تشویش سی ہوئی۔ مگر حقیقتِ حال سے آگاہ ہوئے بغیر آپ نے کوئی اعلان شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ایک وفد جو مولانا شبیر علی صاحب تھانوی۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (مفتی اعظم پاکستان) مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی پر مشتمل تھا۔ قائد اعظم کی خدمت میں دہلی بھیجا کہ ان سے معلوم کرے کہ انھوں نے آرمی بل کی حمایت کن وجوہات کی بناء پر کی ہے۔ وقت مقررہ کے مطابق وفد دہلی پہنچ گیا۔

قائد اعظم کی وضاحت

وفد نے قائد اعظم سے آرمی بل کی حمایت کے وجوہ دریافت کیے۔ قائد اعظم نے کہا کہ:-

"کانگرس نے حقیقتِ حال پر پردہ ڈال کر میرے خلاف پروپاگنڈا کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگرس خود آرمی بل کی حمایت کرنے کو تیار تھی۔ مگر اس کی شرط یہ تھی کہ فوجی بھرتی

تناسب آبادی کے لحاظ سے ہو۔ یعنی اس وقت فوج میں ستّر
فی صدی مسلمان تھے۔ کانگرس کا مطالبہ تھا کہ ۲۵ فی صدی مسلمان
لیے جائیں تب وہ آرمی بل کی حمایت کرے گی۔ اس پر ہوم
ممبر نے کہا کہ خطرہ ہمارے سر پر ہے اور ہم فوج کو توڑ کر
نئی فوج نہیں بنا سکتے۔ اس پر ڈاکٹر مونجے نے کہا۔ کہ
ایک سال میں ہم آپ کو ایک لاکھ فوجی تربیت یافتہ نوجوان
دے سکتے ہیں۔ ہوم ممبر نے کہا کہ آپ ایک سال کہتے ہیں
ہم کو ایک مہینہ کی بھی مہلت نہیں ہے۔ خطرہ سر پر ہے۔
اس کے بعد اجلاس لنچ کے لیے ملتوی ہو گیا۔ اور صدر
اسمبلی نے مجھ سے گفتگو کی کہ آپ آرمی بل کی حمایت کر سکتے
ہیں کہ نہیں؟ میں نے کہا کہ دو شرطوں پر کر سکتا ہوں۔ ایک
یہ کہ فوجی تناسب جو اس وقت ہے۔ وہ ہمیشہ قائم رہے۔
دوسرے یہ کہ مسلمان فوج مسلمانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ بھیجی
جائے۔ چنانچہ یہ شرطیں منظور کر لی گئیں اور میں نے آرمی
بل کی حمایت شروع کر دی۔"

وفد نے کہا کہ انگریزی فوج میں مسلمانوں کا بھرتی ہونا مسلمانوں کے لیے
کیسے مفید ہو سکتا ہے؟ اس کا فائدہ سراسر انگریزوں کو ہو گا۔ قائد اعظم
نے کہا کہ :-

"اس میں ذرا غور کیجئے۔ آپ کو جان لینا چاہیئے کہ انقلاب
ناگزیر ہے۔ ہندوستان آزاد ہو کر رہے گا۔ اگر آزادیٔ ہند
کے وقت مسلمان فوج میں نہ ہوئے۔ تو جس کی فوج ہو گی۔
طاقت اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں
کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی ہوں۔ تاکہ انقلاب

کے وقت طاقت مسلمان کے ہاتھ میں رہے۔"

قائد اعظم یہ کہہ کر رُکے اور پھر فوراً سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ :-

"آپ کو حالات کا کچھ علم نہیں۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وقت ایسا آ رہا ہے کہ اگر ان کے ہاتھ میں ہتھیار نہ ہوا۔ تو ان کی جان مال اور عزّت محفوظ نہ رہے گی۔"

وفد کو اگرچہ ملاقات کے لیے آدھ گھنٹہ وقت دیا گیا تھا۔ مگر ڈیڑھ گھنٹہ تک گفتگو ہوتی رہی۔ درمیان میں وفد نے کہا کہ اگر آپ کا کچھ ہرج ہوتا ہو۔ تو ہم گفتگو ختم کر دیں۔ قائد اعظم نے کہا کہ :-

"نہیں۔ دوسرے لوگ جو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیا کہیں گے۔ لیکن آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ میں نہیں جانتا۔ اس لیے آپ جس قدر گفتگو کرنا چاہیں۔ شوق سے کریں۔ میں برابر سنوں گا۔"

جب اس وفد نے واپس جا کر حضرت کو تمام حالات سُنائے۔ تو آپ کو نہ صرف تسلی بلکہ مسرت بھی ہوئی۔ کہ قوم کے اس مخلص رہنما کی نظر صرف آج کے حالات پر ہی نہیں بلکہ آج سے نو دس سال بعد ہونے والے واقعات کو بھی وہ اپنی چشمِ فراست سے برابر دیکھ رہے ہیں۔ جب مجلسِ عام میں اس وفد کی ملاقات کا ذکر آیا۔ اور مخالفین لیگ نے حضرت کو قائد اعظم کی تائید میں پایا۔ تو ان کے عزائم مشئومہ پر اوس پڑ گئی۔

لمحہ فکریہ

اندازہ لگائیے اور انصاف کیجیے کہ ایک دور اُفتادہ غیر معروف قصبہ میں بیٹھا ہُوا یہ دوربین مردِ درویش کس طرح ہندوستان میں پاکستان کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھا۔ تنِ واحد ہے۔ کوئی جماعت نہیں۔ چندہ نہیں

جلسہ نہیں۔ جلوس نہیں۔ اخبار نہیں۔ ماحول سارے کا سارا مخالف ہے۔ حصولِ پاکستان کی باقاعدہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی۔ مگر حضرت تھانوی دامے درمے قدمے سخنے اسی مقصد کے لیے مصروفِ جدّوجہد ہیں۔ جس کا اظہار علامہ اقبال نے ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو ان الفاظ میں کیا تھا کہ:۔

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں (کیونکہ) مسلمانانِ ہندوستان کو اپنی روایات و تمدّن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے۔"

سیاسی کشمکش

سیاسی طوفان

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان میں ایک بے پناہ سیاسی طوفان آیا۔ جس کا آغاز تحریکِ خلافت سے ہوا۔

تحریکِ خلافت

اس تحریک کے زمانہ کا نقشہ خود اس تحریک کے مجاہد مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے یوں کھینچا ہے:۔

"تحریک خلافت کا زمانہ بھی ہندی اسلام کی تاریخ میں ایک یادرہ جانے والا دور گزرا ہے اور جس نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ اس کے سامنے اُس دور کا نقشہ کھینچنا بھی دشوار

ہے۔ ایک بے پناہ ہیجان تھا۔ جوش میں آکر بھائی بھائی سے جُدا ہو رہے تھے۔ باپ بیٹوں سے بیٹے باپ سے "اللہ اکبر کے نعرے اور "محمد علی شوکت علی کی جے" کی آوازیں گھر گھر سے بلند ہو رہی تھیں۔ علماءِ حق کی اکثریت کا فتویٰ حکومت سے ترکِ موالات اور تحریک خلافت کی تائید میں تھا۔ حضرت (تھانوی) کا مسلک اس سے مختلف تھا۔ مسلکِ اجتہاد میں اختلاف تو اسلام کی تاریخ میں شروع ہی سے داخل رہا ہے اور علامہ صحابہ کیا معنی خلفائے راشدین تک کا دور اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔ اور اگر اختلاف کی بنیاد محض حق و اخلاص ہے تو یہ ذرّہ بھر بھی عیب نہیں۔ بلکہ عین رحمت ہے۔ لیکن محققین کے اتباع و پیرو خود سب کب محقق ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ محق ہوتے ہیں۔ اور محقق اور محق کے حدود میں ہمیشہ وہی فرق ہوتا ہے جو دانا اور نادان میں ہوا کرتا ہے۔ محق اہلِ حق میں سے کسی ایک سردار یا شیخ کی پیروی اندھا دھند کرنے لگتا ہے۔ اور اس ایک راہ کے سوا سب کچھ باطل سمجھتا ہے۔ اور محقق اہلِ حق کے اختلاف باہمی کے سبب و منشا پر نظر رکھتا ہے۔" (حکیم الاُمّت ص ۴۸-۴۹)

شورش اور فتنہ

اُس وقت نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ مسلمان کے بڑے بڑے ذمہ دار لیڈر (جن میں عالم بھی شامل تھے یہ کہتے پھرتے تھے کہ :-

۱- زبانی جے پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے۔ بھائیو! خدا کی رسی مضبوط پکڑو گے۔ اگر

ہم اس رسی کو مضبوط پکڑ لیں گے تو چاہے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے۔ مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی۔ (مدینہ بجنور ۲۱ فروری ۱۹۲۰ء)

۲۔ اے اللہ ہم سے ایک نیک کام ہو گیا ہے۔ کہ میں اور مہاتما گاندھی یقینی بھائی ہو گئے ہیں۔ (فتح دہلی ۲۴ نومبر ۲۰ء)

۳۔ خدا نے ان (گاندھی) کو ہمارے واسطے مذکر بنا کر بھیجا ہے۔ قدرت نے ان کو سبق پڑھانے والا مدبر بنا کر بھیجا ہے۔ (بحوالہ صدر)

علاوہ ازیں مشرکین کو مساجد میں لے جا کر واعظ مسلمین بنانا۔ ان کے قدم کو شہر کی خاک پاک کرنے والا کہنا۔ ان کے جائے قدم کو قصور بہشتی پر طعنہ زن کہنا۔ ان کو مسیحا کہنا۔ ان کو رحمت دارِ رکھنا۔ ان کی ثنا میں یہ کہنا کہ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔ گائے کی قربانی کا بند کرنے کا اہتمام کرنا۔ قشقے لگوانا۔ مشرک کی ارتھی اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی جے بولتے ہوئے مرگھٹ لے جانا۔ ڈولہ سجا کر قرآن مجید کو رامائن کے ساتھ رکھنا۔ یہ کہنا کہ ہم ایسا مذہب بنانا چاہتے ہیں۔ جو ہندو مسلمان کا امتیاز اٹھا دے گا۔ اگر کوئی ان نتائج کے سبب یا شرعی مانع کے سبب شرکت نہ کرے۔ اس کو کافر یا فاسق کہنا۔ اس سے عداوت رکھنا۔ اسے ایذا پہنچانے کی فکر کرنا۔ معمولات سے ہو گیا تھا۔ اس لیے حضرت تھانوی نے آغاز ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ میں ایک اعلان بعنوان "مسائل حاضرہ کے متعلق احقر اشرف علی کا مسلک" شائع کیا۔ اس میں ایک فقرہ یہ تھا کہ "میں ان شورشوں کو ایک فتنہ سمجھتا ہوں" جس سے خلافت کے پروانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اور انھوں نے ان خرابیوں کو دور کرنے کی بجائے ان خرابیوں کی نشاندہی کرنے والے کو ہی ختم کر دینا مناسب سمجھا۔

قاتلانہ حملہ

صاحب حیاتِ اشرف لکھتے ہیں کہ:۔

"عین اُس طوفانی دور میں آپ نے اپنی جان و عزت کی فکر کیے بغیر جو کچھ حق سمجھتے تھے۔ اس کو برملا پیش کیا۔ اس کے صلہ میں الزامات ملے۔ کسی نے انگریز کا پٹھو کہا۔ کسی نے کہا کہ یہ تو مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب اس کے باوجود اپنے مسلک میں حضرت کو مستحکم پایا۔ تو "آزادی" کا نعرہ بُلند کرنے والوں نے اشرار کی جماعت تھانہ بھون میں بھیجی۔ تاکہ اس زبان ہی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے۔ جس سے یہ خلاف مرضی باتیں نکل رہی تھیں۔

یہ ٹکڑی آئی۔ اور لاٹھیوں سے مسلح راستہ کے کنارے چھپ گئی۔ تاکہ صبح جب حکیم الاُمّت مسجد جا رہے ہوں تو ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ مولانا تھانوی کو اس کی اطلاع ملی۔ آپ مراقب ہوئے۔ میلان قلبی یہی رہا کہ مسجد جایا جائے حسب معمول ایک ہاتھ میں قندیل اور ایک ہاتھ میں عصا لیے ہوئے صبح صادق سے پہلے ہی گھر سے چل پڑے۔ جب اس مقام پر پہنچے جہاں غنڈے چھپ رہے تھے۔ تو ان پر اس درجہ ہیبت طاری ہوئی کہ سب کے سب بے تحاشہ وہاں سے بھاگ پڑے۔ اور پہلی ٹرین کے ذریعہ تھانہ بھون سے چلے گئے۔ اور پھر کسی نے ایسی جرأت نہ کی ؎

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست
ہیبتِ ایں مردِ صاحب دلق نیست

ندامت و خجالت

یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن جو اعتدال اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو آپ بحیثیت مجتہد اپنی رائے میں بہت مستحکم تھے مگر چونکہ یہ مسئلہ بالکل اجتہادی تھا۔ اس لیے خود اپنے حلقۂ ادارت کے علماء کو بھی اختلاف رائے کی پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ البتہ جب بعض علماء نے حدود سے تجاوز کیا۔ اور خود آپ کو اپنی قائم کردہ رائے کے سامنے غلط ٹھہرانے کی سعی کی۔ اور جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے۔ تو حکیم الامت نے ان کو اپنے زمرہ سے نکال دیا۔ بعد کو جب خلافت کی تحریک کی آندھی ختم ہوئی اور حکیم الاُمّت کے محسوس کردہ خدشات حقائق بن کر سامنے آ گئے تو پھر ان حضرات کو ندامت و خجالت بیان سے باہر رہی لیکن اس نقصان کی تلافی نہ ہو سکی۔"

(حیات اشرف ص۲۲۵-۲۲۶)

دوسرا دور

۱۹۳۰ء نے بساطِ ریاست کے مہرے بدل دیئے۔ مولانا محمد علی جوہر نے بعض تلخ تجربات کی بناء پر کانگرس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کی پرواکیے بغیر نمک سازی کے ذریعہ سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی۔ اس انتشار سے جمعیتہ العلماء بھی نہ بچ سکی۔ اس کا ایک بڑا حصہ تو کانگرس کے ساتھ رہا۔ مگر قلیل حصہ اس سے کٹ کر ہمیشہ کے لیے الگ ہو گیا۔ اور اس نے اپنی الگ جمیعتہ بنالی۔

مسلمانوں نے بھی غیرت کا ثبوت دیا۔ اُنھوں نے جب اوائل ۱۹۳۰ء میں دیکھا کہ گاندھی جی کو ہماری ضرورت نہیں۔ تو اُنھوں نے بھی اواخر ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے پاکستان کا مہرہ آگے کر دیا۔ کہ اگر تمھیں ہماری ضرورت نہیں۔ تو ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر رہنے کے لیے تیار نہیں۔ آپ اپنے گھر میں خوش رہیں اور ہمیں ہمارا حصہ تقسیم کر کے دے دیں۔ تا کہ دونوں علیحدہ علیحدہ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

سیاسی مسلک

سیاسی حالات نے ملک کو تین پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انگریز کانگرس اور مسلم لیگ۔ انگریز برسرِ اقتدار تھا۔ کانگرس کی پشت پر ساری ہندو قوم اور اکثر مسلم سیاسی جماعتیں تھیں۔ مسلم لیگ کے ساتھ سوائے عافیت پسندوں کے اور کوئی نہ تھا۔ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہُوا تھا۔ انگریز اور ہندو دونوں ان کی کمزوری کا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے اس لیے حضرت تھانوی:-

"انگریزی حکومت اور کانگرس کے درمیان رسہ کشی میں مسلمانوں کو بالکل غیر جانب دار اور یکسو دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان خود اپنے اندر پوری قوت نہیں پیدا کر لیتے۔ ان کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہو کر عملی حصہ لینا خودکشی کے مترادف ہو گا۔ اور سارا زور اس پر دیتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنے میں قوت و نظم پیدا کریں۔" (حکیم الامت ص ۲۷۶)

طلبا اور سیاست

اس زمانہ میں حضرت تھانوی دارالعلوم دیوبند کے سرپرست تھے

جس کے اکابر جمیعتہ العلماء ہند کے ممبر ہونے کی وجہ سے کانگرس کے ساتھ تھے ان کی دیکھا دیکھی دار العلوم کے طلباء نے بھی سیاست میں عملی حصّہ لینا شروع کر دیا۔ جو حضرت تھانوی کو سخت ناگوار گزرا۔ حضرت تھانوی کی رائے تھی کہ:۔

"موجودہ سیاسیات کا اشغال خواہ فی نفسہٖ حق ہو یا باطل۔ مگر دار العلوم کے طلباء و علماء کی اس میں شرکت بہر حال مدرسہ کے مقاصد اصلیہ کو متزلزل کر دینے والی ہے جس کا مشاہدہ و تجربہ بھی عرصہ سے اکثر حضرات کو ہو چکا ہے"

(خاتمۃ السوانح صـ۲۴)

اس لیے آپ نے مہتمم مدرسہ کی تائید سے ایک اعلان شائع کر دیا کہ آئندہ کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں قطعاً حصّہ نہ لیں اس سے باب نزاع کھل گیا۔

سرپرستی سے استعفیٰ

حضرتؒ کی یہ عادت تھی کہ اختلاف کے مواقع پر جو بات بھی حق سمجھتے تھے۔ اس کا صاف صاف اظہار اور اعلان فرمادیتے تھے اگر اسے قبول کر لیا جاتا تو بہتر۔ ورنہ خود کو اس سے علیٰحدہ کر لیتے تھے۔ اور مناظرہ و مناقشہ میں پڑنا پسند نہ فرماتے تھے۔ دار العلوم دیوبند چونکہ حضرت کا علمی گہوارہ تھا۔ اور بزرگوں کا مرکز تھا۔ اس لیے حضرت کو اس سے بہت محبت تھی۔ جس کا کوئی دوسرا اندازہ بھی نہیں کر سکتا ارباب مدرسہ نے اس معاملہ میں آپ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس لیے مدرسہ کے مفاد کی خاطر مدرسہ کی سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن مدرسہ کی ہمدردی اور بہی خواہی کا تعلق برابر قائم رکھا۔

جھانسی الیکشن

کانگرس اور مسلم لیگ کی میدانی جنگ کا آغاز جھانسی کے ایک ضمنی الیکشن

سے ہوا۔ جو مسلم لیگ کو ۱۹۳۵ء میں لڑنا پڑا۔ کانگریس مسلم لیگ کے مقابلہ میں بڑے بڑے علماء لے آئی۔ اور لیگ کے کیمپ میں مولانا صرف شوکت علی مدیر "خلافت" اور مولانا مظہر الدین مدیر "الامان" نظر آتے تھے۔ جنھیں صرف "اخباری مولوی" سمجھ کر دیوبندی علماء کے مقابلہ میں لوگوں نے کوئی اہمیت نہ دی اور وہ مولانا شوکت علی سے کہنے لگے کہ کانگریس کی حمایت میں تو بڑے بڑے عالم آتے ہوئے ہیں مگر مسلم لیگ کی حمایت میں کوئی بڑا عالم نظر نہیں آتا۔ جب ہر طرف سے یہی سوال ہونے لگا۔ تو مولانا شوکت علی بہت پریشان ہوئے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ آخر ان کی نظر تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ پر جا کر رکی۔ انھوں نے خیال کیا کہ جھانسی کی پہلی سیاسی جنگ میں حضرت تھانوی کا ایک پیغام ہی نقشہ جنگ بدل سکتا ہے۔ اس تصور سے مولانا سنبھلے اور مستفسرین سے فرمایا کہ آپ کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی پر اعتماد ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو فرمایا بس انہی سے تار دے کر پوچھ لو۔ ووٹ کس کو دیا جائے۔ چنانچہ اُسی وقت حضرت تھانوی کو تار دیا گیا کہ ووٹ مسلم لیگ کے اُمیدوار کو دیا جائے یا کانگریس کے اُمیدوار کو۔

تائیدِ اشرف

حضرت تھانوی رح کانگریسیوں کے عزائم سے بخوبی آگاہ تھے۔ مگر مسلم لیگ والوں سے بھی کچھ مطمئن نہ تھے۔ اس لیے آپ نے اب تک شرح صدر کے ساتھ مسلم لیگ کی حمایت کا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ مگر کانگریس کے ضرور مخالف تھے۔ اس لیے تار ملنے پر آپ نے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے بغرض مشورہ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کو بلایا۔ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ آپ صرف یہ تار دے دیں کہ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے۔ حضرت رح کو یہ رائے بہت پسند

آئی اور اُسوقت اُسی مضمون کا جھانسی تار دے دیا گیا۔ تار کا پہنچنا تھا کہ مولانا شوکت علی کی جان میں جان آئی۔ اُنھوں نے اپنے استصواب اور حضرت کے جواب کے بڑے بڑے پوسٹر چھپوا کر شہر کے در و دیوار پر چسپاں کرا دیئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھتے دیکھتے میدانِ الیکشن کا نقشہ بدل گیا۔ کانگرسی علماء وہ اثر پیدا نہ کر سکے۔ جو حضرت کے ایک تار سے پیدا ہوا۔ کانگرس کو شکستِ فاش ہوئی۔ اور میدانِ مسلم لیگ کے ہاتھ میں رہا۔

کامیابی کا شکریہ

چونکہ حضرت تھانوی کے تار نے مسلم لیگ کی بگڑی بنا دی تھی اس لیے مولانا شوکت علی اور مولانا مظہر الدین دونوں اپنے اس محسن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جنھوں نے آڑے وقت میں ان کی امداد کی تھی۔ تھانہ بھون پہنچے۔ دربار اشرفیہ میں باریابی کے بعد مولانا شوکت علی صاحب نے حضرت کے تار کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ

"جھانسی کے میدان میں ہمارے پاس کانگرس کے برابر نہ لاریاں تھیں۔ نہ روپیہ پیسہ تھا۔ آپ کے تار نے کچھ ایسا اثر کیا کہ کایا پلٹ دی۔ مسلمانوں میں یکایک مسلم لیگ کی حمایت کا جوش پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ہم کامیاب ہوئے۔"

تھانہ بھون میں جلسہ

اُسی رات ان ہر دو حضرات کی درخواست پر تھانہ بھون میں مسلم لیگ کی طرف سے ایک جلسہ عام ہُوا۔ جس میں اُنھوں نے جھانسی کے الیکشن کے حالات لوگوں کو سُنائے کہ کس طرح بے سر و سامانی کے عالم میں انھیں فتح نصیب ہوئی۔ اس جلسہ میں حضرت تھانوی کی اجازت سے مولانا ظفر احمد صاحب

عثمانی نے بھی لیگ کے حق میں پہلی تقریر فرمائی۔

نیا مدّوجزر

اس کے کچھ عرصہ بعد کانگرس برسرِ اقتدار آگئی۔ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ وہاں اُنھوں نے اپنی حکومت بنائی۔ اور حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر اُنھوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کی مہم بڑی تیزی سے شروع کر دی۔ پنڈت نہرو نے بھی اس نشہ سے سرشار ہو کر مسلمانوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں انگریز اور کانگرس۔ با ایں ہمہ ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں کانگرس کے ساتھ رہیں یوں یوں ہندوؤں کا تشدد بڑھتا گیا۔ مسلم لیگ قوت پکڑتی۔ حالات روز بروز بدلتے بلکہ بگڑتے گئے اور نئے نئے سوالات پیدا ہوتے گئے۔ اب لوگ بڑی کشمکش میں مبتلا تھے کہ کس کا ساتھ دیں۔ جس کی وجہ سے روزانہ حالاتِ حاضرہ کے متعلق تھانہ بھون بیسیوں استفسار آرہے تھے۔

مصالحت کی کوشش

اگرچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا:۔

"طبعی رنگ درویشانہ یکسوئی کا تھا۔ اس کا مقتضا یہ تھا کہ ان سیاسی تحریکات میں آپ کوئی دخل نہ دیتے۔ لیکن اس طبعی رنگ کے ساتھ حق تعالیٰ نے آپ کو ایک مجددانہ اصلاح و تربیت اور ہمدردی خلق کا وہ جذبہ صادقہ عطا فرمایا تھا۔ جو آپ کو اکثر بے چین کیے رکھتا تھا۔ اور اسی وجہ سے جب ملک میں کوئی ہنگامی تحریک شروع ہوتی۔ اس پر شرعی حیثیت سے اور تجربہ کارانہ بصیرت کے ساتھ نظر ڈال کر اپنے نزدیک اس کے

حسن و قبح اور پھر صحیح راہِ عمل واضح کر دینے کا معمول رہا۔"

(افادات اشرفیہ ص۲)

ایک طرف تو کانگرس میں مسلمانوں کے بلا شرط داخلہ کے خطرناک عواقب قریباً سامنے آ گئے تھے۔ اور اب اس بات کی ضرورت پیدا ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کو قوت کے ساتھ کانگرس میں شمولیت سے روکا جائے اور دوسری طرف رہنمائی کے لیے خطوط پر خطوط آ رہے تھے اس لیے آپ نے ملک کی دو مسلمان سیاسی جماعتوں یعنی مسلم لیگ اور جمیعتہ العلماء ہند کے درمیان مصالحت کرانے کی غرض سے متعدد بار اکابر جمیعتہ العلماء سے گفتگو فرمائی۔ پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ ایک تاریخ کو ارکان جمیعتہ العلماء اور ارکان مسلم لیگ کو جمع کر کے بالمشافہ دونوں سے بات چیت کی جائے۔ مگر بعض عوارض کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ تو اس کا بدل یہ کافی سمجھا گیا کہ ان دونوں جماعتوں سے ضروری سوالات کے ذریعہ تحقیق حال کی جائے۔ اور ان کے جوابات کی روشنی میں مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا تلاش کیا جائے۔ جس سے مسلمان دینی اور سیاسی مضرت سے بچ سکیں۔ چنانچہ کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے حضرت تھانوی کی طرف سے دو سوالنامے مرتب کیے گئے۔ ان میں سے ایک جمیعتہ العلماء ہند کے نام بھیجا گیا۔ اور دوسرا مسلم لیگ کے نام وہ سوالنامے یہ تھے:۔

سوالنامہ بنام جمیعتہ العلماء

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔ ان سوالات میں ابتدائی چند سوالات تو وہ ہیں۔ جو ہماری طرف سے ہیں۔ جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ حالت حاضرہ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے پوری طرح حالات و واقعات کا علم ہو جائے اور بعد کے چند سوالات وہ ہیں جو دوسرے لوگ جمیعتہ علماء ہند کے متعلق کیا کرتے ہیں۔ جن کا واقعی جواب علماء ہی دے سکتے ہیں کہ اس کو ان واقعات و حالات

کی زیادہ خبر ہے۔

ابتدائی سوالات

الف۔ جمیعتہ علماء کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کیوں ضروری ہے۔ اور کانگرس سے علیحدگی میں کیا ضرر ہے؟

ب۔ کانگرس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت سے انفرادی غیر منظم اور غیر مشروط طریقہ پر اس وقت ہو رہا ہے اور مسلم نشستوں کے لیے کانگرس خود براہ راست اُمیدوار تجویز کرتی ہے۔ کیا اس سے اسلام اور مسلمانانِ ہند کو خطرہ نہیں؟ اگر ہے۔ تو اس خطرہ سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

ج۔ مسلم لیگ سے جمیعتہ العلماء کو کیوں اختلاف ہے جبکہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے اور اس کا مقصد بھی آزادی کامل کا تخیل ہے۔ جیسا کہ اس سال لکھنؤ کے اجلاس میں اس نے اعلان کر دیا ہے۔

د۔ اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکرات شرعیہ موجود ہیں۔ تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمیعت علماء مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو مخلص اور فعال لوگوں سے بھر دے اور مسلمانوں کی تنظیم کو مکمل اور مفاسد و منکرات سے پاک کر دے۔

ہ۔ کیا مسلم لیگ اور جمیعتہ علماء کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا نہیں ہوتا اور کیا یہ تشتت مضر نہیں ہے۔ اگر ہے تو جمیعتہ علماء نے اس ضرر کے انسداد کے لیے کوئی صورت اختیار کی ہے یا نہیں۔

نوٹ :- یہ سوال مسلم لیگ والوں سے بھی کیا گیا ہے۔

دوسروں کے شبہات و اعتراضات

ا۔ کانگرس کے ساتھ مل کر جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہو گی اس کا انجام

ایک حکومت مشترکہ کا قیام ہے۔ جس میں عنصر کفر غالب اور عنصرِ اسلام مغلوب ہوگا۔ ایسی حکومت اسلامی حکومت یقیناً نہ ہوگی۔ تو اس کے لیے جدّوجہد کرنا مسلمانوں کے ذمّہ کس دلیل سے واجب ہے۔ نیز اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بالکل بے دخل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی مسلمانوں پر حکومت کرنا نہیں چاہتے۔ کانگرس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے اور مسلمانوں پر بازاروں۔ دیہاتوں ملازمتوں سرکاری محکموں میں جو مظالم وہ برپا کرنے لگے ہیں۔ جمیعتہ العلماء نے ان کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کے لیے کوئی عملی قدم اُٹھایا ہے۔ یا نہیں؟

۲۔ کانگرس وزارتوں نے زمینداروں کی اراضی کاشتکاروں کی مملوک بنا دینے کی جو تجویز سوچی ہے۔ یقیناً صریح ظلم ہے اور جو لوگ کانگرس میں شریک ہیں وہ سب کے سب اس ظلم میں شریک ہیں۔ پھر اس سے بچنے کی جمیعت علماء نے کیا تدبیر کی اور کون سا عملی قدم اُٹھایا ہے۔

۳۔ کانگرس میں بندے ماترم کا گیت گایا جاتا ہے۔ جو مضامین شرکیہ پر مشتمل ہے۔ اور قومی جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے۔ جو قریب بہ شرک ہے۔ کانگرسی مسلمان بھی بندے ماترم کے گیت کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں۔ کیا ان افعال میں شرکت کرنا گناہ نہیں؟ اگر ہے۔ تو جمیعتہ علماء نے مسلمانوں کو اس کے متعلق کیا ہدایت کی۔ اور اس پر اور اسی قسم کے دوسرے منکرات پر صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں۔

۴۔ صدر کانگرس اور اس کی ہم خیالی جماعت جو اشتراکیت کی حامی اور مذہب اور خدا کی دشمن ہے۔ ان کی تقریر خدا اور مذہب کے خلاف شائع ہوتی رہتی ہے۔ جمیعتہ علماء نے ان کے خلاف کوئی صدائے

احتجاج بلند کی۔ یا نہیں۔ اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم و تکریم سے روکا ہے یا نہیں۔

۵۔ کانگرس کے ساتھ جو آزادی حاصل ہو گی۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مذہبی وسیاسی حقوق کی پوری طرح حفاظت ہو گی جبکہ کانگرس اور اُس کے ذمہ داروں کے مذہب اور حقوق کا نام لینا بھی جُرم سمجھتے ہیں۔ اور اس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ نیز جمیعتہ علماء نے کانگرس کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حقوق کے تحفظ میں اس وقت تک کیا کام کیا ہے۔

۶۔ جمیعت علماء نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کے لیے کوئی عملی قدم اُٹھایا ہے یا نہیں جس کی مذہبًا و سیاستًہ سخت ضرورت ہے اور ان کے اسلام میں داخل ہو جانے کی بھی قومی اُمید ہے۔

سوالات از مسلم لیگ

۱۔ آپ کے نزدیک کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت سیاسی حیثیت سے کیوں مضر ہے اور اس سے علیٰحدگی کیوں ضروری ہے اکثر لوگ پوچھتے ہیں۔ تو ہم ناواقفیت کے سبب جواب نہیں دے سکتے۔

۲۔ کیا بدوں کانگرس کے تعاون کے ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے اگر مل سکتی ہے۔ تو اس کی جو صورت آپ کے ذہن میں ہو۔ اس کو واضح فرمایا جائے۔

۳۔ کیا کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی آزادی ہندوستان کے مسئلہ میں باعث تعویق و تاخیر ہو گی۔

۴۔ کیا مسلم لیگ تمام مسلمانوں کو یا ان کی زیادہ تعداد کو کانگرس سے روک سکتی ہے بظاہر یہ امر مستبعد ہے۔ کانگرس میں پہلے ہی سے مسلمان

بہت ہیں اور جب سے وزارت قبول کر کے وہ برسر اقتدار ہوئی ہے۔ زیادہ تعداد اس میں شریک ہو رہی ہے۔ پس اگر مسلم لیگ نے تھوڑے سے مسلمانوں کو کانگرس سے روک لیا۔ تو کیا نفع کی اُمید ہے۔ جبکہ زیادہ حصّہ اس میں شریک ہو گا۔

۵۔ کیا مسلم لیگ کے زیادہ تر ارکان انگریزوں کے حامی اور اندرونی طور پر ان کے بہی خواہ ہیں۔ اور کیا بقول سر اکبر حیدری مسلم لیگ ایک برطانوی زہر ہے (مدینہ اخبار ۱۲ ر دسمبر ۳۷ء) اگر نہیں تو اس اعتراض کا اطمینان بخش جواب کیا دیا جاوے۔

۶۔ مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ ایک بے عمل جماعت ہے۔ کانگرس کی طرح اس نے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اُٹھایا۔ نہ مسلمانوں کے فائدہ کے لیے کوئی کام کیا اور اس وقت کانگرس کے مقابلہ پر جو جدوجہد الیکشن میں صرف کر رہی ہے مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ انگریزوں کا نفع ہے کہ کانگرس کی قوت کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کا مسئلہ تعویق میں پڑ جائے۔ اس اعتراض کا کیا حل ہے۔

۷۔ مسلم لیگ نے اب تک مسلمانوں کی تنظیم اور ان کی مذہبی و تمدنی و اقتصادی ترقی کے لیے کیا طریق عمل اختیار کیا۔ اور اس کے لیے کونسا عملی قدم اٹھایا۔ یا آئندہ کیا ارادہ اور ذہن میں اس کی کیا صورت ہے۔

۸۔ اگر کسی وقت ہر طرح سے اطمینان حاصل کر کے مسلم لیگ کو کانگرس میں شامل ہونے کی ضرورت ہوئی۔ تو کیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس میں شامل ہونے کی رائے ہے یا مسلم لیگ کو قائم رکھ کر مسلمانوں کے اقتدار کو برقرار رکھتے ہوئے شرکت کی رائے ہے۔

۹۔ اگر علماء مسلم لیگ کا ممبر بننا چاہیں۔ تو کیا ان کو بھی الیکشن ہی کے ذریعہ مسلم لیگ کا عہدہ حاصل ہو گا۔ جس سے ان کو مسلم لیگ کے اجلاس اور

مجلس عاملہ وغیرہ میں اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہو۔ یا اگر وہ اس ذریعہ کو پسند نہ کریں۔ تو ان کو بدوں اس ذریعہ کے بھی ایسا درجہ مل سکے گا۔

۱۰۔ جمیعت علماء ہند دہلی اور مسلم لیگ کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت وافتراق پیدا ہو رہا ہے لیگ نے اس کے ضرر کو محسوس کیا ہے۔ یا نہیں۔ اگر کیا ہے تو اس ضرر کے انسداد کی کوئی صورت باہمی اتفاق کی سوچی ہے۔ یا سوچنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

نوٹ :۔ یہ سوال، جمیعت علماء دہلی سے بھی کیا گیا ہے۔

۱۱۔ مسلم لیگ میں علماء کی وقعت کس درجہ کی ہوگی۔ اور بصورت اختلاف علماء کسی مسئلہ مختلف فیہا کو کس طرح طے کیا جائے گا۔ کیا اس کے لیے کوئی قاعدہ ذہن میں ہے۔

۱۲۔ مسلم لیگ نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے یا نہیں (جو نہ صرف مذہبًا بلکہ سیاستہً بھی نہایت اہم ہے) اگر کیا ہے تو اس کے لیے عملی قدم اُٹھایا گیا ہے یا نہیں اور اس کا نتیجہ کیا ظاہر ہُوا۔ اگر اب تک نہیں۔ تو آئندہ کیا رائے ہے۔

جمیعتہ علماء کا سکوت

یہ سوالات صرف حضرت کی سیاست دانی کے ہی نہیں بلکہ معاملہ کی اہمیّت وافادیت کے بھی شاہد ہیں کہ حضرت نے کس طرح مسلمانوں کے انتشار کو دور کرنے اور ان کے مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے ان اہم سوالات کے ذریعہ حالات کی پوری پوری تحقیق کرنے اور مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی سعی بلیغ کی کہ ان کا انفرادی وجود بھی قائم رہے اور قوم کا اجتماعی مفاد بھی محفوظ رہے۔ مگر ارباب جمیعتہ العلماء کی طرف سے اس سوالنامہ کا بار بار کی یاد دہانی کے باوجود کوئی جواب نہ ملا۔

زعماء مسلم لیگ کا جواب

مسلم لیگ والوں نے حضرت کی مخلصانہ مساعی کے عملی اعتراف کے طور پر نہایت مفصل اور جامع و مانع جواب دیا۔ جس سے اس جدّوجہد آزادی کا تمام پس منظر سامنے آجاتا ہے۔ اور اس لیے یہ طویل جواب یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ ورنہ طوالت کا خوف اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ زعماء لیگ کا یہ جواب نواب محمد اسماعیل خاں صاحب ایم ایل اے۔ بیرسٹر۔ صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ و سید حسن ریاض صاحب و دیگر اراکین کے مشورہ سے تحریر ہُوا۔ اور سید ذاکر علی جائنٹ سیکرٹری مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ صوبہ متحدہ نے دسمبر ۱۹۳۷ء کو حضرت کی خدمت میں روانہ کیا۔ جو درج ذیل ہے :۔

ا۔ بحث یہ ہے کہ مسلمان اجتماعی حیثیت سے کانگرس کے ساتھ تعاون کریں یا انفرادی حیثیت سے کانگرس میں داخل ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں سیاسی حیثیت سے کانگرس میں انفرادی شرکت اس لیے مضر ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کانگرس میں ہمیشہ اس قدر کم تعداد میں رہیں گے کہ کانگرس کے مسلک اور عمل پر ان کی رائے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نیز مسلمان ارکان کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں کانگرس کے بااختیار اداروں میں شاذ و نادر ہی منتخب ہو سکیں گے۔ کانگرس کی ان دونوں بااختیار کمیٹیوں میں اس وقت تک مسلمانوں کا جو تناسب رہا ہے۔ اس سے یہ اچھی طرح ثابت ہو رہا ہے کہ اندیشہ یہ بالکل صحیح ہے۔ غالباً آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اکیس ارکان میں سے صرف دو مسلمان ہیں۔ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے تقریباً تین سو ارکان میں سے سات یا آٹھ مسلمان ہیں۔ انتخاب مخلوط نشستوں کا یقین نہیں۔ کانگرس میں ہندو ووٹروں کی تعداد زیادہ

ہے۔ اس صورت میں کبھی توقع نہیں جاسکتی کہ مسلمان بااختیار کمیٹیوں میں اتنے ہوسکیں گے کہ وہ کانگرس کے فیصلوں اور طرز عمل پر کوئی اثر ڈال سکیں۔ اس سلسلہ میں کانگرسی مسلمان کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ کثیر تعداد میں کانگرس کے ممبر بنیں۔ اور اس طرح کانگرس پر قبضہ کرلیں۔ یہ خیال غلط ہے ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں باعتبار تعداد زیادہ آگے ہیں۔ اور ہندو عورتیں بھی کانگرس کی ممبر بنتی ہیں۔ اور اس میں شریک ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتیں اگر ممبر بھی بن جائیں۔ تو پردے کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکتیں۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ اپنی ساری آبادی کو کانگرس کا ممبر بنوادیں۔ ہندو بھی یہی کریں گے۔ اس صورت میں ہندو مرد اور عورتیں مل کر مسلمان مرد ممبروں سے تقریباً پانچ گنے ہو جائیں گے۔ اور کانگرس کی ہر کمیٹی کا فیصلہ انہی کی رائے پر منحصر ہوگا۔ مسلمان کبھی یہ توقع نہیں کرسکتے کہ ان کی کوئی تجویز کانگرس میں منظور ہوسکے گی۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ان چار صوبوں کی کانگرس میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یعنی صوبہ سرحد۔ پنجاب۔ سندھ اور بنگال کی ہر کمیٹی میں مسلمانوں کی اکثریت رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ کانگرس کے نظام میں دونوں کو موجودہ انگریزی نظام حکومت کی طرح صوبجاتی خود اختیاری حاصل نہیں ہے کانگرس اس وجہ سے کہ چار صوبوں میں مسلمانوں کو بااختیار اکثریت نہ ہو۔ صوبجاتی خود اختیاری کے خلاف ہے۔ اور مرکزی وحدانی طرز انتظام پر مصر ہے۔ کامل آزادی کے مسلک میں متفق نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں اور کانگرس کے درمیان یہ مسلسل اختلاف رہا ہے۔ مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں جو بات طے کریں گے۔ وہ مرکزی وحدانی طرز حکومت ہونے کی صورت میں کانگرس یعنی آل انڈیا کانگرس کے اجلاس۔ کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں نامنظور ہو جائے گی جہاں مسلمان ارکان کا تناسب چوتھائی سے زیادہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر مسلمان اس طرح کانگرس میں

شریک ہو گئے۔ تو ان کی یہ حیثیت ہو گی۔ کہ ان کی موجودگی میں ان کے مفاد کے خلاف فیصلے ہوں گے۔ اور آئینی اصول کے مطابق ان کو اکثریت کے فیصلوں کو ماننا پڑے گا۔ اور اس کے باوجود کہ وہ سکوت کریں یا اختلاف کریں۔ وہ ان مخالف فیصلوں کے ذمہ دار تصوّر کیے جائیں گے۔ اور کانگرس کے باہر بھی ان کو اختلاف کا کوئی حق نہ رہے گا۔ لیکن اگر مسلم لیگ کے ماتحت اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم کریں۔ تو وہ ہندوستان میں ایک دوسری طاقت ہوں گے۔ جو تعداد کے اعتبار سے کم ہو۔ مگر دوسری حیثیت سے اکثریت کے مقابلہ میں زیادہ طاقت ور ہو سکتا ہے۔ یقیناً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک اور اتحاد کے بغیر ہندوستان کا بظاہر آزاد ہونا ممکن نہیں۔ لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا مشترکہ مفاد اور مقصد ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہندوؤں سے ملنے کی جتنی طلب ہے۔ اتنی ہی ہندوؤں کو بھی ہونی چاہیئے۔ لہٰذا کانگرس اور اخلاص کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی طالب ہو۔ تو اس کو مسلم لیگ کے جائز مطالبات طے کرنے پڑیں گے۔ اور ہر اہم معاملہ میں مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گی۔ انفرادی حیثیت سے کانگرس میں شرکت سے مسلم اقلیّت ہندو اکثریت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جداگانہ تنظیم کی صورت میں مسلمانوں کی اجتماعی قومی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ کانگرس میں شریک ہو کر مسلمان جو بات کہیں گے۔ وہ اکثریت کی آواز سے فی الفور دب جائے گی۔ اور جو بات مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہیں گے۔ وہ جُداگانہ ہونے کی حیثیت ساری دنیا میں سنی ہو جائے گی۔ کانگرس میں شریک ہو کر مسلمان اپنے خاص مفاد کے لیے کوئی جداگانہ عمل نہ کر سکیں گے۔ اور جداگانہ اسلامی تنظیم کے ماتحت ہر عمل ان کے اختیار میں ہو گا۔

جواب سوال نمبر۲۔ کانگرس کے تعاون کے بغیر یا دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کے تعاون کے بغیر مسلمان یقیناً ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتے لیکن یہ کیا ضروری

ہے کہ کانگرس کا تعاون انھیں شرائط پر حاصل کیا جائے جو کانگرس میں پیش کرے۔ یعنی ہر مسلمان چار آنہ کا ابتدائی ممبر بنے۔ اور انفرادی حیثیت سے بلا مسلم مفاد کے تحفظ کی شرائط منواتے ہوئے کانگرس میں داخل ہو کر اپنی اسلامی حیثیت کو گم کر دے۔ اور محض ہندوستانی رہ جائے۔ اسی طرح کیوں نہ ہو کہ مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت اپنی تنظیم کریں۔ اور مسلمانوں کی انجمن مسلم لیگ اور ہندوؤں کی انجمن کانگرس کے درمیان تمام مشترکہ مفاد کے حصول کے لیے اور نیز آزادی حاصل کرنے کے لیے بشرائط اس قسم کا معاہدہ اتحاد ہو۔ جیسا دو حلیف قوموں کے درمیان ہوتا ہے۔ اہم معاملات کے تصفیہ کے لیے کانگرس کی مجلس عاملہ اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس ہوں۔ اور ان اجلاسوں میں جو فیصلے ہوں۔ ان پر دونوں انجمنیں اور دونوں قومیں کاربند ہوں کیا انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی اپنی قومی انفرادیت کو مٹائے بغیر جرمنی کے خلاف جنگ نہیں کی۔ کانگرس کا تعاون حاصل کرنے کی دوسری اور مسلمانوں کے حق میں بہتر صورت یہ ہے۔ کہ اگر مسلمان مسلم لیگ کو مستحکم اور مضبوط کر لیں اور کانگرس میں شریک نہ ہوں تو یقیناً کانگرس اس طریقہ پر مسلمانوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہو گی۔

جواب سوال نمبر۳۔ کانگرس میں مدغم ہونے کے بعد جب مسلمان یہ دیکھیں گے کہ ان کی رائے اور آواز بے اثر ہے اور وہ اپنے قومی مفاد کے خلاف ہندوؤں کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں۔ تو آزادی حاصل کرنے کا یہ جذبہ ان کے دلوں میں سرد ہو جائے گا۔ اور آزادی کی تحریک بعد جنگ مسلمانوں کی ہمت اور عمل سے اس طرح محروم ہو جائے گی۔ جس طرح کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے تحفظ کے لیے جنگوں میں ہندوستانیوں کے طبعی جوش مدافعت وطن اور جوش ملک گیری سے محروم ہے اور صرف روپیہ دے کر ان کو لڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لہٰذا اس طرح حصولِ آزادی میں تعویق اور تاخیر زیادہ ہو گی۔ لیکن اگر مسلم لیگ میں مسلمان رہے اور کانگرس میں ہندو رہے۔ ان دونوں کے درمیان اس طرح اتحاد قائم

ہوا جیسا کہ دو کے درمیان ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کو اس کا اطمینان ہو گیا کہ ان کی اسلامیت اور قومی انفرادیت محفوظ ہے اور آزاد ہندوستان میں وہ بھی آزاد قوم کی حیثیت سے رہیں گے تو مسلمان اپنے مفاد کے لیے اور ہندو اپنے مفاد کے لیے حلیفوں کی حیثیت سے خالص وطنی آزادی کے جذبہ سے جنگ کریں گے۔ یہ جنگ جس قسم کی بھی ہو زیادہ طاقت ور ہو گی اس سے آزادی جلد حاصل ہو سکے گی۔

جواب سوال نمبر۴۔ یقیناً مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے روک سکتی ہے۔ اور اس کے باوجود کہ کانگرس برسرِ اقتدار اور اس کی وزارت قائم ہے۔ تجربہ سے ظاہر ہو گیا ہے کہ کانگرس کی حکومت قائم تھی۔ مسلم لیگ نے کانگرس کے مقابلہ میں پانچ الیکشن لڑے۔ ان میں سے چار میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی۔ اور صرف ایک بجنور میں ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کی وجہ بھی حافظ ابراہیم صاحب کا ذاتی اثر اور مسلم لیگ کو کام کرنے کی مہلت کم تھی۔ نیز یہ کہ ابھی تک مسلم لیگ کی تنظیم مکمل اور طاقت ور بھی نہیں ہے۔ پھر تاریخی تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ قوم کی اکثریت اپنے مفاد اور وجود کے تحفظ کے حق میں رہتی ہے۔ حکومت کے موید صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے مفاد براہ راست حکومت سے وابستہ ہوں۔ مثال کے طور پر کانگرس کے سابقہ تحریکات کو لیجیے۔ انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔ ہزارہا ہندو سرکاری ملازم تھے۔ زمیندار۔ خطاب یافتہ اور ٹھیکیدار اور اجارہ دار وغیرہ تھے۔ مگر قوم کی آواز وہی سمجھی گئی۔ جو کانگرس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوئی۔ حکومت کے موید ہندوؤں یا ہندوستانیوں کی تائید ہندوستانیوں یا ہندو قوم کی تائید نہیں سمجھی گئی۔ لہٰذا جو لوگ ذاتی اغراض کے لیے یا کانگرس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر مسلم مفاد کے خلاف کانگرس میں شریک ہوں گے وہ بھی انگریزی حکومت کے پرستار ہندوؤں کی طرح بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ نیز یہ کہ جب مسلم لیگ کا نظام مضبوط

ہو جائے گا۔ اور یہ ناممکن ہو جائے گا۔ کہ کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے یا کانگرس کی طرف سے کھڑا ہو کر مجالس واضعان قانون کا ممبر منتخب ہو سکے۔ اور مسلم رائے عامہ کانگرس کا ممبر ہونا عیب اور مسلم لیگ کا ممبر ہونا اچھا سمجھنے لگے گی۔ تو کوئی مسلمان کانگرس کا ممبر بننا پسند نہ کرے گا۔ اور اس طرح مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگرس میں جانے سے روک دے گی اور بالفرض اگر کوئی چھوٹی سی بے اثر جماعت کانگرس میں رہی بھی۔ تو کانگرس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہو گی۔ چنانچہ ۲۹ء سے ۳۸ء تک یہی ہوا کہ کانگرس ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق کانگرسی مسلمانوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ہر معاملہ میں ان کو نظر انداز کر کے کانگرس کو مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس سے رجوع کرنا پڑتا۔ آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ کانگرس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہرگز شریک نہیں۔ اس قسم کے تمام اعلانات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔ بعض چند افراد ہیں۔ جو کانگرس میں شریک ہیں۔

جواب سوال نمبر ۵۔ اکتوبر ۳۷ء سے مسلم لیگ میں مکمل انقلاب ہوا۔ کامل ذمہ دار حکومت کی بجائے پورا استقلال یا پوری خودمختاری مطمح نظر قرار پایا ہے۔ محدود رکنیت کی جگہ ۲ جلس کی شرط پر رکنیت عام کی گئی ہے۔ گویا اب مسلم لیگ سب سے زیادہ جمہوری انجمن ہے ابتدا سے انتہا تک جتنی کمیٹیاں بنیں گی اور جتنے عہدے دیئے جائیں گے۔ وہ انتخاب کے ذریعہ ہوں گے۔ اس صورت میں انگریزوں کے خوشامدیوں کے دخل کا مسلم لیگ میں کوئی امکان نہیں۔ لیکن بالفرض عام مسلمان انگریزوں کے حامی واقع ہوئے ہیں اور وہ ایسے ہی لوگوں کو منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ جو انگریزوں کے حامی ہیں۔ تو ان کو کون روک سکتا ہے۔ اگر یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ مسلم لیگ کے تمام موجودہ ارکان کی میعاد رکنیت فروری میں ختم ہو جائے گی۔ نئے انتخابات میں امیر اور غریب کو عام ممبر بننے کے وقت اس عہد نامہ پر دستخط کرنے پڑیں گے۔

کہ وہ کامل آزادی کا طالب ہے۔ اس کے بعد وہ انتخابات میں آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ منافقت کرے۔ اور دل میں انگریزوں کا حامی رہے۔ تو اس پر کسی کو قابو نہیں جیسے کوئی شخص توحید و رسالت وغیرہ کا اقرار کرے۔ ہم اس کو مسلمان ماننے پر مجبور ہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ اس پر سوال کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اس طرح کے منافق لوگ خود کانگرس میں بھی موجود ہیں۔ اور کانگرس ان کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ سر اکبر حیدری مسلم لیگ کو جو برطانوی زہر کہہ رہے ہیں اس کے معنی بالکل اور ہیں۔ کیا سر اکبر حیدری نے حیدر آباد میں کانگرس قائم کرنے کی اجازت دے رکھی ہے اور کیا وہ کانگرس کو تریاق سمجھتے ہیں ہر ہندوستانی ریاست سیاسی تحریکات کو اپنے حدود کے اندر داخل ہونے سے روکتی ہے خواہ وہ قومی ہو۔ یا فرقہ وارانہ۔ صاف بات ہے حیدر آباد میں مسلمانوں کو سیاسی استیلاء حاصل ہے۔ وہاں مسلمانوں کے حقوق مفاد اور آزادی خطرہ میں نہیں۔ حکومت انجمن سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ حیدر آباد میں مسلم حکومت موجود ہے۔ اس صورت میں یقیناً وہاں مسلم لیگ کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر حیدرآباد میں مسلم لیگ قائم کی جائے گی۔ تو وہ بجائے سیاسی انجمن کے خالص فرقہ وارانہ انجمن بن کر رہ جائے گی۔ جو حکومت اور ہندوؤں کے درمیان تصادم کا باعث ہو گی۔

جواب سوال نمبر ۶۱۔ غلط ہے کہ مسلم لیگ بے عمل جماعت ہے۔ مسلم لیگ ابتداءً یعنی ۱۹۰۷ء میں اس غرض سے قائم ہوئی تھی۔ کہ برطانیہ سے ہندوستان کو جو مراعات ملیں۔ ان میں سے مسلمانوں کو پورا حصہ دلائے۔ اور مزید مراعات حاصل کرنے میں اکثریت کے ساتھ تعاون کرے۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ کانگرس نے ہندوستان کے لیے سیاسی اختیارات حاصل کرنے کی جب کوئی تحریک شروع کی۔ مسلم لیگ نے اس کی تائید کی۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے متحدہ مطالبہ پر مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ہندوستان کو دی گئیں اور مسلم لیگ کے ذریعہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو محسوس کر کے کانگرس نے ۱۹۱۶ء میں فرقہ وارانہ معاملات

میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ جو ۱۹۳۶ء تک بلا تغیر جاری رہا۔ چونکہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد ابتداءً محض ہندوستان کی اندرونی سیاسی امور تک محدود تھے۔ اس لیے جب جنگ عظیم ہوئی۔ اور خلافت اور اماکن مقدسہ کا مسئلہ سامنے آیا۔ تو انھیں مسلمانوں نے جو مسلم لیگ کے بانی اور رکن تھے۔ خلافت کمیٹی قائم کی۔ خلافت کمیٹی نے جو کچھ کیا۔ اس سے دنیا واقف ہے۔ عملاً اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو خلافت کمیٹی حقیقت میں مسلم لیگ کا شعبہ امور خارجہ تھا۔ ۱۹۲۹ء سے جب نہرو رپورٹ کا فتنہ اٹھا۔ نئے دور موسومہ قانون حکومت ہند ۳۵ء کے بننے تک مسلم لیگ نے ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی اور اس میں مسلمانوں کے حق کے تعین میں جو کچھ کیا۔ اس قانون کے اندر موجود ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ نے کانگرس کے ساتھ مل کر سول نافرمانی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معاملہ میں کانگرس نے مسلم لیگ کو اطمینان نہیں دلایا تھا بلکہ مسلمانوں کے علی الرغم سول نافرمانی شروع کر دی۔ کانگرس کی یہ سول نامتابعت کس مقصد کے لیے تھی۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ کامل آزادی حاصل کرنے کے لیے کی گئی مگر یہ غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب وائسرائے نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ جو مسلمانوں کے مفاد کے لیے سخت مضر تھی۔ تو کانگرس نے اس ضد میں سول نامتابعت شروع کر دی۔ مسلمان اس سول نامتابعت کو اپنے خلاف ہندوؤں کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں اصل طاقت ہندوؤں کی ہے۔ اور مسلمان قابل اعتبار بھی نہیں ہوتا۔ اور مسلمانوں کا یہ خیال صحیح تھا۔ چنانچہ ثبوت میں پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ متکبرانہ قول پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگرس دوسری برطانوی حکومت۔ یہ کہ مسلم لیگ جو کانگرس سے الیکشن لڑ رہی ہے۔ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مخلصین کی طرف سے مسلم لیگ پر ایک بے مغز اعتراض ہے۔ اگر یہ عہدے لے کر مجلس واضعان

قانون کا ممبر منتخب کرنا مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا تحفظ کرے گا۔ جن کے وہ آئین مروجہ کی رُو سے مستحق ہیں۔ تو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ مسلمانوں کو مجالس و اضعان قانون میں بھیجنا ہی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں مسلم لیگ صرف اس غرض کے لیے الیکشن میں جدّوجہد کر رہی ہے کہ صرف ان لوگوں کو بھیجے جو ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی تمدنی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے خلاف کانگریس کی اطاعت کریں۔ اگر یہ بات کہ مسلمان کسی عہد کے ساتھ مجالس و اضعان قانون میں جائیں۔ اس قدر غیر اہم ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ تو کانگریس اپنے قدیم دستور کے خلاف اس مرتبہ الیکشن لڑانے پر اس قدر کیوں مصر ہے کہ اس کو کمزور ہونا منظور اور کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کی تحریک کو تعویق میں ڈالنا منظور مگر مسلم لیگ کے مقابلہ میں الیکشن لڑانا ضرور۔ واضح رہے کہ اس معاملہ میں کانگریس کا عمل جارحانہ ہے کہ مسلم لیگ کا؟ اس اعتراض کا صرف یہ حل ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کا مطمح نظر کامل آزادی ہے۔ مفاد عامہ کے کاموں میں مسلم لیگ کی پارٹی کانگریس کی کوئی مخالفت نہیں کرتی۔ البتہ مسلم اقلیت کے حقوق و مفاد کا تحفظ اس کا رضائی مسلک ہے۔ لہذا کانگریس کو مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی الیکشن نہ لڑنا چاہیے۔ پھر نہ وہ کمزور ہو گی۔ اور نہ آزادی کی تحریک (اگر اس کا کہیں وجود ہے) تعویق میں پڑے گی۔

جواب سوال نمبر۷ ۔ مسلم لیگ نے اکتوبر ۱۹۳۷ء سے قبل ہندو اکثریت کے جارحانہ اقدامات کے مقابلہ میں اپنی مدافعت کر کے مسلمانوں کی دینی مذہبی۔ اجتماعی سیاسی اور اقتصادی تنظیم کی حفاظت کی ہے۔ اکتوبر ۳۷ء سے اس کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اب وہ عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تنظیم میں داخل کر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ رائے عامہ کی تربیت کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کامل اور آزاد ہندوستان

میں مسلم اور دوسری اقلیتوں کے لیے جمہوری تحفظ یعنی اکثریت کے فرقہ وارانہ جبر و استبداد کے امکان کے انسداد کے مقصد پر ہم خیال کرنا چاہتی ہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے۔ وہ تنظیم کے ذریعہ پیدا کر رہی ہے۔ اس غرض کے لیے ہر ہر شہر۔ قصبہ اور موضع میں جمعیت بھرتی کی جارہی ہے۔ اقتصادی خوشحالی کے لیے مسلمان دست کاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے رواج کی کوشش ہے۔ سود منسوخ کرانا مدِنظر ہے۔ اور مسلم لیگ کا جو ارادہ ہے۔ وہ اس کے سالانہ اجلاس کی قراردادوں سے مفصل معلوم ہوگا۔

جواب سوال نمبر ۸۔ اگر کانگرس سے سمجھوتہ ہو گیا اور اکثریت کے جبر و استبداد کا کوئی خطرہ نہ رہا۔ مسلم لیگ اس وقت بھی قائم رہے گی۔ اور اشتراکِ عمل مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ہو گا۔ مسلمان منتشر ہو کر کانگرس میں کبھی شریک نہ ہوں گے۔ مسلم لیگ کی یہ قطعی رائے ہے۔

جواب سوال نمبر ۹۔ اگر علماء مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو ان کو الیکشن کے ذریعہ مسلم لیگ کی با اختیار کمیٹیوں میں آنے سے گریز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو بہترین صورت ہے لیکن خاص حالات میں بہت ہی مقتدر علماء کے لیے جو الیکشن کے ذریعہ نہ آسکیں ایک صورت اور بھی ہے جس کو انگریزی میں اپریشن کہتے ہیں۔ یعنی وہ بطریق اضافہ آسکتے ہیں۔

جواب سوال نمبر ۱۰۔ مسلم لیگ میں دینی امور کے متعلق علماء کی رائے کو وہی وقعت حاصل ہو گی۔ جو اب تک مسلمانوں میں ان کی رائے کو حاصل رہی ہے۔ ان معاملات میں اگر علماء کے درمیان کوئی اختلاف ہو۔ تو اس کے لیے وہی طریق اختیار کیا جائے گا۔ جو حدیث و قرآن کی رُو سے صحیح ہو۔

جواب سوال نمبر ۱۱۔ یقیناً مسلم لیگ نے جمیعتہ العلماء اور مسلم لیگ کے تصادم کو ضرور محسوس کیا ہے اور اس کے انسداد کی اس کے ذہن میں

یہ صورت ہے کہ جمیعتہ العلماء اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیم عمل ہو جائے یعنی خالص دینی امور کا انصرام جمیعتہ العلماء اپنے ذمہ لے لے۔ اور مذہبی تمدنی سیاسی اور دوسرے شعبہ ہائے حیات کے انصرام میں شرکت کے لیے علماء حضرات مسلم لیگ میں بحیثیت مسلمان شریک رہیں۔

جواب سوال نمبر ۱۲۔ بے شک راجپوتوں اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام مسلم لیگ کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے اور سیاسی حیثیت سے بھی یہ ضروری ہے۔ مگر اس اہم اسلامی خدمت کے اہل صرف علماء حضرات ہیں۔ بدنصیبی سے مسلم لیگ کو ان کا پورا تعاون حاصل نہیں رہا ہے۔ اس لیے وہ اس خدمت سے قاصر رہی ہے۔ اگر علماء اس کام کو شروع کریں تو مسلم لیگ ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گی۔

اعلان مسلک

حضرتؒ مسلم لیگ کے جواب کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا ابھی جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مولوی منفعت علی صاحب وکیل وممبر مسلم لیگ سہارنپور کی طرف سے حضرت کو ایک خط موصول ہوا۔ جس میں تمام حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد درخواست کی گئی کہ:-

"حضرت اقدس کے نزدیک دونوں جماعتوں یعنی لیگ اور کانگرس میں سے مسلمانوں کو کس جماعت میں شرکت کرنی چاہیئے؟" (مسائل سیاسیہ صک)

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے بیان کے مطابق اس خط کے موصول ہونے کے بعد ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء کو حضرت تھانوی ایک مضمون لکھ کر خانقاہ میں تشریف لائے۔ صبح کی مجلس میں مولانا ظفر احمد ثانی صاحب عثمانی اور مولانا شبیر علی صاحب تھانوی و دیگر علماء خانقاہ کو بلا کر فرمایا کہ:-

"رات میں نے سونا چاہا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ بار بار قلب یہ تقاضا کرتا تھا کہ جواب لکھو۔ جب شدید تقاضا ہوا تو میں لکھنے بیٹھ گیا۔ اور یہ مضمون قلمبند ہوا۔ جسے "تنظیم المسلمین" کا نام دیا گیا ہے"

اس کا خلاصہ حضرت تھانوی کے الفاظ میں یہ تھا کہ:۔

"از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت ہے نہ آمیزش کی ضرورت۔ رضائے حق کو مطمح نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں۔ اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے۔ یہی عبدیت کی رُوح اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے"۔

(افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص۷۵)

وضاحت مسلک

اپنے مذکور الصدر اعلان کی وضاحت میں آپ نے آگاہی عوام کے لیے "تنظیم المسلمین" کا ضمیمہ بعنوان "عرض ضروری باطلاع معذوری" حسب ذیل تحریر فرمایا:۔

"بعد الحمد والصلوٰۃ حضرات ناظرین۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سیاسیات حاضرہ کے متعلق ایک فتویٰ مسمّٰی بہ "تنظیم المسلمین" زمانہ قریب میں میری جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ اور اس سے میرا مسلک واضح ہو گیا ہے۔ مگر پھر بھی روزانہ ڈاک میں اس کے متعلق برابر خطوط آتے رہتے ہیں۔ جن میں مختلف عنوانات سے سوالات ہوتے ہیں۔ چونکہ میں بوجہ ضعف ہر جزئی کا مفصل جواب دینے سے قاصر ہوں۔ اور

بغیر تفصیل کے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے نیز اس فتویٰ میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس قدر قیود و حدود کی رعایت کی گئی ہے کہ ان میں غور کرنے سے یا کسی عالم کے مطالعہ میں شریک کرنے سے تقریباً تمام ضروری سوالات کا جواب اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ ہر تنظیم کا حسب قدرت شرع کے موافق ہونا ضروری ہے۔

۲۔ جس جماعت میں داخل ہوں۔ اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس میں منکر پر نکیر کرنا بھی آگیا۔

۳۔ جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو۔ اس کی اصلاح بہ نسبت غیر مسلم کے سہل ہے۔

۴۔ اصلاح اس تفصیل سے کی جاوے کہ اہل قوت اپنی قوت سے اور غیر اہل قوت اُن اہل قوت کو آمادہ کرنے سے اور علماء سے علمی و عملی امداد حاصل کرنے سے کام لیں۔

۵۔ تمام علماء احکام کی تبلیغ میں مشغول رہیں کہ تقسیم خدمات کے قاعدہ سے یہ ان کا اصلی فرض ہے۔ اہل سیاست سے اس کی توقع فضول ہے۔ جیسا اس کا عکس۔ البتہ اہل سیاست تدابیر سیاست کے جواز و عدم جواز کے حکم میں علماء کے محتاج ہیں۔

۶۔ غیر اسلامی جماعت کے ساتھ اصول شرعیہ کے موافق صلح کا مضائقہ نہیں۔ لیکن ان میں مدغم نہ ہوں۔

۷۔ اگر کوئی دوسری اسلامی جماعت پیدا ہو جائے۔ اس کے ساتھ اتحاد رکھیں۔

۸۔ اگر ایسی سیاسی جماعت متقی نہ ہو مگر اسلام کی حفاظت اور مخالفین اسلام کی مدافعت اس کا مقصود مشترک ہو۔ جیسا کہ اس وقت زیادہ غرض تنظیم سے یہی ہے کہ جو متعصبین آزادی ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اس کی حمایت کریں تاکہ اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے۔ گو اس جماعت کے احاد میں اختلاف مذاہب بھی ہو۔ اور اس وقت کی فضاء پر نظر کر کے بظاہر اسباب اس کی ضرورت ہے کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لیے باہمی اختلاف کو بجائے خود رکھ کر سب کلمہ گو جمع ہو جاویں۔ تو متقی نہ ہونا ایسی حالت میں اختلاف میں مانع تعاون نہیں۔ البتہ اس میں شرط ضروری ہے کہ اس تعاون میں جو اختلاط ہو۔ وہ مضر دین نہ ہو۔ اور اس کی اسلم صورت یہ ہے کہ عوام الناس ایسے لوگوں سے مذہبی گفتگو نہ کریں۔ نہ سنیں۔ یہ کام علماء پر چھوڑ دیں۔ البتہ اپنے عقیدہ کی علمی و عملی اصلاح خاص ملاقاتوں میں لطف و اخلاق سے کرتے رہنا بلا خطر مناسب بلکہ واجب ہے۔ تاکہ وہ بھی تقویٰ کے ساتھ موصوف ہو جاویں۔ حاصل اس تقسیم خدمات کا یہ ہے کہ زعماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث القوم مٹنے نہ دیں اور علماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث المذہب بگڑنے نہ دیں۔ تو ایک جماعت میں جن خاص اوصاف کی کمی اس کے فرض میں مخل ہے۔ اس کمی کو دوسری جماعت میں دیکھ کر خود اس جماعت کو بیکار سمجھنا محض ناحقیقت شناسی

اور ناتجربہ کاری ہے ع ہر کسے بہر کارے ساختند۔
۹۔ ہر حال اور ہر عمل میں اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھیں کہ حقیقی کامیابی اسی پر موقوف ہے۔
۱۰۔ فتویٰ ۱۳۵۶ھ کے ختم اور ۱۹۳۸ء کے آغاز کا لکھا ہوا ہے اور اس وقت کی حالت کی بناء پر ہے۔ اگر حالات بدل گئے تو حکم بھی بدل جائے گا۔"

مجلس دعوۃ الحق

حضرت تھانوی کی اصل سیاست یہ تھی کہ جس طرح بھی بن سکے۔ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جائے۔ اس لیے آپ کی حمایتِ لیگ سیاسی اغراض کے لیے نہ تھی۔ بلکہ اس غرض کے لیے تھی۔ کہ مسلمان لیگ کے اندر داخل ہو کر اپنی تنظیم اور لیگ کی اصلاح کی فکر کریں۔ تاکہ یہ کانگرس کا مقابلہ کر سکے۔ اور متعصبین اسلام کو ہندوستان سے نہ مٹا سکیں۔ اور اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے مسلم لیگ چونکہ نہ علماء کی جماعت تھی اور نہ بالکل دینداروں کی۔ اس لیے حضرت تھانوی کو اس کی قیادت سے کچھ دینی مضرتوں کا احتمال تھا۔ جس کی وجہ سے آپ نے ایک ایسی تبلیغی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ جو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی بھی نگرانی کرتی رہے۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے حضرت کے ایماء پر "مجلس دعوۃ الحق" قائم ہوئی جس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔
الف۔ حضرت تھانوی کے رسائل "تنظیم المسلمین و تعلیم المسلمین" میں جو عوام و خواص کو تنظیم و تبلیغ کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کے لیے

ایک مرکز قائم کرنا۔ اور تنظیم و تبلیغ کو وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں پھیلانا۔

ب۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو دینداری کی طرف متوجہ کرنا۔ کیونکہ مسلم لیگ کو اس وقت مسلمانوں میں بڑی حد تک مرکزی شان حاصل ہے۔ اس کے لیڈروں کی اصلاح سے بہت کچھ عوام کی اصلاح متوقع ہے۔

ج۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے پاس ان کے جلسوں میں یا خاص اوقات میں چند مخلصین کا وفد بھیجتے رہنا۔ جو یہ بات ان کے ذہن نشین کرائے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتباع احکام الٰہیہ سے ہی کامیابی اور ترقی ہوئی ہے۔ محض اسباب ظاہرہ یا دیگر اقوام جیسا مظاہرہ مسلمانوں کے لیے ہرگز کافی نہیں۔ ہوتا۔

د۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو شعائر اسلامیہ کی پابندی کی تبلیغ کرانا اور ان سے درخواست کرنا کہ مسلم لیگ کے ہر ممبر پہ قانونی طور سے شعائر اسلامیہ کی پابندی کو لازم کیا جائے کہ اس پر کامیابی موقوف ہے اور قلوب اہلِ اسلام کا انجذاب بھی اسی سے ہوگا۔ جو تنظیم کی بنیاد ہے۔

چنانچہ اس تبلیغی پروگرام پر نومبر ۱۹۳۸ء سے عملدرآمد شروع ہو گیا۔ اور اس کی ابتدا قائد اعظم کو تبلیغ سے ہوئی۔

تطہیر و تکفیر کی مساعی

ایک طرف تو حضرت تھانویؒ اور ان کے مخلصین کی جماعت اللہ کے دین کا بول بالا کرنے اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی غرض سے مسلم لیگ والوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے میں مصروف تھی۔ اور دوسری طرف خود حضرت تھانوی کو کافر قرار دینے والا بریلویوں کا فتویٰ لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ اور مسلم لیگ والوں کو بے دین ثابت کیا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ قائد اعظم تک کو کافر کہا جا رہا تھا۔ تاکہ کسی طرح لوگ مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں۔ اس پر

حضرت نے ایک دوسرا اعلان بعنوان "الطریق الامم فی شرائط الامم" جاری کیا۔ اور اس میں لکھا کہ:۔

"بعض حضرات کانگرس کے مفاسد کے جواب میں اکثر اہل مسلم لیگ کے بعض اعمال دینیہ کی کوتاہیاں پیش کر کے بطور الزام ان کوتاہیوں کو اس کے ساتھ اتحاد کرنے کے جواز سے مانع قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ کہاں اصل ایمان کا فقدان کہاں فروع اعمال کا نقصان۔ تو ایک کا قیاس دوسرے پر محض فاسد اور قیاس مع الفارق ہے بخصوص جبکہ اس دوسرے نقصان کی اصلاح کی توقع بھی قریب ہو۔ جس کی کوشش شروع بھی ہو گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ اہلِ مسلم لیگ کی کوتاہیاں خوارج کی بددینی کے درجہ تک تو نہیں پھر جب کفار کے مقابلہ کے لیے خوارج کے ساتھ اشتراک عمل جائز ہے۔ تو مسلم لیگ کے ساتھ بدرجہ اُولیٰ جائز ہو گا۔ پس اس تحریر سے کانگرس اور مسلم لیگ کی حقیقت اور حکم میں صاف فرق ظاہر ہو گیا۔ اس پر بھی اگر کوئی شخص اپنے قیاس فاسد پر اصرار کرے۔ تو کیا علاج۔"

جمیعتہ العلماء ہند کی دعوت

جب کانگرس نے دیکھا کہ حضرت تھانوی مسلم لیگ کی پشت پناہی سے باز نہیں آ رہے۔ تو اس کی حلیف جماعت جمیعتہ العلماء ہند کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب کی طرف سے مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۳۹ء کو حضرت تھانوی کی خدمت میں اس مضمون کا ایک دعوت نامہ پہنچا۔ کہ

"جمیعتہ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں ہو رہا ہے اس میں

شرکت کے لیے بہ نفسِ نفیس تشریف لاویں۔ اگر سفر کا تحمل نہ ہو۔ تو کسی کو بطور نمائندہ روانہ فرماویں۔ معاملات کی اہمیّت کے پیشِ نظر ہے۔"

حضرت تھانوی کا جواب

جمیعتہ العلماء ہند کے دعوت نامہ کا حضرت تھانوی کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب لکھا گیا:۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا دعوت نامہ آیا۔ میرا عذر سفر تو آپ کو معلوم ہی ہے اس لیے خود تو حاضری سے قاصر ہوں۔ اگر دعوت نامہ کچھ پہلے آتا۔ تو ممکن تھا۔ کہ اس کے متعلق کچھ خط و کتابت کر کے کسی کو بھیجنے کا انتظام کرتا۔ اب عین وقت پر اس کا انتظام بھی مشکل ہے۔ اس لیے شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں۔ جس کے متعلق مولانا محمد کفایت اللہ صاحب سے زبانی گفتگو بھی ہو چکی ہے۔ اور اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا خصوصاً حضرات علماء کا کانگرس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے بلکہ کانگرس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہیئے تاکہ ان کی تنظیم خالص دینی اصول پر ہو۔ اور مسلمانوں کو کانگرس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔ والسلام اشرف علی۔" (افاداتِ اشرفیہ)

مگر عین وقت پر اس کی روانگی روک لی گئی۔ اور یہ جواب نہ بھیجا گیا۔ اس

جواب کے نہ بھیجنے کی مصلحت اس وقت معلوم ہوئی جب جمیعتہ العلماء ہند کے مذکورہ بالا اجلاس میں ہونے والی تقریر کے ردعمل کے طور پر اجلاس کے اختتام کے قریب ہی مولوی مظہر الدین مالک اخبار الامان دہلی کو قتل کر دیا گیا اگر یہ جواب چلا جاتا۔ تو یہی خیال کیا جاتا کہ حضرت کے جواب سے برافروختہ ہو کر جلسہ والوں نے ایسی تقاریر کیں جو مسلم لیگ کے ترجمان کے قتل پر منتج ہوئیں۔ چونکہ حضرت پر اس واقعہ کا ہونا منکشف ہو چکا تھا۔ اس لیے آپ نے جواب نہ بھیجنے دیا۔

قتل کی دھمکی

حضرتؒ کے خط نے کانگریسیوں کی تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کانگریسی حکومتوں کی مسلم کش پالیسی اور ہندوؤں کے جبر و استبداد نے پاکستان کے لیے راہ صاف کرنی شروع کر دی جمیعتہ العلماء۔ احرار۔ سُرخ پوش نیشلسٹ اور مومن کانفرنس والے سب مل کر بھی تھانہ بھون کے مردِ درویش کی آواز پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ اور مسلمان حضرت تھانوی کے اعلانات پر جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو کر جنگِ پاکستان لڑنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بغرضیکہ کانگریسیوں کے تمام ناجائز حربوں کے باوجود حضرت تھانوی مسلم لیگ کی حمایت سے باز نہ آئے ع

خلقے بہ منت یک طرف آں شوخِ تنہا ایک طرف

سیاسی معاملات میں حضرت تھانوی کے اس استقلال و استقامت کو دیکھ کر محققِ اسلام مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھا کہ :-

"اللہ تعالیٰ ان (حضرات تھانوی) کے سایہ کو ملتِ اسلامیہ کے سر پہ دیر تک صحت و سلامتی کے ساتھ قائم رکھے۔ اور

اس وقت کے طوفان کے اکیلے ملاح کو اتنا تو وقفہ دے کہ
کم از کم یہ طوفان سر سے ٹل جائے۔ علماء میں افسوس ہے کہ سب
اُدھر ہی چلے گئے۔ جدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں۔
ایک حضرت ہی ہیں۔ جن سے اس جماعت کی آبرو باقی ہے۔"
(حکیم الامت ص۵۳۶)

اہل نظر حضرت کی درازیٔ عمر کے لیے دُعائیں مانگ رہے تھے۔ اور اہلِ غرض انہیں اپنے راستہ سے ہمیشہ کے لیے ہٹانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جمیعتہ العلماء ہند کو ٹکا سا جواب ملنے کے قریبًا ڈیڑھ ماہ بعد حضرت تھانوی کو ۱۵/اپریل ۱۹۳۹ء کی ڈاک میں ایک خط موصول ہُوا جس کے لفافہ پر مٹونا تھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ کے ڈاک خانہ کی ۱۳/اپریل ۱۹۳۹ء کی مہر تھی خط میں کاتب کا نام اور پتہ درج نہ تھا۔ یہ لکھا تھا کہ:-

"یہ بات بہت تشویش اور ہمارے لیے شرم کی ہے کہ کانگرس جمیعتہ العلماء۔ احرار اور مومن کانفرنس کی تمام کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کا فتنہ ملک میں پھیلتا جاتا ہے اور آپ نے علماؤں کے خلاف مسلم لیگ کے موافق فتویٰ دیا ہے۔ جس سے بہت اثر ہے۔ لیکن اب ہماری پارٹی مسلم لیگ کے مولویوں اور بد دین لیڈروں کو مزا چکھانے کے لیے تیار ہو کر میدان میں آگئی ہے۔ اس لیے آپ کو بھی تاکیدی نوٹس دی جاتی ہے کہ ایک مہینہ کے اندر اندر مسلم لیگ سے اپنا فتویٰ واپس لے لو۔ اور حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا مسلک قبول کر لو۔ اور کانگرس کی حمایت کرو۔ ورنہ یقین اور پورا یقین رکھو کہ مظہر الدین "الامان" والا کی طرح تم کو بھی تمہاری خانقاہ میں چھرے

سے ذبح کردیا جائے گا۔ یہ قسمیہ اور ایمانًا اطلاع بھیجی جاتی ہے۔ ایک مہینہ کی مدّت غنیمت جاننا۔ ایک مہینہ تمھارے بیان کی انتظار کرکے ہمارا آدمی روانہ ہو جائے گا۔ جو پستول یا چھرے سے تم کو ختم کردے گا۔ پھر مردود جیناؔ[1] کی باری ہوگی۔ اور بدعتی مولوی حامد بدایونی کی۔ یہ چھٹی کوئی دھمکی نہیں ہے۔ فقط کانگرس زندہ باد اور جمیعتہ العلماء زندہ باد" (اعلام نافع ص۲)

دھمکی کا جواب

حضرت تھانوی نے قتل کی اس دھمکی کے جواب میں حسب ذیل اعلان "النور" ماہ صفر ۱۳۵۷ھ میں شائع فرمایا:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ کاتبِ خط نے میرے اس فتویٰ میں جو مسلم لیگ کے متعلق ہے اور جس کا لقب تنظیم المسلمین ہے۔ غور نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے بلا دلیل اس کو مسلم لیگ کی حمایت مطلقہ سمجھ لیا۔ حالانکہ اس میں ذیل کی قیود کی تصریح کی ہے۔

۱۔ اس کو اس جماعت پر ترجیح دی ہے جس میں غالب عنصر غیر مسلمین کا ہے۔

۲۔ اسلامی منظم و صاحبِ قوت و صاحبِ اثر جماعتوں پر اگر موجود ہوں۔ ترجیح نہیں دی بلکہ یہ لکھ دیا ہے کہ اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ۔ صاحب قوت و صاحبِ اثر تیار ہو جائے تو اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں۔ تاکہ مسلمانوں میں افتراق و تشتت نہ ہو۔

---

[1] یعنی قائد اعظم

۳- اس میں مسلم لیگ کے نقائص کو تسلیم کر کے اس کی اصلاح کا سب کو خصوص علماء کو مشورہ دیا ہے۔

۴- پھر اس میں جو اہل قوت و اہل اثر ہیں۔ ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی تاکید کی گئی ہے۔

۵- خود بھی اس کی اصلاح کا برابر سلسلہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی جاتے رہتے ہیں۔

۶- ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اس کام کے لیے بھیجا۔ پھر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اس کام کے لیے دہلی روانہ کیا۔

غرض جتنا بھی ہو سکتا ہے۔ لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوص علماء بھی مل کر ان حضرات پر زور دیتے۔ اور ان کو نماز روزہ اور وضع اسلامی کی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے ان خطرات سے آویزش کو مناسب نہیں سمجھا۔ کہ جلسے کرتا اور ان کے مقابلہ میں ان کوتاہیوں کو برملا بیان کرواتا۔ کہ اس کو میں مضر سمجھتا ہوں۔ اس طریقہ سے دوسرے کو ضد ہو جاتی ہے۔ جو طریقہ میں نے اختیار کیا ہے۔ وہ دیر طلب ضرور ہے۔ مگر اس کا اثر انشاء اللہ دیرپا ہوگا۔ پھر ان احتیاطوں کے ساتھ میں نے وہ فتویٰ قبل اشاعت اپنی دیوبندی جماعت کے علماء کو بھی دکھلا لیا تھا۔ جس کی پسندیدگی پر سب نے اتفاق کیا تھا۔ مگر میں نے اس وقت ان حضرات کے نام ظاہر نہیں کیے کہ شاید وہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھیں صرف فیما بینی وبین اللہ ان سے اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ جیسا کہ ان

کی تصدیقات سے ظاہر ہے۔

میں اب بھی اس پر آمادہ ہوں کہ اگر علماء سے اس کارروائی کے خلافِ شرع ہونے کا فتویٰ حاصل کر کے مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ میں اس میں انصاف اور تدین سے غور کر کے شرح صدر کے بعد اپنے فتویٰ سے رجوع کر لوں گا۔ جیسا کہ میرا ہمیشہ سے معمول رہا ہے رسالہ ترجیح الراجح کا سلسلہ اس کی دلیل ہے اور یہی کلام ہے کانگرس کی حمایت میں۔ جس کو اب تک میں بحالت موجودہ اسلام اور اہل اسلام کے لیے سخت مضر سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر دلیل شرعی سے اس کے خلاف واضح ہو جائے۔ تو میں اپنی رائے بدلنے کو تیار ہوں۔ اور کسی کی غلطی پر مطلع کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

باقی اگر تخویف سے کسی نے اپنی ضمیر کے خلاف کوئی رائے بھی ظاہر کر دی۔ یہ عقلاً مفید نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ یہ رائے دل سے نہیں دی۔ تو اس سے مقصود حاصل نہ ہو گا۔ اس لیے یہ طریقہ محض عبث اور عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے۔ یہ سب تنقیح اس وقت ہے جب حقیقت کو سمجھنا اور حق کا اتباع کرنا مقصود ہو۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر بجز قیامت کے دن کے اس کے فیصلہ کی کوئی صورت نہیں۔ باقی میں اس پر قادر نہیں کہ محض مخلوق کے راضی کرنے کے لیے حق تعالیٰ کو ناراض کر دوں۔ اور دنیا کی متاعِ قلیل کے لیے آخرت کے نفع و ضرر کو نظر انداز کر دوں۔

میرا ہی کیا ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ مقدرات بدلا نہیں کرتے۔ لہٰذا جو ہونے والا ہے ہو کر رہے گا۔ اور نہ ہونے والا نہ ہو گا۔

اس لیے اس خط کا بحمد اللہ مجھ پر کوئی معتد بہ اثر نہیں ہوا۔ اور نہ اس سے بچنے کے لیے مجھے کسی رسالہ کے شائع کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر اس سے مجھے یہ شبہ ہو گیا کہ بعض لوگوں کو مسلم لیگ کے متعلق میرے مسلک کی نسبت کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اگر اس خط میں کاتب کا نام و نشان ہوتا۔ تو خصوصیت کے ساتھ تفہیم ممکن تھی۔ اب عام عنوان سے جواب دے دیا ہے۔ والسلام۔ واللہ الہادی الی سواء السبیل۔"

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ محبت و عقیدت اور جوش و جنوں انسان کی نظر حقیقت تک نہیں پہنچنے دیتا۔ حضرت تھانوی کے جواب سے ارباب ہوش کی تو تسلی ہو گئی۔ مگر اربابِ جوش نے اسے اپنے لیے آخری زمانہ تازیانہ سمجھا۔

لیگ خاکسار اتحاد

عین اس زمانہ میں جبکہ حضرت تھانوی کو لیگ کی حمایت کی پاداش میں قتل کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ مسلم لیگ خاکساران سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھیں۔ جس کے ذریعہ اس کے امیر علامہ مشرقی مسلمانوں میں اپنے عقائد کفریہ پھیلا رہے تھے۔ جس کی خبریں تھانہ بھون میں مخلصین اور معترضین کے خطوط کے ذریعہ برابر پہنچ رہی تھیں۔ اور حضرتؒ کو مطعون کیا جا رہا تھا۔ کہ آپ ایک ایسی جماعت کی تائید و حمایت کر رہے ہیں۔ جس کا تعلق علامہ مشرقی کی جماعت سے ہے۔ جو عقائد کفریہ رکھتے ہیں۔ اس سے حضرت تھانوی کو سخت رنج پہنچا۔

صدر یو۔ پی مسلم لیگ کی طلبی

اس سے کچھ عرصہ قبل قائد اعظم کے ایماء پر نواب محمد اسماعیل خاں صاحب

بیرسٹر و ایم۔ ایل۔ اے صدر پارلیمنٹری بورڈ و یوپی مسلم لیگ نواب جمشید علی خاں صاحب کے ہمراہ لیگ کے خلاف حضرت تھانوی کے شکوک رفع کرنے کی غرض سے تھانہ بھون حاضری دے چکے تھے۔ اور انہی کی یقین دہانی پر حضرت لیگ کی حمایت فرمارہے تھے۔ اس لیے لیگ خاکسار اتحاد کے سلسلہ میں حضرت نے ان سے ہی شکوہ کرنا مناسب سمجھا اور انھیں تھانہ بھون میں طلب فرمایا۔

افہام و تفہیم اور اس کا نتیجہ

چنانچہ نواب صاحب فوراً تھانہ بھون پہنچے۔ وہاں افہام و تفہیم کی جو گفتگو ہوئی۔ اس کی تفصیل نواب صاحب یوں لکھتے ہیں کہ:۔

"دوسری مرتبہ مولانا نے خود مجھے تھانہ بھون میں طلب کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علامہ مشرقی نے کوئی قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ یا لکھنا شروع کی تھی۔ اس پر مولانا مرحوم کو سخت غصہ تھا۔ ان کو کسی نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ لیگ اور خاکساروں میں گہرا تعلق ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے۔ تو وہ لیگ سے بھی بیزاری کا اعلان کر دیں گے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ ایسا کرتے۔ اُنھوں نے مجھ سے تصدیق کرنی مناسب سمجھی۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ خاکساروں کا لیگ تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اکثر ہمارے جلسوں میں بغیر بلائے بحیثیت والنٹیروں کے آجاتے ہیں۔ میں ایک بیان شائع کروں گا جس میں پبلک کو ظاہر کر دوں گا کہ لیگ کا خاکساروں کے ساتھ کوئی تعلق یا سمجھوتہ نہیں ہے۔ مولانا مطمئن ہو گئے۔ میں نے یہ بھی

رائے پیش کی کہ اس سے قبل کہ مولانا کوئی بیان اخبارات کو دیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ علامہ مشرقی کو بتائیں کہ ان سے کیا کیا غلطیاں اس تفسیر میں ہوئی ہیں۔ اور اگر وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کریں۔ تو ضرور ان کے خلاف بیان شائع کریں۔ اس کو انھوں نے خندہ پیشانی سے منظور فرمایا"

(مکتوب گرامی مورخہ ۱۰ جون ۱۹۵۵ء)

حضرت تھانوی نے نواب صاحب کو بتلایا کہ وہ علامہ مشرقی کو اس سلسلہ میں لکھ چکے ہیں اور نواب صاحب نے واپس آکر بحیثیت صدر یو۔ پی مسلم لیگ یہ بیان اخبارات میں شائع کرادیا کہ لیگ کا خاکسار ان سے کوئی تعلق یا واسطہ یا سمجھوتہ نہیں ہے۔ جس سے حضرت کو تسلی ہو گی۔

سیاست کے کرشمے

اسلام نے تو سیاست کی بنیاد امانت و دیانت پر رکھی تھی۔ مگر دانایانِ فرنگ نے اسے خود غرضی و مطلب پرستی کا ذریعہ بنا دیا۔ اور جائز و ناجائز۔ حلال و حرام اور دوست دشمن کی تمیز اُڑا دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذاتی مفاد کی خاطر قومی مفاد قربان کیا جانے لگا۔ اور ذاتی اغراض کے لیے دوستوں کو بھی دشمن سمجھنے لگا۔

اس زمانہ میں پنجاب کی "اتحادی حکومت" تھی۔ جس کی عنان وزارت سر سکندر حیات خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی پالیسی اگرچہ مسلم لیگی تھی مگر اپنی وزارت کے استحکام کے لیے کانگریسیوں سے بھی اُنھوں نے دوستانہ گانٹھ رکھا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے مسلم لیگ کو ۳۹ء میں امرتسر کا ضمنی الیکشن لڑنا پڑا۔ مسلم لیگ نے امرتسر کے مشہور قومی کارکن شیخ صادق حسین صاحب کو نمائندہ منتخب کیا۔ کانگرس ان کے مقابلہ میں امرتسر کے مشہور کانگرسی رہنما

ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو کو میدان میں لے آئی۔ گو دونوں کا امرتسر اپنا گھر تھا۔ جوڑ بھی برابر کے تھے۔ مگر کانگرسیوں کو کچھ لیگیوں کا پلہ بھاری معلوم ہوا۔ اس لیے شیخ صادق حسین صاحب کو پچھاڑنے کے لیے کانگرس کی حلیف جماعت احرار نے بھی الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنا مشہور اور مخلص رہنما چودھری افضل حق مرحوم مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ ان کا اگرچہ امرتسر گھر نہیں تھا۔ مگر ان کی جماعت احرار کا گڑھ ضرور تھا۔ اب ذرا لیگ والوں کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اگرچہ خاکساروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ جن کا وہ عہدِ شباب تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ علماء حق کی امداد کے بغیر وہ کانگرس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس وقت سر سکندر حیات خاں کی بالکل وہی حالت تھی جس حالت سے چار سال قبل مولانا شوکت علی مرحوم کو جھانسی کے میدان میں دوچار ہونا پڑا۔ اس کامیاب سیاست دان نے دیکھا کہ اگر حضرت تھانوی شیخ صادق حسن صاحب کے حق میں چند سطریں لکھ دیں۔ تو وہ ان کی روحانی قوت سے احرار اور کانگرس کو شکست فاش دے سکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت تھانوی کی خدمت میں آنریری سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کی معرفت درخواست امداد بھیجی۔

سر سکندر حیات خاں کو ٹکا سا جواب

جس وقت سر سکندر حیات خاں کا ذاتی پیغام امداد تھانہ بھون پہنچا۔ اس وقت حضرت کے کانوں تک یہ خبریں بھی پہنچ چکی تھیں کہ:-

۱۔ شیخ صادق حسن صاحب خاکساروں کی امداد سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔

۲۔ بعض لیگی حضرات کانگرسی علماء کو سامنے رکھ کر بلا استثنیٰ علماء کرام کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

۳۔ اور کہ وہ شعائر اسلام کی پابندی بھی نہیں کر رہے جس کی حضرت

انھیں تبلیغ کرتے اور کراتے رہتے تھے۔ اس لیے حضرت کو ارباب لیگ سے سخت شکوہ تھا۔ سر سکندر حیات خاں کے خط آنے کے بعد اب آپ کو انھیں کھری کھری سنانے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور آپ نے سر سکندر حیات خاں کو ایسا ٹکا سا جواب دیا۔ جو انھیں کبھی کسی اور نے نہ دیا تھا۔

داستانِ شکوۂ لیگ

یہ تاریخی اور بصیرت افروز مکتوب سر سکندر حیات خاں کے خط کا صرف جواب ہی تھا۔ بلکہ ارباب مسلم لیگ کے شکوہ کی مکمل داستان بھی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:۔

از اشرف علی عفی عنہ۔ یکم رجب۔ جمعہ ۵۸ھ

مکرمی زاد لطفکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ صادر ہُوا۔ احقر تو مسلم لیگ کا ہمیشہ حامی ہے۔ اور وہ حمایت الحمد للہ کہ کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی دنیوی اصلاح میں اس وقت مسلم لیگ ہی میں شامل ہونے میں سمجھ رہا ہوں۔ اور کانگریس میں داخل ہونے میں دینی و دنیوی دونوں کا نقصان خیال کرتا ہوں۔ لیکن ہر مسلمان جانتا ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے۔ اور تاریخی واقعات و شواہد سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک مسلمان دین اور مذہب پر قائم رہے اور اس قدر پختگی سے قائم رہے۔ کہ لوگ ان کو مجنوں سمجھتے تھے۔ ان کو دین کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل کی دھن تھی۔ اس وقت تک دنیوی اعتبار سے بھی مسلمان ہر طرح کامیاب رہے اور تمام دنیا میں ان سے آنکھ ملانے والا کوئی نہ تھا۔ اور جب سے اس میں کمی آئی۔ اسی وقت سے ذلیل ہوتے ہوتے اب ان کی ذلت کی انتہا

ہو چکی ہے۔ اور تمام سمجھدار حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی ماضی کی طرف لوٹنا چاہیئے۔ مگر نامعلوم اس کا مفہوم کیا سمجھ لیا ہے۔ کہ اس کو فرماتے سب ہیں۔ جانتے سب ہیں۔ مگر دین کی باتوں سے گریز ہے۔ کہتے ہیں۔ مگر عمل نہیں کرتے۔ سو اگر حضرات لیگ دینداری کی طرف توجہ فرماتے۔ تو آج لیگ کی ترقی سے تمام اقوام خائف ہوتیں۔ مگر نہ معلوم کونسی چیز مانع ہے۔ کہ اس طرف نہیں آتے۔ میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ پٹنہ میں ایک پیغام بھیجا تھا۔ جو وہاں پڑھا بھی گیا تھا۔ اور سب حضرات کو تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ اس میں صرف دو چیزوں کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی۔ اوّل نماز کی پابندی کو لیگ کے مقاصد میں شامل کیا جاوے۔ دوسرے وضع اسلامی کو لیگ کے ہر ممبر پر لازمی قرار دیا جاوے۔ نماز کا ارکان اسلام میں اہم ترین رکن ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے اور وضع خاص رکھنا تو ایسی چیز ہے کہ دنیا کے تمام سیاست دان اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جرمنی کا لباس الگ ہے۔ فرانسیسی کا الگ وعلیٰ ہذا۔ اور فوجی وردی تو لازمی طور پر الگ ہوتی ہے۔ اگر جرمنی سپاہی مثلاً انگریزی وردی پہن کر جرمنی فوج میں شامل ہو۔ اور ویسے ہر طرح وفادار اور مستعد ہو۔ لیکن صرف وردی کی تبدیلی کی وجہ سے وہ مستوجب سزا کا ہو گا۔ وعلیٰ ہذا۔ تو کیا مسلمان کے لیے جو حق تعالیٰ کی فوج ہے۔ کوئی خاص وضع اور امتیاز ضروری نہیں ہے؟ ہے اور ضروری ہے!

لیکن افسوس کہ حضراتِ لیگ نے ان دونوں باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اگر ان باتوں کی طرف توجہ فرماتے۔ تو دین

کی اور باتیں بھی جو ترقی دنیا میں بھی مؤثر ہیں۔ ہمیں اور بتلاتا۔ مگر مجھے واقعی حضرات لیگ سے یہ شکایت ہے کہ مولویوں کو صرف الیکشن کے وقت پوچھا جاتا ہے اور ان کے فتوؤں پر عمل کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کی بات کی طرف کوئی کان نہیں دھرتا۔ ہم اگر ذاتی منافع کے لیے کچھ بھی لکھیں۔ تو بیشک نہ سنئے۔ نہ مانئے۔ لیکن اگر ان حضرات کو ہم پر اعتماد ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم فتویٰ صحیح دیتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ الیکشن ہی کے لیے صحیح ہوتا ہے۔ دوسرے وقت وہ قابل عمل نہیں ہوتا۔ میری غرض لیگ کی حمایت تھی اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اصل چیز یعنی دین ہی سے بے تعلقی اور بے توجہی ہی ہے۔ تو بجز خاموشی کے اور کیا کروں۔ آپ ہی انصاف فرمادیں کہ اب میرا کیا جی چاہے! یہاں تک تو وہ اُمور غرض کے لیے ہیں۔ جن کی طرف حضرات لیگ کو مُتوجّہ کر چکا ہوں اور پھر بھی اُنھوں نے عمل نہیں کیا۔

اب دو نئی چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ جن سے میں بہت پریشان ہو رہا ہوں ایک تو لیگ کا علاّمہ مشرقی سے تعلّق اور دوسرا ذمہ دارانِ لیگ کا علماء کے وقار اور ملّاازم کے برباد کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ مشرقی کی کتابیں میں نے بھی دیکھی ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکا میں نے اس کے اقوال کی تاویل بھی کی۔ مگر وہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اور اس کے عقائد جن کی رفتہ رفتہ وہ خاموشی سے تبلیغ کر رہا ہے صریح کُفر ہے۔ اور چونکہ مسلم لیگ اس وقت تک مسلمانوں میں مقبول جماعت ہے۔ مگر خاکساروں کی حمایت کی وجہ سے لوگ لیگ سے بھی بدظن ہو رہے ہیں۔ جس کا ب مجھے اس طرح علم ہوا ہے کہ اکنافِ ہند سے ان لوگوں کے

سوالات میرے پاس آرہے ہیں۔ جو اب تک مسلم لیگ کے سرگرم اور حامی ممبر تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ لیگ جب خاکساروں سے تعاون کرتی ہے۔ تو اب مسلم لیگ میں داخل رہنا جائز ہے یا نہیں؟ غرض ان خاکساروں سے ملنے کی وجہ سے بھی لیگ بدنام ہو رہی ہے۔ اور جو شخص اب لیگ کی جدید حمایت کرے گا وہ بھی بدنام ہوگا۔ دوسری چیز لیگ والوں کا بلا کسی استثناء کے علماء کے وقار کو تباہ کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ اگر کانگرسی علماء سے بچایا جاتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اختلافِ مسلک کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر بلا کسی استثناء کے علماء کے اثر کو مٹانے کی سعی کے معنی تو مذہب کو مٹانے کی سعی کرنا ہے۔ اور جو جماعت دین کو مٹانے کی فکر میں ہو۔ آپ ہی انصاف فرماویں کہ اس سے میں کہاں تک تعاون کر سکتا ہوں۔

مجھے بھی افسوس ہے کہ مجھے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہے اور سر سکندر حیات خاں صاحب کے ارشاد کے بعد مجھے ایک ایسی تحریر لکھنا پڑی جو بظاہر خلاف تہذیب ہے۔ مگر مسلمانوں کی اصل تہذیب چونکہ دین ہے اور دین کی خیر خواہی مجھے مجبور کرتی ہے۔ کہ ان حالات میں میں اس ارشاد کی تعمیل سے عذر کروں۔ اس لیے مجھے اُمید ہے وہ معاف فرمائیں گے۔ اور اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے تو شاید وقت آجائے گا۔ اور لیگ خدا اور رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے احکام پر عمل کرنا شروع کر دے۔ تو میں لیگ کا ہر وقت خادم ہوں۔ اخیر میں ایک دم تنزل کر کے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اور وزیر صاحب کی خدمت میں بھی جن سے مجھ کو ان کے غائبانہ اوصاف خصوص اسلامی حمیت سن کر مدت سے خاص محبت ہے وہ عرض ——————

یہ ہے اگر پابندی شرعی وضع کو مقاصد لیگ کا جزو بنانا کسی دنیاوی مصلحت کے خلاف کہا جاوے۔ یا ہمت سے بڑھ کر خیال کیا جاوے۔ تو کم از کم ان چیزوں کو تو ممنوع قرار دیا جاوے جن سے لیگ کی دنیوی قوت کو یا بلفظ دیگر اسلامی مفاد کو صدمہ یا ضعف پہنچتا ہو۔ جن کی طرف میں نے اس خط میں اشارہ کیا ہے۔ اور اگر خدا نہ کرے یہ بھی نہ ہو سکے۔ تو پھر میں کسی کی آزادی میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ درخواست ضرور کروں گا کہ پھر میری آزادی میں بھی خلل نہ ڈالنا۔ اور مجھ کو اجازت دی جاوے کہ اپنے لیے جو طریق عمل مناسب سمجھا جاوے تجویز کر لوں۔

مَیں جانتا ہوں کہ اس خط میں بہت سے ایسے اُمور عرض کیے گئے۔ جو اصل سوال سے زائد ہیں۔ مگر اس کا باعث صرف یہ ہُوا کہ آپ کے خط سے اسلامی ہمدردی کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ پھر جناب وزیر صاحب کی توجہ بھی۔ اس لیے توقع ہوئی کہ شاید یہ توجہ کچھ ترقی کر کے اصلاح میں مؤثر ہو جائے۔ لیکن اگر یہ بے محل سمجھا جاوے۔ تو آپ سے اور جناب وزیر صاحب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر توجہ صرف نہ کی جاوے تو جواب کی تکلیف نہ فرمائی جاوے باقی دُعا ہر حال میں اپنا فریضہ ہے ؎

حافظؔ وظیفۂ تو دُعا گفتن است و بس
دربند آں مباش نشنید یا شنید

(مشاہدات و واردات صفحہ ۲۰۵ تا ۲۰۷)

نواب محمد اسماعیل خان کی درخواست امداد

سر سکندر حیات خاں تو حضرت کا جواب پڑھ کر جہاں تھے۔ وہیں

رہ گئے۔ اب ہائی کمان نے نواب محمد اسماعیل خاں صاحب صدر یو۔پی مسلم لیگ کو لکھا کہ وہ حضرت تھانوی سے شیخ محمد صادق حسن صاحب کیلیے بیان حاصل کریں۔ کیونکہ حضرت تھانوی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اور ان سے ذاتی طور پر بھی مُتعارِف تھے۔ اس لیے نواب صاحب نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور تمام واقعات تحریر کر کے ایک بیان جاری کرنے کی استدعا کی۔

شرائطِ امداد

اس درخواست کے جواب میں حضرتؒ کے ارشاد پر دربار اشرفیہ کی طرف سے مندرجہ ذیل خط نواب صاحب کو لکھا گیا۔

"مخدوم و محترم جناب نواب صاحب زاد مجدکم

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الطاف نامہ حضرت والا دام ظلہم کی خدمت میں آیا۔ اخبارات میں بیان دینے سے اطمینان ہوا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزا۔ شیخ صادق حسن صاحب کے لیے جو پیغام جناب نے طلب فرمایا ہے بیان تو کیا ایک فتویٰ کی شکل میں تحریر حضرت والا کی طرف سے ارسال کی جا سکتی تھی مگر امرتسر کے بعض متدین وثقہ حضرات سے جو آج کل خانقاہ میں آتے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ شیخ صاحب موصوف خاکساروں کے بہت زیادہ حامی ہیں۔ اور ان کے موجودہ الیکشن میں بھی خاکساروں سے ہی امداد لی جا رہی ہے۔ ان حضرات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تعاون کی وجہ سے مسلمان شیخ صاحب سے بہت بددل ہو رہے ہیں۔ حضرت والا شیخ صاحب سے اور ان کے حالات سے واقف نہیں۔ اگر امرتسر کے ان حضرات کی اطلاع صحیح ہے۔ تو آپ

غور فرمائیے کہ ایک طرف تو مشرقی کے وہ حالات حضرت والا کے سامنے ہیں۔ جن پر کفر وارتداد کے فتاویٰ ہیں۔ اور دوسری طرف شیخ صاحب کا ان سے تعاون ہو۔ تو ان کی حمایت میں فتویٰ دینے کے کیا معنی ہوں گے؟ اور اگر یہ اطلاع کہ شیخ صاحب خاکساروں کے حامی ہیں۔ غلط ہے تو اس کی سہل تجویز یہ ہے کہ حضرت والا کی خدمت میں شیخ صاحب کی طرف سے ایک سوال روانہ کیا جائے۔ کہ پنجاب کی اسمبلی کی مسلم سیٹ کے لیے الیکشن ہو رہا ہے۔ جس میں مسلم لیگ کانگرس اور احرار تینوں نے اُمیدوار کھڑے کیے ہیں اور مسلم لیگ کے اُمیدوار کو خاکساروں سے کوئی ہمدردی اور تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ مشہور کیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں کس جماعت کے اُمیدوار کو ووٹ دیا جائے۔ اس سوال کا جواب حضرت والا تحریر فرمادیں گے پھر اس سوال اور جواب کو پورا شائع کر دیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو یہ سوال شیخ صاحب کی طرف سے براہِ راست حضرت کی خدمت میں جلد آجانا چاہیئے۔ تاکہ جواب جلد پہنچ جاوے۔

علامہ مشرقی کا رویہ

اس کے بعد گزارش یہ ہے کہ جناب کی تشریف آوری کے وقت بتلایا گیا تھا کہ مشرقی سے خط وکتابت ہو رہی ہے۔ اور اخیر خط میں مشرقی کے پاس بارہ سوال بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ ان سوالات کا جواب "مینجر الاصلاح" کی طرف سے یہ آیا ہے کہ اعتراضات

لہ یہ خاکساروں کا جماعتی آرگن تھا۔

کے خطوط مشرقی کے سامنے پیش کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اور عام طور پر یہ دفتر بھی ایسے خطوط کا جواب نہیں دیتا۔ اور آیندہ آپ کو بھی جواب نہ دیا جائے گا۔ مشرقی کے جو موجودہ عقائد ہیں۔ ان پر بجز ارتداد کے اور کوئی حکم نہیں لگتا۔ مگر حضرت والا نے احتیاط کی وجہ سے اور تبلیغ حق کے لیے چاہا تھا۔ کہ ان سے زبانی گفتگو ہو جاوے۔ شاید یہ عقاید کی اصلاح کر لیں۔ اس پر وہ آمادہ نہ ہوئے۔ تو سوالات کے ذریعہ ان کو متنبہ کیا گیا۔ اس کا انھوں نے مذکورہ بالا جواب دیا۔ گویا آئندہ کی اُمید کو بھی قطع کر دیا۔

اصلاح کی آخری سعی

اب چونکہ جناب نے فرمایا تھا۔ کہ مشرقی میرٹھ آنے والے ہیں۔ اس وقت تم لوگوں کو بھی بلایا جاوے گا۔ سو اگر اس کی اُمید جلد ہو تو اس کا انتظار کیا جاوے۔ جلد سے مراد ہفتہ عشرہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو جناب کوئی ایسی تدبیر فرما دیں کہ وہ ہم لوگوں کو گفتگو کے لیے جلد سے جلد کافی وقت دے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو۔ تو پھر عوام کی اصلاح کے لیے فتویٰ شائع کر دیا جائے۔ اس میں جو صورت جناب کے نزدیک مناسب ہو۔ اس سے مطلع فرمایا جاوے۔ بطور مشورہ یہ سب صورتیں پیش کر رہا ہوں۔ والسلام

احقر۔ ۔ ۔ ۔ از تھانہ بھون"

بیان اور فتویٰ کا فرق

حضرت تھانوی کے ایماء پر جب مندرجہ صدر جواب لکھا جا چکا تو اس پر حضرت نے اپنی طرف سے مندرجہ ذیل عبارت ایزاد فرمائی:۔

"از اشرف علی۔ السّلام علیکم
مکرمت نامہ کے جواب میں خلاف معمول قدرے تاخیر اس لیے ہوئی کہ واقعات و مصالح و نتائج کے تعارض سے دماغ پریشان ہو گیا۔ اور مناسب طریق سوچنے میں بہت وقت صرف ہُوا۔ آخر فیصلہ ذہن میں یہ آیا کہ بیانِ مُتَعَارِف کو مسلمان ایک رائے کے درجہ سے زیادہ اہمیّت نہیں دیتے۔ نہ اس کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ البتّہ فتویٰ کو نظرِ عظمت سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے یہ صورت مناسب ہے اور اس کا مؤثر ہونا موقوف ہے۔ بدگمانی نہ ہونے پر۔ اس لیے خاکساروں سے بے تعلقی کے سوال پر تصریح ضروری ہے۔ والسّلام۔"

چنانچہ اس خط کے پہنچنے کے بعد لیگ والوں نے صراحتًا خاکساروں سے بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔ جس پر حضرت نے فتویٰ کی صورت میں شیخ صادق حسن کی امداد کرنے کا اعلان فرمایا۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ حضرت کی دعا اور فتویٰ مقبول ہُوا۔ اور شیخ صاحب کانگرس اور احرار دونوں کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی میں جا پہنچے۔

علامہ مشرقی جن سے حضرت ملنا چاہتے تھے۔ لکھنؤ میں ہی گرفتار کر لیے گئے۔ جس کی وجہ سے وہ میرٹھ نہ پہنچ سکے اور اس طرح ان سے ملاقات کی صورت نہ نکل سکی۔ اور ان کی اصلاح کی کوشش ناکام رہی۔

کانگرس کی مخالفت کی وجہ

اگرچہ ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کانگرس کے ساتھ تھے مگر ان کی نظر وقتی اور ذاتی مصالح پر تھی۔ اس کے نتائج پر نہ تھی۔ بخلاف ان کے حضرت کی نظر حق تعالیٰ کے اس فیصلہ پر تھی کہ:۔

وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ط

کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر قابو پاویں۔ تو تم کو تمھارے دین سے پھیر دیں۔

جس کی روشنی میں آپ پر کانگرس کے عزائم واضح ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے آپ سے سوال کیا کہ ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی جو ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی کیوں ناکام رہی۔ جبکہ اس کی کمان حضرت سید اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ ایسے نفوس قدسیہ کے ہاتھ میں تھی۔ تو آپ نے فرمایا کہ :-

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس لیے ناکامی ہوئی کہ اس تحریک میں ہندو شامل تھے۔ دونوں شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ مگر ہندوؤں نے وقت پر دغا دی۔ اب بھی ان کی وفا کی اُمید نہیں ہے۔ یہ وقت پر دھوکہ دیں گے۔ مسلمان اپنے ہی پاؤں پر کھڑا ہو کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ دوسروں کے سہارے کبھی نہیں۔"

اس لیے آپ وفاق ہند کے مخالف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ شرعی حدود کے اندر رہ کر اکیلے جنگ پاکستان لڑے۔ تاکہ کامیابی یقینی ہو۔ چنانچہ جب تک مسلم لیگ کانگرس کی ہم نوا رہی۔ آپ اس سے بالکل الگ رہے۔ اور جب اس نے دوسروں کا سہارا چھوڑ کر اپنا پلیٹ فارم الگ بنایا۔ تب آپ نے اس کی حمایت شروع کر دی۔

آپ کانگرس کے مخالف اس لیے نہ تھے کہ اس سے آپ کو کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ بلکہ آپ اس کی مخالفت کے لیے اس لیے مجبور تھے کہ وہ آزادیٔ ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتی تھی۔ چنانچہ جونہی زمامِ اقتدار اس

کے ہاتھ میں آئی۔ مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ مسجدوں کو مندروں میں بدلا جانے لگا۔ اور ہر اس روایت کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے درپے ہو گئی۔ جس کی صرف نسبت مسلمانوں سے تھی۔ یعنی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو باتیں ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۸ء میں ان کے عزائم کے متعلق بھری مجلس میں فرمائی تھیں۔ ۱۹۴۸ء کے بعد کے حالات نے ان کی حرف بہ حرف تصدیق کر دی۔ اور کانگریس کی اس مسلم کش پالیسی کے خلاف بالآخر انہی حضرات کو ہندوستان کی پارلیمان میں احتجاج کرنا پڑا۔ جو تحریک آزادی کے زمانہ حضرتؒ کے مسلک کی مخالفت کرنے والوں کی صف اوّل میں نظر آتے تھے۔ مگر کسی نے اس وقت اس پر غور نہ کیا کہ ع قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ جس کی وجہ سے انھیں یہ روزِ بد دیکھنا نصیب ہوا۔

مخالفت میں احتیاط

اس سیاسی کشمکش کے دوران میں آپ نے ہمیشہ انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ مثلاً

۱۔ جن معاملات میں علماء کا اختلاف ہوتا۔ ان میں بدوں کسی مکمل تحقیق وتفتیش کے کوئی فتویٰ یا اعلان شائع نہ فرماتے۔

۲۔ مقدور بھر تحقیق کے بعد اگر اعلان کی ضرورت بھی ثابت ہوتی۔ تو اس وقت بھی دوسری جانب کی پوری رعایت رکھ کر اعلان فرماتے۔ جس سے اختلاف کی خلیج وسیع ہونے اور عوام کو علماء کے خلاف برسرِ پیکار آنے کا موقع نہ ملتا۔

۳۔ اعلان کے بعد تحقیق حال اور مفاہمت باہمی کا سلسلہ برابر جاری رکھتے۔ اور قابل قبول چیزوں کے قبول کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔

مسلک کی نُدرت

سیاسی کشمکش کے دوران میں عُلمائے اُمّت اور لیڈرانِ قوم ہر مسئلہ پر

مختلف الرائے رہے۔ ہر جماعت نے اپنے علم یا تحقیق یا غرض کے ماتحت واقعات کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ واقعات بھی بسرعت تمام بدلتے رہے۔ جس کی وجہ سے شرعی نقطۂ نظر سے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان حالات میں حضرت کا جماعتی مسلک ان کے اپنے ارشاد کے مطابق ہمیشہ یہ رہا کہ:۔

"نہ اعلانِ حق میں کبھی دریغ کیا۔ نہ عمل میں کبھی نمائش اور ہنگامہ آرائی کو دخل دیا۔ میری جماعت جس طرح شورش پسند نہیں۔ اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتمانِ حق کرنے والی بھی نہیں"

(معاملة المسلمین فی مجادلة غیر المسلمین)

سیاسی تحریکات میں عدم شرکت

حضرت چونکہ درویش طبع تھے۔ اس لیے وہ سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لیتے تھے۔ مگر سیاسی تحریکات کے متعلق جب آپ کے پاس استفسارات آتے تھے۔ تو اس وقت بحیثیت مجدد الملت اور حکیم الامت آپ کو مسئلہ کی شرعی حیثیت واضح کرنی پڑتی تھی۔ بس آپ کا سیاسیات میں صرف اسی قدر حصہ تھا۔ اگرچہ آپ کو سیاست کے عملی میدان میں لانے کے لیے کانگرس اور اس کی حلیف جماعتوں نے بہت کوشش کی۔ مگر آپ ہمیشہ ان سے الگ تھلگ رہے کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ:۔

"میرے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت وابستہ ہے۔ جب تک مجھ کو شرح صدر نہ ہو جائے۔ میں شریک ہو کر اتنے سارے مسلمانوں کی ذمہ داری کس طرح اپنے سر لے لوں۔ کیا قیامت کے دن میری گردن نہ ناپی جائے گی۔ میں تو ان تحریکات کو مسلمانوں کے لیے سراسر مضر اور اس سلسلہ میں اکثر عوام میں جو طریق عمل اختیار کیے جا رہے ہیں۔ ان کو ناجائز سمجھتا ہوں۔ نیز میرے نزدیک ان کا نتیجہ سوائے ضرر کے اور کچھ نہیں"

(اشرف السوانح جلد ۳ صفحہ ۱۶۰)

بے نظیر استقلال و استقامت

غرضیکہ ان سیاسی طوفانوں نے بڑے بڑے اربابِ استقامت کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ مگر اس کوہِ استقلال کو اپنے مقام سے نہ ہٹا سکے۔ چنانچہ حضرتؒ بطور تحدث بالنعمۃ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"سب کو کچھ نہ کچھ اپنے مرکز سے ہٹنا پڑا۔ لیکن الحمد للہ میں جس مرکز پر اوّل روز تھا۔ اس مرکز پر آج تک بدستور قائم ہوں۔ مجھ کو بفضلہٖ تعالیٰ اپنی رائے سے ایک اِنچ بھی نہیں ہٹنا پڑا۔ بلکہ تجربوں نے تو اور بھی مجھ کو اپنی رائے پر مستحکم کر دیا ہے۔"

(اشرف السوانح جلد ۳ صـ۱۶۱)

انجامِ زندگی

اہتمامِ اصلاحِ اُمّت

دورِ انقلاب

حضرت تھانویؒ نے جو زمانہ پایا۔ وہ آج کل کی طرح فتنوں کا زمانہ نہیں تھا۔ مگر انقلاب کا زمانہ ضرور تھا۔ یعنی اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں دنیوی حیثیت سے نہیں دینی حیثیت سے ایک انقلابِ عظیم آچکا تھا۔ اور کتاب و سنت کے آئینہ میں دیکھنے سے مسلمانوں کا کوئی قول و فعل خدا و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کے مطابق نظر نہ آتا تھا۔

دین کو صرف عقاید و عبادات تک محدود سمجھ لیا گیا تھا۔ گو ان پر بدعات و رسومات کا رنگ غالب آچکا تھا۔ مگر اب نوبت ترک و اہمال تک آپہنچی تھی۔ اور عوام فرائض کی بجا آوری سے اس طرح گریز کرنے لگے تھے۔ جیسے ان کے ذمہ کوئی فرض ہی نہیں۔

اخلاق۔ معاشرت اور معاملات کو تو سرے سے جزوِ دین ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ انھیں دنیوی مسائل تصور کرکے ہر ہر حکم شرعی کے مقابلہ میں اپنی اپنی رائے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ عجیب و غریب رسوم اختراع کی جاتی تھیں اور انھیں اختیار کرنے میں شرم کی بجائے فخر محسوس کیا جاتا تھا۔ اور انھیں ہنر سمجھا جاتا تھا۔ یہ تو عوام کی حالت تھی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ عالم تھا کہ وہ احکامِ خدا و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نہ صرف تمسخر اڑاتے تھے۔ بلکہ ان کو اپنی نام نہاد ترقی کی

راہ میں حائل سمجھتے تھے۔

اہتمامِ اصلاح

حضرت تھانوی کو چونکہ حق تعالیٰ نے اصلاحِ اُمت کی اہم ترین خدمت کے لیے پیدا فرمایا تھا۔ اس لیے آپ نے اپنی تمام زندگی اہتمامِ اصلاحِ اُمّت میں ہی صرف کر دی۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ اتنا نادر علمی خزانہ چھوڑ گئے کہ اس کا عشیرِ عشیر بھی احاطۂ تحریر میں لانا از بس دشوار ہے۔ آپ صرف کتابوں کے دفتر کے دفتر ہی نہ چھوڑ گئے۔ بلکہ ہر طبقہ خیال کے لوگوں کی اصلاح کے لیے اس کے حسبِ حال طریقۂ عمل بھی تجویز کر گئے۔ اور اس کی تعلیم دینے کے لیے مجازینِ بیعت اور مجازینِ صحبت کی ایک بہت بڑی تعداد بھی چھوڑ گئے۔ تاکہ وہ آنے والی نسلوں کی اس بارہ میں رہنمائی کرتے رہیں اور یہ سلسلہ فیض و خیر جاری و ساری ہے۔

آپ دینی انحطاط کے جس دورِ انقلاب سے گزر رہے تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اس کا جائزہ لے کر وہ اسباب و علل معلوم کیے جو اس انقلاب کا باعث تھے۔ اس حکیم الاُمّت کی تشخیص میں اس کے سبب صرف یہ دو ہی تھے۔

"تشخیص اسبابِ انقلاب میں تامّل و تدبّر و تتبع کرنے سے معظم اسباب دو امر ثابت ہوئے۔ ایک قلّتِ علم یعنی قصد و ارادہ کی کمی یا فقدان سبب اوّل سے خود احکامِ ضروریہ و واقعیہ ہی مخفی رہتے ہیں۔ اور سبب ثانی سے باوجود خبر اور آگاہی کے نوبت عمل کی نہیں آتی۔" (اصلاحِ انقلاب)

بے خبری کے ازالہ کی تدابیر

حکیم الامّت حضرت تھانوی مصیبت کا علاج نہیں کرتے تھے۔ بلکہ

معصیت کا علاج کرتے ہیں۔ جو سبب بنتی ہے مصیبت کا۔ معصیت چونکہ ایک روحانی مرض ہے۔ اس لیے جسمانی امراض کی طرح اس کے اسباب کا ازالہ بھی اس کے معالجہ و اصلاح سے ہوتا ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص کے بعد اس کے اسباب کے ازالہ کی صحیح تدبیر کرنا اور بھی بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ جس کے لیے توجہ تام کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی نے برسوں کے تجربہ اور غور و خوض کے بعد متذکرہ بالا اسباب انقلاب کے ازالہ کی یہ تدابیر بتلائیں:۔

"بے خبری کے ازالہ میں تو معلّم اور متعلّم یعنی خواص و علماء احکام اور عوام طالبانِ احکام دونوں کو دخل ہے اور ہر ایک کے لیے جداگانہ ضروری دستور العمل ہے۔ طالبانِ احکام کا دستور العمل یہ ہے کہ

طالبانِ احکام کا دستور العمل

ان میں جو زیادہ فارغ ہیں۔ جیسے اہلِ تنعم اور اہلِ ثروت وہ اپنی اولاد کو علومِ دینیہ کے لیے فارغ کر دیں۔ گو ضروریاتِ دنیوی کے لیے ملکی زبان اور فنون رائجہ کی بھی تحصیل کا مضائقہ نہیں۔ مگر یہ درجہ تبعیت سے متجاوز نہ ہونے پاوے۔ پس اولاد تو یوں درست ہوئی اور خود کوئی وقت مقرر کر کے کسی عالم یا کامل الاستعداد طالب علم کے پاس جا کر یا اس کو بلا کر۔ اگر علوم عربیہ سے مناسبت ہو۔ تو وہ زیادہ بصیرت کا آلہ ہے۔ ورنہ اردو ہی کے مفید۔ اور ضروری رسائل کو محقق کے مشورے سے تجویز کر کے سبقاً سبقاً بہتر تو یہ ہے کہ دو تین بار ورنہ اقل درجہ تحصیلاً ایک ہی بار۔ پھر مطالعۃً چند بار ان پر عبور کر لیں۔ مگر یہ رسائل ایسے ہوں۔ جن میں سب اجزاء کا

کافی بیان ہو۔ یعنی عقائد۔ دیانات ۔ معاملات ۔ معاشرت اور اخلاقِ باطنہ۔

جن کو معاش کی ضرورت سے زیادہ فراغت نہیں ہے۔ اور حرف شناس ہیں یا بآسانی ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنے لیے بھی اور اپنی اولاد کے لیے بھی بجائے علوم عربیہ کے وہی رسائل دینیہ اُردو کے بطور درس طالب علمانہ کے تجویز کرلیں۔ اور پھر بطور دوبارہ ان کا بار بار مطالعہ کریں۔ اور جب تک درس کا انتظام نہ ہو سکے۔ بطور خود ہی دو چار ورق روزانہ بالالتزام مطالعہ کیا کریں۔ اور مواقع خلجان میں خود رائی سے کام نہ لیں بلکہ نشان بنا کر چھوڑ دیں۔ اور ماہر کے میسر ہونے کے وقت اس کی تحقیق کریں۔

جو لوگ ان میں حرف شناس نہیں ہیں۔ نہ بآسانی ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کو کسی وجہ سے اس کے لیے فارغ کر سکتے ہیں۔ وہ ایسا انتظام کریں کہ ہفتہ میں بہتر تو یہ ہے کہ ہر روز ورنہ ایک ہی روز خاص مجلس عمل کے لیے بالالتزام مقرر کریں۔ اور کوئی عالم یا صحبت یافتہ اہل علم کا جو ان رسائل کو اچھی طرح سمجھا ہُوا ہو۔ تجویز کریں۔ اور اگر کسی عالم سے تجویز کرالیں زیادہ احتیاط ہے اس روز سب لوگ کسی خاص مقام مسجد وغیرہ میں جمع ہو کر اس خواندہ فہمیدہ شخص کو لا کر ایک معین وقت تک مثلاً گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ ان رسائل کو سُنا کریں اور سمجھا کریں۔

اگر ایسا شخص مفت نہ ملے تو کچھ اس کی مالی خدمت کریں اور سنانے والے شخص کو جہاں شبہ رہے پنسل وغیرہ

سے نشان بنا کر اس وقت اس کو رہنے دیں۔ پھر جب کوئی عالم میسر ہو۔ اس سے حل کر لیں اور سب مجمع کو پہنچا دیں۔ اور جہاں دیہات وغیرہ میں ایسا شخص نہ ہو۔ تو آپس میں مشروع طریق سے چندہ کر کے اس چندہ سے کوئی ایسا آدمی باہر سے بلا کر رکھ لیں اور طریق جاری کریں۔

ضروری التزام

تمام طبقات مذکور میں علاوہ اس تحصیل یا مطالعہ یا سماع رسائل کے دو امر کا اور بھی التزام رکھیں۔ ایک یہ کہ اپنے اعمال و احوال میں جب کوئی امر جس کا حکم معلوم نہ ہو پیش آوے۔ فوراً علماء حقانی سے اس کو دریافت کریں۔ اور اگر بوجہ بعد زبانی نہ پوچھ سکیں۔ تو بذریعہ خط کے تحقیق کریں۔ اگر اوسط ایک مسئلہ روزانہ کے حساب سے تقریراً یا تحریراً پوچھ پاچھ رکھیں۔ تو سال بھر میں ساڑھے تین سو سے زیادہ اور دس سال میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مسئلے معلوم ہو سکتے ہیں کہ بعض نام کے یا جدید عالموں کو بھی اتنے مسائل معلوم نہیں اور یہ کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔

دوسرے اس امر کا التزام رکھیں کہ علماء کی مجلس میں جایا کریں۔ خواہ خاص مجلس ہو جیسے جلسہ ملاقات و زیارت۔ خواہ عام مجلس ہو۔ جیسے جلسہ وعظ و نصیحت اور جو سنیں دل سے یاد رکھیں۔ یہ تو مردوں کا انتظام ہو۔

اب عورتیں رہ گئیں۔ سو یہ مجموعی انتظام مذکورہ ان

کے لیے اشکال سے خالی نہیں اس لیے سہل تر ان کے لیے یہ طریق ہے کہ معلمہ عفیفہ دیندار مل جائے تو کمسن لڑکیوں کو اس کے ذریعہ سے قرآن مجید اور ایسے رسائل کی تعلیم دلادیں اور ان کے لیے بہشتی زیور کے دس حصے بالکل انشاءاللہ کافی ہیں۔ بلکہ بانضمام گیارھویں حصہ مسمی بہشتی گوہر کے مردوں کے لیے بھی کافی ہیں اور اگر کوئی معلمہ ایسی نہ ملے یا کسی لڑکی کو فراغ یا مناسبت نہ ہو تو ان کو بھی بڑی عورتوں کے انتظام میں شامل سمجھا جاوے۔ اور وہ انتظام دو ہیں۔ ایک یہ کہ گھر کے مردوں میں سے اگر کوئی خواندہ ہو۔ تو وہ روزانہ کچھ وقت معین کر کے سب گھر والیوں کو اس وقت جمع کر کے رسائل بالا سنایا کریں۔ سمجھایا کریں۔ بلکہ کئی دورے کر دیں۔ دوسرا انتظام یہ ہے کہ گاہ گاہ کسی متورع یا متبع سنت عالم کا گھر میں وعظ کہلا دیا کریں کہ یہ عجیب مؤثر عمل ہے۔

علماء احکام کا دستور العمل

یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اس میں ساعی رہیں کہ ناواقفوں تک احکام پہنچیں۔ اور اس کی یہ صورتیں ہیں۔

ایک درس (گو بعوض ہو) اس میں علوم ضروریہ کو مقدم اور مہتم بالشان رکھیں۔ دینیات سے حتی الامکان طالب علم کو پہلے فارغ کر دیں۔ اگر طالب علم دینی مختصرات یا اُردو کے رسائل بھی پڑھے اور اپنے پاس وقت ہو۔ تو ہرگز اس کے درس کو خلافِ شان نہ سمجھے۔ طالب علم کے فضول سوال پر اس کو متنبہ کرے۔ جواب نہ دے۔

دوسری صورت وعظ ہے۔ جس میں عام خطاب ہے۔ اس میں ضرورت وقت کا لحاظ رکھیں جن امور پر لوگ اس زمانہ میں مبتلا ہوں۔ یا جن ضروریات میں فروگزاشت کرتے ہوں۔ مدار بیان اس پر رکھے۔ دوسرے مضامین اگر ہوں۔ تو بالتبع وبتقلب ہوں اور یہ ضروری مضامین جمیع ابواب کے ہوں۔ صرف عقائد و دیانات پر اکتفا نہ کرے۔ بلکہ معاملات و معاشرت و اخلاق سے بھی مشبع بحث کرے۔ بلکہ بوجہ متروک ہونے کے یہ ثلثہ اخیرہ زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔ اور وعظ میں بات صاف کہے کہ سننے والوں کی سمجھ میں خوب آجاوے۔ مگر خشونت اور اشتعال انگیز طرز سے نہ بچے۔ اور وعظ میں عوض نہ لے۔ البتہ اگر وعظ کا نوکر ہو۔ وہ بات اور ہے۔

تیسری صورت جواب ہے استفتاء کا۔ خواہ زبانی سوال ہو یا تحریری ہو۔ اس میں ان امور کا لحاظ رکھے کہ حتی الامکان جواب میں توقف نہ کرے۔ یعنی سوال کا جواب نہ دے۔ بلکہ سائل کو متنبہ کردے۔ اگر سوال محتمل دو صورتوں کو ہو۔ تو تشقیق سے جواب نہ دے کہ اگر اس طرح واقع ہے۔ تو یہ جواب ہے۔ اور اگر اس طرح ہے تو یہ جواب ہے)۔ بلکہ سائل سے پہلے صورت واقعہ متعین کرا لے۔ پھر جواب دے۔ کیونکہ بعض اوقات سائل دونوں شقوں کا حکم سن کر ایک شق کو اپنے مفید مطلب سمجھ کر سوال میں اس کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے سائل کا یا اس کے فہم سے خارج ہو گی۔ یا دوسرے مصححین کی سہولت کے لیے اگر

دلیل کی طرف اشارہ کر دے۔ یا کوئی عبارت بلاترجمہ نقل کر دے۔ مستحسن ہے۔

اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سائل غالب اس تحریر کو اچھی طرح نہ سمجھے گا۔ یا سمجھنے میں غلطی کرے گا۔ جواب لکھ کر دے کہ کسی عالم سے اس جواب کو زبانی حل کرے۔ اگر قرائن سے معلوم ہو۔ کہ سوال براہِ تعنت ہے۔ جواب نہ دے۔ غرض اہل سے دریغ نہ کرائے۔ نااہل کو منہ نہ لگائے۔

چوتھی صورت تالیف و تصنیف ہے۔ خواہ اشتہار ہو یا اخبار ہو۔ یا رسالہ و کتاب ہو اس میں بھی ضرورت وقت کا لحاظ اور عبارت میں سلاست اور کفایت کی رعایت ہو اور اگر خدا تعالیٰ معاش کی کوئی صورت اور سبیل عطا فرما دے۔ تو اپنی تصانیف کی خود تجارت نہ کرے۔

علماء کے احکام کے دستور العمل کا مہتمم ایک اور امر بھی ہے۔ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور منجملہ اس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کفار کی تبلیغ بھی ہے۔ خواہ بذریعہ تقریر اور خواہ بذریعہ تحریر۔ اپنے ملک کے کفار کو بھی اور دوسرے ملک کے کفار کو بھی۔ اس غرض کی تحصیل و تکمیل کے لیے۔ اگر ان اقوام کی زبان بھی سیکھ لے۔ تو بشرطِ خلوص نیت عین طاعت ہے۔ جیسے اس غرض سے انگریزی پڑھ لینا۔ تبلیغ احکام کے متعلقات ہی میں سے ان احکام کی ایک خاص حفاظت بھی ہے۔ یعنی اصول و فروع پر جو حملے یا آمیز شیں ہیں۔ خواہ اہل کفر ہوں۔ یا اہلِ بدعت۔ ان کو دفع کرنا اور رفع کرنا۔ تاکہ طالبانِ حق شبہات سے محفوظ

رہیں اور اس مقصود کے لیے اگر اہلِ باطل پر ردو قدح کرنے کی حاجت ہو۔ یا اُن سے مناظرہ کرنا مصلحت ہو۔ تو اس سے بھی پہلوتہی نہ کرے۔ اس ردو قدح یا مناظرہ کے لیے اگر اہلِ باطل کے علوم وفنون حاصل کرنا ضروری ہو۔ وہ بھی طاعت ہے۔ جیسے اس وقت سائنس وغیرہ سیکھنا۔

ضعفِ ہمّت کے ازالہ کی تدبیر

تجربہ سے ثابت ہُوا ہے کہ اُمورِ ذیل کو تقویت ہمّت میں خاص اثر اور دخل ہے ایک اُن میں سے صحبت شیوخ کاملین کی ہے جن کی علامتیں یہ ہیں کہ وہ بقدرِ ضرورت علم دین رکھتا ہو۔ عقائد و اعمال و اخلاق میں شرع کا پابند ہو۔ دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔ کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبۂ دنیا ہے۔ کسی شیخ کامل کی صحبت میں چندے رہا ہو۔ اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔ بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ اس سے لوگ بیعت ہوں۔ ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلّت حرص دنیا کے اچھی ہو وہ شیخ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو۔ اور ان کی کوئی بُری بات دیکھے یا سُنے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔ اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔ خود بھی وہ ذاکر شاغل ہو۔ اس لیے کہ بدون عمل یا عزم

عمل تعلیم میں برکت نہیں ہوتی اور صدور کشف و کرامت اور استجابت دعا و تصرفات لوازم مشیخت سے نہیں۔ غرض ایسے حضرات کی صحبت خاص طور پر مؤثر ہے۔ مگر اس صحبت کی تاثیر میں شرط یہ ہے کہ اس میں نیت بھی یہی ہو کہ میرے قلب میں رغبت طاعت اور نفرت معاصی پیدا ہو۔ اور اس کے ساتھ اس کا بھی التزام رہے کہ اپنی کیفیات قلبیہ کی شیخ کو اطلاع دے کر جو معالجہ تجویز فرمایا جائے۔ اس پر کاربند ہو۔

دوسرا امر جو ان میں سے بوقت میسّر نہ آنے صحبت کاملین کے اہل اللہ کے حالات و مجاہدات کا مطالعہ یا استماع (دیکھنا سننا) ہے۔ مگر ان سے جو مقالات متعلقہ اسرار مسائل غامضہ تصوّف ہیں۔ ان میں ہرگز مشغول نہ ہو۔ البتہ علوم معاملہ یعنی تربیت باطن و تہذیبِ نفس کے بارے میں جو کچھ ان کے اقوال ہیں۔ وہ سرتاپا عمل درآمد بنانے کے قابل ہیں۔

تیسرا امر ان میں سے مراقبۂ موت و مابعد الموت ہے۔ مراد اس سے ابتدار نزع روح سے دخول جنّت یا نار تک جو اہوال (خوفناک اُمور) پیش آنے والے ہیں۔ مثلاً سوال نکیرین و عذاب و نعیم قبر و حشر و وزن اعمال و حساب و جزا و عبور صراط وغیرہ سب کو کسی وقت فراغ میں بالالتزام روزانہ کم از کم بیس منٹ سوچا کریں۔ تقویت ہمت میں جن ملکات کو دخل ہے۔ اس مراقبہ سے ان کا کمال پیدا ہو جائے گا۔"

احتیاطی تدابیر

انقلابِ اُمّت کی اصلاح کی تعبیر کی تعیین و تفصیل کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

"چونکہ ہر تدبیر عمل کرنے کے ساتھ اس کے موافع تاثیر سے تحرز بھی واجب ہوتا ہے۔ جس طرح امراضِ جسمانی میں پرہیز کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے ان تدابیر اصلاح کے ساتھ اُن اُمور سے بچنا بھی ضروری ہوگا۔ جو ان کے اثر میں خلل انداز ہیں۔

بیان اس کا یہ ہے کہ ان تدابیر میں سے بعض علماء کے متعلق تھیں۔ یہاں ان کے باب میں کلام مقصود نہیں۔ کیونکہ وہ خود جانتے ہیں۔ صرف ان میں جو عوام کے متعلق ہیں۔ ان میں بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے۔ سو اس باب میں یہ اُمور تبلائے گئے تھے:

۱۔ کتب دینیہ کا پڑھنا یا دیکھنا یا سننا ۲۔ علمائے دین سے مسئلہ پوچھنا۔ ۳۔ وعظ سننا۔ ۴۔ صحبت اہل کمال۔
۵۔ گھر والوں کو خود پڑھانا یا سُنانا یا کسی کے ذریعہ سے پڑھوانا۔ سنوانا۔ اِن اُمور پنجگانہ میں سے ہر ایک میں بعض لوگ بے احتیاطیاں کرتے ہیں۔ جو معالجہ مطلوب میں بدپرہیزی کا حکم رکھتے ہیں بالترتیب ہر ایک کے متعلق مختصراً تنبیہ ضروری ہے۔

۱۔ کُتب دینیہ کا پڑھنا یا سُننا

اس کے متعلق آج کل بعض بکثرت یہ غلطی کرتے ہیں کہ جو کتاب دین کے نام سے دیکھی یا سُنی خواہ اس کا مضمون حق ہو یا باطل۔ خواہ اس کا مصنّف ہندو ہو یا عیسائی۔ یا دہری یا مسلمان۔ پھر مسلمان گو صاحبِ بدعت ہی ہو۔ غرض کچھ

تفتیش نہیں کرتے۔ اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں اور اسی میں وہ مضامین آ گئے۔ جو کسی مسئلہ کے متعلق اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ سو اس میں چند مضرتیں ہیں۔ بعض اوقات بوجہ کم علمی کے بھی امتیاز نہیں ہوتا۔ کہ ان میں کون صحیح ہے۔ کون غلط۔ کسی غلط کو صحیح سمجھ کر عقیدہ یا عمل میں خرابی کر بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ امر غلط ہے۔ مگر بعض مصنفین[1] کا طرز بیان ایسا تلبیس آمیز یا دل آویز ہوتا ہے کہ دیکھنے والا فی الفور اس سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پہلے اعتقاد کو ضعیف اور بے وقعت خیال کر کے بعض دفعہ تو اس پہلے کو غلط اور اس پچھلے کو صحیح سمجھ لیتا ہے اور بعض دفعہ گو اس کو قبول نہیں کیا۔ مگر متزلزل اور مذبذب ہو کر کبھی دل میں رکھتا ہے اور پریشان ہوتا ہے اور کبھی دوسروں سے تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ اس میں کچھ غموض ہوتا ہے جس کے ادراک کے لیے اس کا علم و ذہن کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آتا اور بے سمجھے لایعنی سوالات کر کے دوسروں کو پریشان کرتا ہے۔ اور اپنے فہم کا قصور فہم میں نہیں آتا۔ اور جواب دینے والوں کو جواب سے عاجز سمجھ کر ان کے علم یا اخلاق میں تنگی کا حکم لگا کر ان سے بدگمان ہو جاتا ہے اور کبھی انواع مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان سب کا انسداد یہی ہے کہ کوئی کتاب۔ کوئی اخبار کوئی رسالہ کوئی تقریر تاوقتیکہ کسی محقق عالم کو

---

[1] یہ حضرت کی آخری تصنیف بوادر النوادر میں شامل ہے۔

نہ دکھلا لیں اور اس سے رائے نہ لے لیں۔ ہرگز نہ دیکھیں۔

اخبارات کے بعض مفاسد اس قسم کے احقر نے ایک مستقل تحریر مسمّٰی بہ "اخبار بینی" میں ایک زمانہ میں لکھے تھے۔ جس پر بلا تدبّر بعض معترضین نے غُل مچایا۔ مگر وہ تحریر بغور پڑھنے کے قابل ہے۔ اس لیے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ کسی اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ ہر حالت میں حرام ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ چونکہ ان چیزوں میں بعض اوقات ایسے مفاسد ہوتے ہیں۔ اور ان مفاسد سے بچنا ملتِ اسلامیہ میں واجب ہے۔ اور بچنا بدوں معرفت کے ہو نہیں سکتا۔ اور معرفت خود ہے نہیں۔ اس لیے کسی صاحب معرفت یعنی عالم محقق سے مشورہ لے کر اس کا اتباع ضروری ہوگا۔

افسوس ہے کہ باوجود وضوح اس امر کے پھر اس ممانعت کو تنگ خیالی و تعصب پر محمول فرمایا جاتا ہے۔ کیا خیر خواہ باپ اپنے بچے کو زہر ملی ہوئی مٹھائی کے کھانے سے روکے۔ کوئی عاقل اس بات کو متعصب کہے گا۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم خذ ما صفا ودع ما کدر کے طور پر اس کو دیکھتے ہیں۔ اس کا جواب اُدھر کی تقریر سے واضح ہو گیا ہے کہ اس امتیاز کے لیے علم کامل اور فہم دانی کی حاجت ہے اور کلام اس کے ناقد میں ہے۔ رہا کسی کا اپنے کو ناقد نہ سمجھنا۔ یہ معتبر نہیں۔ بلکہ کسی عالم کا کسی کو ناقد کہنا اس کے اثبات کے لیے کافی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جناب رسول کریم و نبی حکیم شفیع معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے راسخ العلم والعمل شخص کو تورات کے مطالعہ سے منع فرمایا۔ باوجودیکہ فی نفسہٖ آسمانی کتاب تھی۔ گو اس میں تحریف بھی ہو گئی تھی۔ اور پھر مطالعہ بھی تنہا نہ تھا۔ بلکہ خود حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا رہے تھے۔ اور اس میں جزو محرف کا معین و مبین ہو جانا ظاہر تھا۔ اس کے بعد کسی فساد کا احتمال ہی نہ تھا۔ معہذا پھر اس مصلحت سے کہ آئندہ کو یہ عمل ان مفاسد کے باب مفتوح ہونے کا سبب بن جائے۔ کس سختی سے منع فرمایا۔ اور کیسی ناخوشی ظاہر فرمائی۔ جیسا کہ حدیث دارمی میں مذکور ہے۔

ان دلائل حسیہ و حدیثیہ کے بعد اُمید ہے کہ اہلِ انصاف مصلحت اندیش کو کوئی خدشہ نہ رہا ہوگا۔ جبکہ اس تقریر سے وہ کتابیں وغیرہ بھی قابل تحرز قرار پائیں۔ جو میں مصالح کے ساتھ بعض مفاسد بھی ہوں۔ سو جن میں سرتاسر مفاسد ہوں۔ جیسے ناول (افسانے) وغیرہ جن سے اعمال و اخلاق کا بڑا حصہ نہایت گندہ ہو جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ کس طرح جائز سمجھا جائے گا بالخصوص نوجوانوں اور عورتوں کو۔ بلکہ اگر ایسی کتابیں گھر میں دیکھی جاویں۔ آگ میں جلا دینا ہی ان کا حق ادا کرنا ہے۔

اب اس ذیل میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے کے لیے ایک مختصر نصاب قابل مطالعہ کتب کا معین کر دیا جائے تاکہ ان میں مشغول رہ کر مخدوش کتب سے محفوظ رہیں:۔

بہشتی زیور گیارہ حصے۔ تعلیم الدین۔ فروع الایمان۔ جزاء الاعمال۔ تبلیغ دین۔ قصد السبیل۔ حیات المسلمین۔

شوق وطن اگر اس سے زیادہ مطول و مفصل ضرورت ہو کسی عالم محقق سے دریافت کر لیا جاوے۔

علماء دین سے مسئلہ پوچھنا

اس میں چند غلطیاں کی جاتی ہیں ایک یہ کہ کیف ما اتفق کسی سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی نہیں تحقیق کرتے کہ یہ شخص واقع میں عالم بھی ہے یا نہیں۔ کسی کا نام مولوی سن لیا اور اسی سے دین کی باتیں پوچھنے لگے۔ بعض اوقات عالم ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس مشرب کا کس عقیدہ کا ہے۔ ایسے شخص کے جواب میں بعض اوقات تو عقیدہ باطل میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تردّد اور شبہ میں پریشان ہوتا ہے۔ یا پریشان کرتا ہے۔ جیسا کہ امر اوّل کے بیان میں گزر چکا ہے۔

دوسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ ایک مسئلہ کو کئی کئی جگہ پوچھتے ہیں۔ بعض اوقات جواب مختلف ملتا ہے۔ تو اس وقت یا تو تعیین راجح میں پریشان ہوتے ہیں۔ یا جس میں نفس کی مصلحت ہوتی ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور کبھی اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ تو استفسار سے یہی مقصود ہو جاتا ہے کہ نفس کے موافق جواب ملے اور جب تک ایسا جواب نہیں ملتا۔ برابر اس کد و کاش میں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وضع تدین سے بمراحل بعید ہے۔ اور تلعب فی الدین ہے۔

تیسری غلطی اس دوسری غلطی سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک مجیب کا جواب دوسرے مجیب کے سامنے

نقل کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ بعض اوقات طبیعت کا خاص رنگ ہوتا ہے بعض اوقات نقل کا لب ولہجہ کچھ معارضانہ ہوتا ہے۔ اس لیے کبھی اس مجیب کی زبان سے دوسرے مجیب کی نسبت یا اس کے جواب کی نسبت کوئی ناملائم لفظ نکل جاتا ہے۔ پھر یہی ناقل یا کوئی دُوسرا اس مجیب تک اس کو پہنچا دیتا ہے۔ پھر وہ کچھ کہہ دیتا ہے۔ اس کی خبر اس پہلے تک پہنچتی ہے اور بعض دفعہ بلکہ اکثر ان مقولات میں بھی بہت کچھ لفظی یا معنوی تغیر و تبدل کر دیا جاتا ہے اور اس طرح باہم ایک فساد عظیم ان میں برپا ہو جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ ہے کہ غیر ضروری مسئلے پُوچھے جاتے ہیں۔ ایک غلطی یہ ہے کہ مسائل کے دلائل دریافت کیے جاتے ہیں۔ جن کے سمجھنے کے لیے علوم درسیہ کی حاجت ہے۔ چونکہ اس سائل کو وہ حاصل نہیں۔ اس لیے دلیل کو سمجھتا نہیں اور اگر اسی خیال سے کوئی مجیب دلیل بتلانے سے انکار کرتا ہے۔ تو اس غریب کی بدخلقی پر محمول کیا جاتا ہے۔ ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ کسی سے کسی مسئلہ میں مباحثہ شروع کرتے ہیں۔ پھر اپنی تائید کے لیے فتوےٰ حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ وہ فتوےٰ اپنے مخالف کو دکھلا کر اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے موافق فتوےٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح خواہ مخواہ باہم جنگ و جدال کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ عوام کو اس میں پڑنا موجب خطر ہے۔ اگر ان سے کوئی اہل باطل الجھے تو علماء کا حوالہ دے کر اس کو قطع کر دیا جائے اگر غرض ہو گی۔ آپ پوچھے گا۔

ان سب غلطیوں کی اصلاح اس سے ہو سکتی ہے کہ اپنا دستور العمل اسباب میں یہ رکھیں کہ جب کوئی ضروری بات پیش آوے۔ اپنے عمل کرنے کے لیے نہ کہ مباحثہ کے لیے۔ ایسے شخص سے مسئلہ پوچھیں۔ جس کا معتبر محقق ہونا صحیح ذریعہ سے پہلے معلوم ہو۔ اور اس پر اعتماد و اعتقاد بھی ہو اور دلیل دریافت نہ کرے۔ اور نہ کسی دوسرے عالم سے بلاضرورت پوچھیں۔ اگر باوجود ان سب رعایتوں کے اس کے جواب میں شبہ رہے اور شفا نہ ہو۔ تو ایسی ہی صفت کے دوسرے عالم سے پوچھ لیں۔ اور اگر جواب پہلے کے خلاف ہو۔ تو پہلے کا جواب اس کے اور اس کا جواب پہلے کے سامنے نقل نہ کرے۔ اور جس قول پر قلب مطمئن ہو۔ اس پر عمل کریں۔

یہی عمل اس حالت میں کریں جبکہ بلا مراجعت دوسرے عالم کے خود بخود جواب اوّل کے خلاف کوئی جواب اس باب میں گوش زد ہو جائے۔ اگر استفتاء تحریراً ہو۔ تو ان رعایات کے علاوہ اور بھی رعایتوں کا لحاظ رکھیں۔ یعنی سوال کی عبارت اور خط بہت صاف ہو۔ حتی الامکان فضول غیر متعلق باتیں اس میں نہ لکھیں۔ اپنا پتہ و نام صاف لکھیں۔ اگر کئی بار ایک ہی جگہ استفتاء جاویں۔ تب بھی ہر خط میں اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں اور جواب کے لیے ٹکٹ ضرور رکھ دیا کریں۔ پورا پتہ لکھ دیں۔ شاید اس وقت جواب مسئلہ کا نہ دے سکیں۔ تو بعد میں ڈاک میں بھیج دیں۔ ورنہ ٹکٹ واپس آجائے گا۔ اور اگر کئی سوال ہوں تو کارڈ پر بھیجا کریں۔ اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جائے۔ تو ان سوالوں پر نمبر ڈال کر ان کی ایک نقل اپنے پاس

بھی رکھ لیں اور مکتوب الیہ کو اطلاع دے دیں کہ ہمارے پاس سوالات کی نقل نمبر وار موجود ہے۔ آپ اعادہ سوال کی تکلیف نہ کریں۔ نمبروں کی ترتیب سے جواب لکھ دیں۔

۳۔ وعظ سُننا

جس قسم کی غلطیاں نمبر اول میں کی جاتی ہیں۔ اس قسم کی غلطیاں لوگ یہاں کرتے ہیں۔ کیونکہ تحریر و تقریر دلالت احکام و آثار میں متقارب ہیں۔ یعنی لوگ ہر قسم کے واعظوں کا وعظ سن لیتے ہیں۔ اس کے وہی مفاسد ہیں جو نمبر اوّل میں تھے اور ان کا وہی انسداد ہے جو مفاسد متعلقہ نمبر اوّل کا تھا۔ جب کوئی واعظ جدید آوے۔ آپ شہر یا قریب کے کسی عالم معتبر سے اس واعظ کی حالت پوچھ لیں۔ اگر وہ اطمینان دلا دے۔ تو وعظ سُننے ورنہ نہ سُنتے۔ کیونکہ بعض واعظ جاہل ہوتے ہیں اور بعض بدمذہب۔ اور ان میں بعض اپنے مدّعا کے ذہن میں جما دینے سے ملکہ رکھتے ہیں۔ اور بعض ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ اول اول مخاطبین کے موافق کہتے ہیں۔ پھر بعد مناسبت و موانست اپنے مسلک کی دعوت شروع کر دیتے ہیں۔ پس اس معاملہ میں محتاط رہنا چاہیئے۔ اور اگر باوجود احتیاط کے کوئی بات مشتبہ کان میں پڑ جائے۔ تو علماء محققین سے اس کام کی تحقیق کر لیں۔

۴۔ اہل کمال کی صحبت حاصل کرنا

اس میں جو دھوکا ہوتا ہے وہ بہت عام ہے یعنی جو علامتیں

اہلِ کمال کی ہیں۔ ان کی رعایت نہیں کی جاتی۔ جن کو احقر نے مضمون سابق میں "قصد السبیل" سے نقل کیا ہے۔ اس کا انسداد ان علامات کی رعایت ہے۔ بقول مولانا رومیؒ

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

اس کے ذیل میں اس کی صحبت کی مضرت بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ جو مقتدا بنا کر نہ ہو۔ محض دوستی کے طور پر ہو۔ مگر وہ دوست بددین ہو۔ یہ بھی غلطی عظیم ہے۔ تجربہ سے ایک دوست کا اثر طبعًا دوسرے دوست پر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے ارشاد نبوی ہے المرء علیٰ دین خلیله فلینظر بحاله۔ البتہ جو ملاقات بضرورت ہو۔ وہ مستثنیٰ ہے۔

۵۔ گھر والوں کو خود پڑھانا

اس میں جو غلطیاں ہوتی ہیں ان کا مجموعہ امور رابعہ کے بیان میں منتشر طور پر بطور علاج آگیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گھر والوں کے لیے کتابیں جو تجویز کی جائیں یا واعظ جو بلوایا جائے۔ ان میں رعایات مذکورہ سابقہ ملحوظ ہوں اور یہ امر تصریح و تخصیص کے ساتھ اس قابل ذکر ہے کہ سیانی لڑکی کا معلم نامحرم جوان یا میانہ عمر کا جائز نہ رکھا جائے۔" (اصلاح انقلاب)

حضرت تھانوی کے صدہا نظائر افادات علمیہ مفیدہ میں سے یہ مضمون حضرت کے علمی اہتمام اصلاح اُمت کا ایک مفید اور کار آمد نمونہ ہے۔ جس کے ذریعہ حضرت نے اصلاح اُمت کا ایک جامع و مانع طریق تجویز فرمایا کہ اگر اس پر مسلسل اور متواتر عمل ہوتا رہے۔ تو امت کے ہر طبقہ کی بسہولت اصلاح ہو سکتی ہے اور اس سے ہر زمانہ میں فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

مجازین صحبت و بیعت

چشمۂ فیض

حضرت تھانوی کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کے بعد یہ چشمۂ فیض اسی طرح جاری رہے۔ اس لیے آپ نے جہاں اصلاحِ اُمّت کے لیے مختلف دستور العمل مرتب فرمائے۔ وہاں سلسلۂ مجازین قائم کر کے اس بات کا بھی اہتمام فرمایا کہ ان کے ذریعہ آئندہ بھی اشاعتِ طریق کا سلسلہ جاری رہے۔ آپ کی خواہش تھی کہ:۔

"میرے سپرد دین کے جتنے کام ہیں۔ وہ سب میرے بعد بھی بدستور چلتے رہیں۔ اور کسی کو میرے نہ ہونے کا اس بناء پر افسوس نہ ہو کہ فلاں دین کا کام اب کون کرے گا۔ اس مصلحت سے بھی میں اپنی مختلف دینی خدمات کو وقتاً فوقتاً دوسروں کے سُپرد کر کے اِدھر اُدھر منتقل کرتا رہتا ہوں۔"

مجازینِ صحبت

اس لیے ایسے حضرات کی نسبت جو آپ کی تعلیم و تربیت اور فیضِ صحبت سے اپنے اندر تلقین صلاحیت پیدا کر چکے تھے۔ ایک روز آپ کو خیال آیا کہ:۔

"بعض ایسے احباب کو جو تلقین کی کافی صلاحیت رکھتے ہیں۔ گو اجتماع شرائط بیعت میں بعض خاص حالات کا انتظار ہے۔

تلقین بلا بیعت کی اجازت دے دوں"

تاکہ وہ لوگوں کو جس قدر فیض پہنچانے کے اہل ہیں۔ فیض پہنچا سکیں۔ اس سے ایک مقصود یہ بھی تھا کہ ایسے حضرات میں مزید اصلاح و تکمیل کا شوق پیدا ہوگا۔ وہ بالکل بے فکر نہ ہو جائیں گے بلکہ اجازت بیعت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ اپنی تکمیل کی فکر و سعی کرنے لگے ان حضرات کا لقب آپ نے "مجازِ صحبت" تجویز فرمایا۔

آپ کی یہ تجویز بہت کارگر ثابت ہوئی۔ اور ایسے متعدد افراد اپنی تکمیل و اصلاح میں پہلے سے کہیں زیادہ فکرمند اور سرگرم ہو گئے۔ جن کی اطلاعات حضرت کو برابر پہنچ رہی تھیں اور جن کی بناء پر حضرت نے اپنی اس تجویز کے مفید ہونے کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا کہ :۔

"الحمد للہ میرا یہ خیال کہ اس قسم کی اجازت دے دینا خود اجازت یافتگان کے لیے بہت نافع ہوگا۔ بالکل صحیح نکلا۔ کیونکہ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو۔ جس پر اس اطلاع کے ملتے ہی گریہ طاری نہ ہو گیا ہو۔ اور اپنی ناکارگی پیش نظر ہو کر خود اپنی فکرِ اصلاح نہ دامن گیر ہو گئی۔ جیسا کہ ان کے اطلاع یابی کے بعد کے خطوط سے معلوم ہوا۔"

اس کے بعد یہ سلسلہ مستقل کر دیا گیا۔ مجازین صحبت میں سے جن میں جملہ شرائط بیعت کا اجتماع ہو جاتا۔ ان کو مجازِ بیعت بنا دیا جاتا۔

مجازین بیعت

مجاز بیعت صرف ان اصحاب کو بنایا جاتا تھا جو :۔

۱۔ متقی ہوں۔ ۲۔ خود اپنی اصلاح کیے ہوئے ہوں۔ ۳۔ ان کو طریق سے مناسبت پیدا ہو چکی ہو۔ لیکن محض علمی مناسبت نہیں

بلکہ حالی۔ ۴۔ ان میں دوسروں کی بھی اصلاح کرنے کی اہلیت پیدا ہو گئی ہو۔ ۵۔ اوصاف مذکورہ میں ان کو بقدر ضرورت رسوخ بھی حاصل ہو گیا ہو۔ ۶۔ ان سے یہ توقع بھی ہو۔ کہ گو فی الحال ان کو اوصاف مذکورہ میں رسوخ کا درجۂ ضروریہ حاصل ہے۔ لیکن وہ آئندہ ترقی کر کے اس رسوخ کا درجۂ کاملہ بھی حاصل کر لیں گے۔

حضرت کے ہاں اجازت بیعت و تلقین کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ خود پہلے بیعت ہو چکا ہو۔ بلکہ جن میں بیعت و تلقین کی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔ ان کو فوراً مجاز بنا دیا جاتا۔ کیونکہ نفع بیعت پر موقوف نہیں ہوتا۔ بلکہ تعلیم اور اس کے اتباع پر موقوف ہوتا۔ جا حاصل غایت ہے۔

جن اصحاب کو حضرت والا مجاز بناتے۔ ان کو اس امر کی اطلاع ان کے کسی خط میں تحریر فرما کر دیتے اور یہ بھی لکھ دیتے کہ اس کی اطلاع اپنے خاص خاص احباب سے بھی کر دی جائے۔ تاکہ وہ لوگ مطلع ہو کر ان سے نفع اُٹھا سکیں۔ اکثر اس عنوانات سے اجازت عطا فرماتے کہ:۔

"بے ساختہ یہ قلب میں آیا کہ آپ کو بیعت و تلقین کی اجازت دے دی جائے۔ لہٰذا توکلاً علی اللہ آپ کو اجازت دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نفع کو عام اور تام فرمائے۔ اگر کوئی رجوع کرے تو انکار نہ کریں۔"

اور ان کا پورا نام اور پتہ اپنے پاس بطور یادداشت تحریر فرما لیتے تھے۔ پھر ان کو تنبیہاتِ وصیت کے تمتمات میں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ شائع فرما دیتے تھے۔ تاکہ کوئی غیر مجاز اپنے آپ کو اجازت یافتہ نہ قرار دے سکے۔ ان لوگوں کو دھوکا نہ دے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیدا ہوئی کہ بعض اربابِ غرض نے خود کو حضرت کا مجاز ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیا تھا۔ اسی لیے حضرت فرماتے تھے کہ:۔

"پہلے زمانہ میں نہ اتنے جھوٹے ہوتے تھے۔ نہ ایسے اُمور

میں جھوٹ بولنے کی جرأت ہوتی تھی۔ اس لیے اس وقت اتنی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ اب ضرورت ہے۔ جس کی تصدیق واقعات سے ہوتی ہے۔ نیز اس اشاعت میں یہ بھی مصلحت ہے۔ کہ طالبین کو حضرت اہل اجازت کا علم ہو جائے۔ اور وہ ان سے نفع حاصل کر سکیں"۔

اجازت یافتگان میں جو غیر اہل علم ہوتے تھے۔ ان کو صرف عوام کے لیے اجازت ہوتی تھی کیونکہ اس سے اہل علم کی تسلی ہونا مستبعد تھی اور اس امر کو ظاہر کرنے کے لیے فہرست اجازت یافتگان میں ایسے مجازین کے نام کے آگے لفظ "للعوام" کا اضافہ فرما دیتے تھے۔ البتہ جن بعض غیر اہلِ علم سے بوجہ ان کی خوش فہمی کے یہ توقع ہوتی کہ وہ اہلِ علم کی بھی تسلی کر سکیں گے۔ اور ان سے اہلِ علم کو رجوع کرتے ہوئے استنکاف نہ ہو گا۔ ان کو اجازت عامہ بھی عطا کی جاتی تھی۔ اور فہرست میں ان کے نام کے آگے لفظ "للعوام" نہیں بڑھایا جاتا تھا۔

عملی تربیت

حضرت تھانویؒ ایسے طالبین کو جن سے ابتداً مناسبت ہونے کی توقع نہیں ہوتی تھی۔ یا جو بیعت بلا تعلیم کی شرط کو پورا کر کے صرف بیعت ہونا چاہتے تھے بکثرت اپنے خلفاء و مجازین کے سپرد فرماتے رہتے تھے۔ تاکہ مجازین کو بھی امر تربیت میں ملکۂ تامہ حاصل ہو جائے۔ چنانچہ جب کسی طالب کی کوئی الجھی ہوئی حالت ہوتی۔ تو حضرت والا کے مجازین حضرت سے مشورہ لیتے رہتے۔ اور خود حضرت کو بھی اپنے سپرد کردہ طالبین کے اصلاحی خطوط کو مع اپنے مجازین کے جوابات کے ملاحظہ فرمانے کا اتفاق ہوتا رہتا۔

ان مجازین سے بفضلہ تعالیٰ کثیر مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا رہا۔ اور جو اسی وقت حیات ہیں۔ ان سے ہزاروں لوگ بدستور مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں۔ اور

ان کی تعلیم و تربیت کی برکت سے متعدد طالبین بعد تکمیل انھیں کی طرف سے صاحبِ اجازت بھی ہو گئے۔ جس پر حضرت بڑی مسرت کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ کہ خدا کے فضل سے یہ لوگ بہت سے مشائخ وقت سے زیادہ نفع رساں ہیں اور جن کی بے پروائی اور تاخیر جواب وغیرہ کا حال معلوم ہُوا تو طالبین کو اپنی طرف سے ان کے سپرد فرمانا چھوڑ دیا۔ اور اس کام کی بارہا تاکید فرمائی۔ کہ بہت توجہ اور شفقت کے ساتھ طالبین کی تربیت کرنی چاہیئے۔ اور جو کم توجہی سے کام لیتے تھے۔ ان کی شکایت بھی فرماتے تھے۔ حضرت کے اس دستور العمل سے مجازین کو اسی طرح فائدہ پہنچتا تھا۔ جیسے کسی حکیم کے شاگرد کو اپنے استاد کے مطب میں بیٹھ کر تجربہ حاصل کرنے یا اس کی نگرانی میں مطب کرنے سے فائدہ پہنچتا ہے اور اس سے حضرت کو بھی اطمینان ہو جاتا۔ کہ آئندہ سلسلہ چل سکے گا۔ چنانچہ آپ بمسرت فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"الحمد للہ اب اپنے چند احباب ایسے آگئے ہیں جو بفضلہ تعالیٰ طریق کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں اور اُمید ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ بھی ان کے ذریعہ اشاعت طریق کا سلسلہ جاری رہے گا۔"

یہ تو باقاعدہ اجازت یافتہ حضرات کا حال ہے۔ ویسے بھی حضرت کا ہر تعلیم و تربیت یافتہ کسی شیخ سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے حضرت نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ:۔

"الحمد للہ اس صورت میں جتنے میرے احباب ہیں وہ اکثر ایسے تو ہیں جن پر اطمینان ہے۔ ورنہ اگر میں وسعت کرتا۔ تو ہر قسم کے لوگ بھر جاتے اور غلط مبحث ہو جاتا اب تو الحمد للہ فہم و اہتمام دین کے لحاظ سے میرے قریب قریب سب احباب ہی بفضلہ اس قابل ہیں کہ ان کو اجازت دے

دی جائے۔ لیکن چونکہ کچھ نہ کچھ اجازت بھی بفضلہ کے لیے
مصلحت ہے۔ اس لیے پس و پیش ہے"۔

اخراج مجازین

خلفائے مجازین میں سے جن کے حالات معلوم نہ ہوتے رہتے یا مشتبہ حالات سننے میں آتے۔ حضرت احتیاطاً ان کے نام فہرست مجازین سے خارج فرما دیتے لیکن ان کو اہانت سے بچانے کے لیے ان کے نام شائع نہیں فرماتے تھے بلکہ اخراج کے اعلان کی یہ صورت فرماتے کہ آئندہ جو فہرست مجازین شائع ہوتی۔ اس میں ان کے نام درج نہ کیے جاتے۔ اور صرف ان کے نام درج کیے جاتے۔ جن کی اجازت باقی رکھی جاتی تھی۔ البتہ جو وفات پا جاتے ان کا نام ضرور شائع فرما دیتے تھے۔

اس معاملہ میں کمال احتیاط یہ تھی کہ جن کے نام اختیاراً خارج ہو کر درج فہرست نہ کیے جاتے ان کے متعلق یہ تنبیہہ بڑھا دی جاتی تھی کہ:۔

"بقیہ اوروں کو مجاز نہ سمجھنا ان کی صلاحیت کی نفی نہیں۔ میرے علم صلاحیت کی نفی ہے یعنی ان کے قابل اجازت ہونے کی اب مجھ کو تحقیق نہیں"۔

البتہ اس قاعدہ کے خلاف ایک دفعہ مصلحۃً ایک صاحب کو بذریعہ خط فسخ اجازت اور فسخ بیعت کی اطلاع دے کر اس خط کی نقل تتمہ تنبیہات وصیت میں شائع فرما دی۔ مگر اس کے ساتھ ہی بخیال غایت حدود یہ اطلاع عام بھی بڑھا دی کہ:۔

"مقصود اس سے صرف ان لوگوں کو اطلاع دینا ہے۔ جو محض میری بیعت و اجازت کی بناء پر ان سے رجوع کرتے ہیں۔ اور جن کے رجوع کی یہ بناء نہ ہو۔ وہ میرے مخاطب نہیں۔

ہر شخص کو اپنے دین کا اختیار ہے۔"

غرضیکہ حضرت کے ہاں ہر شے اپنی حد پر تھی۔ کسی بات میں نہ افراط تھی نہ تفریط۔ اور یہی صفتِ اعتدال آج کل عنقا ہے۔

درخشندہ ستارے

حضرت تھانویؒ کے مجازین میں بفضلہ تعالیٰ بڑی بڑی مقدس ہستیاں اور بڑے بڑے صاحبِ احوالِ رفیعہ و مقاماتِ عالیہ اور اہلِ علم و تقویٰ گزر چکے ہیں اور موجود ہیں جو اس وقت ہند و پاکستان اور دیگر ممالک میں نہایت سرگرمی سے طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہیں اور بندگانِ خدا کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ آسمانِ علم و شہرت پر مہر و ماہ کی طرح چمکنے والے حضرت کے بعض نادرۂ روزگار و صاحبِ کمال مجازین و منتسبین کے مختصر احوال درج ذیل ہیں۔

۱۔ علامہ شبّیر احمد عثمانیؒ

شیخ الاسلام۔ صدر انجمن مسلمانانِ عالم و جمیعتہ علماء اسلام۔ شیخ الحدیث شارح مسلم شریف علامہ شبّیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ایسے فاضل اجل اور عالم بے بدل گزر چکے ہیں کہ جن کے تبحّرِ علمی اور سیاست بصیرت کا ایک زمانہ قائل اور معترف ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ بایں علم و فضل اور زہد و تقویٰ اُنھوں نے روحانی تربیت حاصل کرنے کے لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ہی منتخب کیا۔ اور ایک طالب و سالک کی حیثیت سے مدتوں تھانہ بھون حاضری دیتے رہے اور فیضِ باطنی حاصل کرتے رہے جس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے مترجم قرآن مجید پر جس خوبی۔ خوش نمائی، شگفتگی۔ متانت۔ سلاست۔ فصاحت اور بلاغت

کے ساتھ آپ نے حواشی لکھے اور معارفِ قرآنی کو اُردو جامہ پہنایا۔ وہ آپ کا ہی حصّہ تھا۔

بقولِ مورخِ اسلام سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ :۔

"مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب و مقرر تھے۔ عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ قصّے اور لطیفے بھی بیان کرتے تھے۔ جن سے اہلِ محفل کو بڑی دل چسپی ہوتی تھی اور ظریفانہ فقرے اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود نہیں ہنستے تھے۔ مگر دوسروں کو ہنسا دیتے تھے ان کی تقریر میں کافی دلائل ہوتے تھے۔ سیاسی علمی۔ تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ ذہانت وطباعی اور بدیہہ گوئی ان کی تقریروں سے نمایاں ہوتی تھی۔ اکبر کے ظریفانہ اور فلسفیانہ شعر ان کو بہت یاد تھے۔ جن کو وہ اپنی تقریروں میں عمدگی سے کھپاتے تھے۔

مسلم لیگ کی خدمتوں میں ایسے اُلجھتے چلے گئے کہ پھر دوسری طرف ان کو کچھ خیال کا موقع ہی نہ ملا۔ اور آخر ۱۹۴۷ء میں لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ مرحوم بھی کراچی چلے گئے۔ اور وہیں کے ہو گئے۔ مرحوم نے کراچی پہنچ کر گو کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہیں کیا۔ مگر مذہبی معاملات میں ان کی حیثیت مشیرِ خاص کی تھی۔ اس لیے زبانِ خلق نے ان کو شیخ الاسلام کہہ کر پکارا۔ جو اسلامی سلطنتوں میں عموماً قاضی القضاۃ کا لقب ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر اس لقب کی شہرت دولتِ عثمانیہ میں رہی اس حیثیت سے مرحوم پاکستان کی مجلس آئین ساز کے رکن بھی تھے۔ اور اس جماعت کے روحِ رواں بھی۔ جو اس کے آئین کو اسلامی قالب میں ڈھالنا چاہتی تھی۔ اس راہ میں مرحوم کی

ابتدائی کوشش کامیابی کا وہ نتیجہ تھا۔ جس کو پاکستان کی آئینی اصطلاح میں "قرارداد مقاصد" کہتے ہیں۔

مرحوم گو مستقل طور پر پاکستان چلے گئے تھے۔ مگر تعجب ہوگا کہ انھوں نے نہ تو اپنا کوئی خاص گھر بنایا۔ نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا۔ بلکہ بعض عقیدت مند اور اہل ثروت کے مکان میں رہے اور اس مسافرت میں اس مسافر نے اپنی زندگی بسر کر دی۔"

مرحوم کی کوئی ظاہری اولاد نہ تھی۔ لیکن بحمد اللہ کہ انھوں نے اپنی کثیر باطنی اولاد چھوڑی ہے یہ ان کے تلامذہ ہیں۔ جو زیادہ تر دیوبند اور ڈابھیل میں ان کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں۔ وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہوں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مولانا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی اور مولانا محمد یوسف بنوری۔ کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرہ علم ہے۔" (یاد رفتگاں)

۲- مولانا سید سلیمان ندوی رحؒ

سید القلم کے فاضل اجل اور عالم بے بدل ہونے کا بھی زمانہ قائل ہے۔ دنیا انھیں فن تاریخ کا امام وقت سمجھتی ہے۔ کیونکہ وہ سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ تھے۔ عالم۔ فاضل اور مورخ ہونے کے علاوہ آپ مدبر۔ مفکر۔ محقق۔ محدث۔ مبلغ۔ ادیب۔ خطیب۔ فقیہہ اور شاعر بھی تھے۔ رمزی تخلص تھا۔ مولانا شبلی نعمانیؒ کے صرف شاگرد ہی نہیں جانشین بھی تھے۔ جن پر اُستاد کو

کو اتنا ناز تھا کہ وفات سے دو سال قبل ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۱۲ء میں خطبہ پڑھتے ہوئے اپنے اس ہونہار شاگرد رشید کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کہ :۔

"ندوہ نے کیا کیا؟ ایک سلیمان کو پیدا کیا! تو یہی کافی ہے!!"

ہندوستان کی اتنی بڑی تاریخی درس گاہ سے نکلنے والے یگانہ روزگار سید سلیمان ندوی نے ایک ہی جست میں ندوہ سے تھانہ بھون کا فیصلہ طے کیا۔ یہ داستان بڑی بصیرت افروز ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ سیدؔ صاحب :۔

"مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ جب ان میں تصوف وسلوک کا ذوق پیدا ہوا۔ تو پہلے مولانا حسین احمد ہی کے جانب اُن کا میلان ہوا اور ان ہی سے بیعت کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح تشریف فرما ہیں۔ اور اس کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر وہ خود مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہیں یکایک مولانا حسین احمد اپنی جگہ سے اُٹھے اور سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر مولانا اشرف علی رح کے سامنے کر کے فرمایا۔ "ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں"۔ اس خواب کے بعد وہ مولانا تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے"۔ (معارفِ سلیمان صـ ۶۸)

سیدؔ صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت تھانوی کی خدمت میں دسمبر ۱۹۲۹ء میں مندرجہ ذیل تاریخی خط لکھا :۔

"بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن وحوادث سے گھبرا گھبرا اُٹھتا ہے۔ اور بے اختیار کسی سکینت وطمانیت کے مامن کی تلاش ہوتی ہے۔ تو خانقاہ امدادیہ یاد آتی ہے۔ لیکن ڈر تھا کہ معلوم

نہیں کہ اجنبیت و بے گانگی سے میرے متعلق کیا کیا آپ تک پہنچا ہو۔ اور آپ مجھے تخاطب کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں۔

اب اس کشمکش کی منزل میں ہوں۔ جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے۔ دعا کا طالب اور ہمت کا خواستگار ہوں۔" (معارف سلیمان نمبر ص۲۶۷)

دوسرے خط میں سید صاحب نے حضرت کو لکھا کہ:۔

"میرے لیے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمادیں کہ مجھ میں استقامت وثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو۔ فرائض کا پابند ہوں۔ بدعات سے نفور رہوں۔ کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں۔ امام ربانی مجدد الملت ثانی شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور ان کے سلسلہ کے عقیدت تامہ ہے۔ خرافات و طاعاتِ صوفیہ کا منکر ہوں۔" (ایضاً نمبر ص۲۸۸)

اسی طرح سید صاحب نے اپنی دینی عظمت اور جلالت کا لحاظ کیے بغیر آستانۂ اشرفیہ پر جاکر اپنا سر نیاز جھکا دیا۔ علم و فن کا یہ شہباز بلا اطلاع۔ بے وقت دربار اشرفیہ میں پہنچا۔ سید صاحب کی آمد کی مسرت سے ضابطوں کے بادشاہ اپنے ضابطوں سے انھیں مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فوراً زنانخانہ سے باہر تشریف لائے۔ پھر کیا ہوا۔ اس کی تفصیل خود حضرت تھانوی کے مندرجہ ذیل گرامی نامہ سے پڑھ لیجئے جو آپ نے اس ملاقات کی نسبت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھا:۔

"مولانا سید سلیمان ندوی صاحب وقعتہً تشریف لے آئے۔ مَیں مکان پر تھا۔ سنتے ہی حاضر ہوا۔ میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل و عریض تھا۔ ملا تو معتدل الخلقت پاکر قلب کو بہت اُنس ہوا۔ پھر ملاقات و مکالمت سے ان کی تواضع وسادگی و رعایت جلیس دیکھ کر تو مسخر ہو گیا۔ گیارہ بجے تشریف لائے۔ تین بجے

واپس تشریف لے گئے۔ مجلس میں بہت دیر تک ثناء خوانی کرتا رہا۔"
(حکیم الامت ص۴۳۸)

بس اس "مسخر ہونے" نے اس شہباز کو مسخر کر دیا۔ وہاں کے "حال" کا اس "مردِ قال" پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی ان تمام پرانی تحریروں پر نظرِ ثانی کی۔ جن میں ذرا بھی جمہورِ امت سے اختلاف کا شائبہ یا احتیاط کے خلاف کوئی بات نظر آئی۔ اور اس طرح اپنے ہم مکتبوں۔ ہم مشربوں اور ہم عصروں کو یہ آخری عملی نصیحت فرمائی کہ :-

قال را بگذار مردِ حال شو

اہلِ ندوہ نے شاہ سلیمان کا تختِ سلیمانی سے اُتر کر دربارِ اشرفیہ کے خدام میں شامل ہونے کو اپنی توہین پر محمول کیا۔ مگر سید صاحب نے انھیں اپنے عملی استحکام سے یہ نکتہ سمجھایا کہ ؎

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہے اسے اک دن نذرِ مئے میخانہ

بعض کو یہ جواب دیا کہ :-

"جن کمالات کی بناء پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا۔ انہی کمالات نے مجھ کو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا۔ میں نے اپنے انجام کی فکر کر لی۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کر لیں۔" (معارف سید سلیمان نمبر ص۲۹۴)

کبھی ان کے شور و غوغا پر یوں شکوہ کیا کہ :-

"یہ لوگ مجھ کو زبان سے تو فاضل اور محقق کہتے ہیں۔ مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں۔ آخر اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے کہ ان کے خیال کے مطابق اگر واقعی محقق اور علامہ دہر ہوں۔ تو کیا بلاوجہ میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما۔ ان لوگوں کو

سمجھنا چاہیئے کہ میں نے اپنے اندر کوئی تو کمی پائی۔ جس کی تکمیل
کے لیے وہاں گیا۔" (معارف سید سلیمان نمبر ۶۹)

غرضیکہ یہ وہ حالات تھے۔ جن میں سے سید صاحب بادۂ طریقت سے سرشار ہوئے اور زیادہ وقت علمی مذاکروں کی بجائے رشد و ہدایت میں صرف کرنے لگے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اربابِ حکومت کو اس بورڈ کی صدارت کے لیے جو دستوری سفارشات کو اصول اور حدودِ شرع میں باقی رکھنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ایک ماہر عالم کی ضرورت تھی۔ ان کی نظر انتخاب سید صاحب پر پڑی اور انھیں خاص آدمی بھیج کر بہ منت پاکستان بلوایا۔ سید صاحب محض اپنے شیخ کے مطابق قائم ہونے والی اسلامی مملکت کی خدمت کے جذبہ سے اپنی معیاری رہائش اور وسیع ذرائع آمدنی چھوڑ کر کراچی ایسے گراں شہر میں بمعہ اہل و عیال تشریف لائے۔ مالی پریشانیوں کے باوجود آپ نے عالمانہ وقار اور اشرفی استغنا کو قائم رکھتے ہوئے بڑے توکل و تحمل سے زندگی کے آخری ایام مسافرانہ اور درویشانہ شان میں یہیں گزار دیئے۔

قیامِ پاکستان کے دوران میں

۱۔ آپ نے سب سے پہلے دسمبر ۱۹۵۰ء میں مختلف فرقوں کے ۳۱ علماء کے اجتماع کی صدارت و رہبری فرمائی۔ اور تین چار دن کے اندر ایک ایسا دستوری خاکہ بنا کر پیش کیا کہ اربابِ حکومت حیران رہ گئے۔ اور حضرت کی خدمت میں مبارک بادی کے خطوط اور برقیئے بھیجے۔ جس کی وجہ سے حکومت کی پیش کردہ رپورٹ نابود ہو گئی۔

۲۔ آپ نے ہر جگہ اس بات پر زور دیا کہ تن تنہا دستور سے کوئی مملکت "اسلامی مملکت" نہیں بن سکتی ہے۔ اور نہ اس میں انقلابی شان پیدا ہو سکتی ہے۔ تاوقتیکہ ملک میں اسلامی قانون رائج نہ ہو۔ اور یہی بات آپ نے قائد ملت لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کے ذہن میں اس خوبی سے بٹھائی

کہ بالآخر انھیں ایک کمشن مقرر کرنا پڑا۔ تاکہ وہ مروجہ قوانین پر نظر ثانی کر کے ان کو اسلامی قانون کے حصار میں لے آئے۔ اس کمشن کے صرف تین ارکان تھے۔ جسٹس رشید، جسٹس میمن اور علامہ سید سلیمان ندوی بعد میں سید صاحب کی تحریک پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا تھا۔ کیونکہ آپ اسلامی آئین کے سلسلہ میں تنہا ذمہ داری نہ لینا چاہتے تھے۔

۳۔ رئیس الخلفاء دربار اشرفیہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ کے اصرار پر جبکہ دستوری سفارشات از سر نو مرتب ہو رہی تھیں۔ بورڈ تعلیماتِ اسلامی مجلس دستور ساز پاکستان میں بھی اپریل ۱۹۵۲ء میں شرکت فرمائی تھی۔

۴۔ قائد اعظم کی یادگار میں جو دار العلوم تعمیر ہونا تھا۔ اس کی انتظامیہ کمیٹی کا بھی آپ کو رکن بنایا گیا تھا۔ جس نے اس کے لیے جگہ اور نصاب کا انتخاب کرنا تھا۔ آپ کی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (جو اس کمیٹی کے بھی رکن تھے) کی کوشش سے ہی اس کی تعمیر کے لیے ملتان کو منتخب کیا گیا۔ جو کسی زمانہ میں علوم و معارف کا گہوارہ تھا۔

اور بالآخر وہ اسی سرزمین میں ابدی نیند سو گئے۔

۲۔ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح کے شاگرد رشید حضرت تھانوی کے خلیفہ ارشد۔ مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ، ان علماء ربانی میں سے ہیں۔ جنھوں نے لیگ کی اس وقت پشت پناہی کی جبکہ جمیعتہ العلماء ہند۔ احرار۔ نیشنلسٹ کانگرس کے جھنڈے تلے اس کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے۔ سارا دیوبند ایک طرف اور مفتیٔ دیوبند ایک طرف۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مفتی محمد شفیع صاحب نے ملک کے طول و عرض میں طوفانی دورے کر کے لیگ کے حق میں رائے عامہ کو اس طرح بیدار

کیا کہ مخالف کیمپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔

پاکستان بننے کے بعد آپ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ، کے اصرار پر اپنا کتب خانہ اور کاروبار ہندوستان میں چھوڑ کر کراچی آ گئے۔ چونکہ اس وقت زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جن کی معیت میں یہ جنگِ پاکستان لڑ چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے آپ کی آمدِ پاکستان کا دلی خیر مقدم کیا۔ اور آپ کے تبحرِ علمی اور فقہی بصیرت سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپ کو مجلس دستور ساز پاکستان کے قائم کردہ بورڈ تعلیماتِ اسلامیہ کا رکن بنا دیا گیا۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی کی تحریک پر موجودہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے والے کمشن میں بھی آپ کو شامل کر لیا گیا۔ جس کے دوسرے ارکان خود سیّد صاحب۔ جسٹس رشید اور جسٹس میمن تھے۔ علاوہ ازیں قائد اعظم کے یادگاری دار العلوم کی تعمیر اور اس کا نصاب مقرر کرنے والی کمیٹیوں میں بھی آپ کو شامل کیا گیا۔

عین اس وقت جبکہ یہ نعرہ لگایا جا رہا تھا کہ قرآن کے اندر اسلامی دستور ثابت کرنے والے کو ہزاروں روپیہ انعام دیا جائے گا۔ آپ نے شب و روز محنت کر کے دستورِ قرآنی کا خاکہ تیار کیا۔ دستوریہ کے ایک ایک ذمہ دار رکن کے پاس پہنچے۔ انھیں ایک ایک بات اور نکتہ سمجھایا۔ اور ان کے ذہنوں کو اسلامی آئین بنانے اور قبول کرنے کے لیے اس طرح تیار کیا کہ خود قرآنی آئین کے منکر مسٹر بروہی نے کتاب و سنت کے مطابق مرتب کردہ اسلامی آئین کی ایک ایک دفعہ ایوان دستوریہ میں پیش کر کے منظور کرائی۔ اور ان کے حق میں بعض ممبران دستوریہ نے ایسی اسلام آموز اور ایمان افروز تقریریں کیں کہ دستوریہ کے ہندو ممبران چیخ اٹھے کہ ہم یہاں اسلام پر لیکچر سننے نہیں آئے۔ اس تمام تیاری اور کامیاب جدوجہد کا سہرا مفتیٔ اعظم پاکستان کے سر ہے۔ جو پس پردہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے شیخ کے مذاق کے مطابق ارکانِ دستوریہ کو تبلیغ و تلقین میں مصروف رہے۔

۴۔ مولانا ظفر احمد عثمانی

حضرت تھانوی کے خواہرزادہ اور تربیت یافتہ۔ سابق صدر شعبۂ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی۔ حال شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو اللہ یار ضلع حیدر آباد سندھ ان علماء مشاہیر میں سے ہیں جنھوں نے جنگ پاکستان میں بالعموم اور سلہٹ کے ریفرنڈم میں بالخصوص بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ ریفرنڈم کے دوران میں جہاں مولانا شبیر احمد عثمانی صوبہ سرحد میں مصروف جہاد تھے وہاں مولانا ظفر احمد صاحب سلہٹ میں مصروف عمل تھے۔ کیونکہ ان دونوں محاذوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر قائد اعظم نے ان کی کمان علی الترتیب ان کے سپرد کر رکھی تھی۔

مولانا ظفر احمد عثمانی جس وقت سلہٹ پہنچے۔ اس وقت جمیعتہ العلماء ہند کے ارکان میدان پر چھا چکے تھے۔ پاکستان کی مخالفت میں در و دیوار پر ان کے اشتہار چسپاں ہو چکے تھے مگر ان کے وہاں پہنچ کر صرف چار تقریریں کرنے سے ہوا کا رُخ بدل گیا۔ مخالفین نے نہ صرف پاکستان کی مخالفت ترک کر دی۔ بلکہ حامیانِ پاکستان سے اتحاد کر لیا۔ جس سے ہندوؤں کو سخت صدمہ پہنچا۔ اور اُنھوں نے ریفرنڈم کے دوران میں بڑی گڑبڑ کی۔ یہاں تک کہ کئی ہندو آفیسر اور ہندو عورتیں گرفتار کر لی گئیں۔ مگر ان ریشہ دوانیوں کے باوجود ریفرنڈم کا نتیجہ پاکستان کے حق میں رہا۔

حضرت تھانوی کی طرح مولانا ظفر احمد عثمانی بھی قائد اعظم کو تبلیغی خطوط لکھتے رہتے تھے جن کا باقاعدہ انگریزی ترجمہ ساتھ بھیجا جاتا تھا۔ تاکہ ان کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ پاکستان بننے کے بعد جب سکہ اور ٹکٹ وغیرہ بنانے کا سوال پیدا ہوا۔ تو بعض نافہموں نے ان پر قائد اعظم کی تصویر چھاپنے کی تجویز پیش کی جسے قائد اعظم سے عقیدت کی وجہ سے منظور کیا جا رہا تھا۔ کہ ہماری

تحریک پر مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب۔ مولانا ظفر احمد عثمانی۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ دیوبندی نے ارباب اختیار کو اس مسئلہ کے شرعی پہلو کی طرف توجہ دلائی۔ اور انھیں اس خلاف شرع فعل سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

پاکستان بننے کے بعد آپ بھی اپنے دوسرے مذکور الصدر رفقاء کے ساتھ دستور اسلامی کی تاسیس و ترویج کے سلسلہ میں کوشاں رہے۔ اور بعض امور میں ارباب اختیار و اقتدار ان سے صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ بلکہ مشرقی پاکستان کے انتخاب کے سلسلہ میں ان کی خصوصی طور پر امداد حاصل کی گئی۔ اور خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کی زیرِ سرکردگی ۱۹۴۹ء میں جو وفد حجاز گیا تھا۔ اس کا بھی انھیں رکن بنایا گیا تھا۔

غرضیکہ دربارِ اشرفیہ کے ان چاروں مایہ ناز اور ممتاز سفیروں نے عین اس وقت جبکہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی بنیاد قائم کی جا رہی تھی۔ اور اربابِ اختیار و اقتدار کو قدم قدم پر علماء حق کی امداد کی ضرورت لاحق ہو رہی تھی۔ ذاتی اغراض و اقتدار کے لیے نہیں۔ بلکہ ذاتی نقصان اٹھا کر محض خدمتِ خلق و پاکستان کے لیے خلوت سے جلوت میں آ کر اربابِ اختیار و اقتدار کی رہنمائی کی اور اپنے عالمانہ وقار اور درویشانہ استغنا کو بھی ٹھیس نہ لگنے دی۔

مولانا مفتی محمد حسن امرتسری

قطبِ زماں۔ شیخ دوراں۔ رئیس الخلفاء دربارِ اشرفیہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری مہتمم جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور و صدر جمیعۃ علماء اسلام ان نفوسِ قدسیہ میں سے ہیں۔ جو نظامِ تکوینی کے سلسلہ میں مامور من اللہ ہوتے ہیں۔

دربارِ اشرفیہ کے اسرار و رموز اور علوم و معارف جاننے والے اس محقق عالم اور مردِ درویش کا دربار، دربارِ اشرفیہ کا ہی نمونہ پیش کرتا ہے۔ جس میں بڑے بڑے باجبروت اور جلیل القدر اربابِ اختیار و اقتدار کو دست بستہ کھڑے دیکھا۔

ان کا جلال و جمال۔ ان کا حال و قال۔ ان کا زہد و اتقاء۔ ان کا صبر و استقلال

ان کا علم وفضل ان کی جذب و تاثیر اور شانِ استغناء حضرت تھانویؒ کی یاد دلوں میں تازہ کر دیتی ہے۔ اور بڑے بڑے نکتہ چینوں اور نقادوں سے اعتراف کرا لیتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے سفرنامہ پاکستان میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت تھانوی کی وفات کے بعد سے بڑی تمنا تھی کہ ان کا کوئی صحیح اور سچا جانشین دیکھنے میں آئے۔ آنکھیں مدت سے اس کے لیے ترستی ہوئی تھیں۔ ذکر متعدد ثقہ لوگوں سے سننے میں آیا تھا کہ اس صفت کے ایک بزرگ لاہور میں ہیں مولانا محمد احسن امرتسری ثم لاہوری جو مسجد نیلا گنبد کے متصل مدرسہ اشرفیہ میں رہتے ہیں۔ اپنے مرشد کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں۔

جذبۂ اشتیاق سب سے پہلے انھیں کی خدمت میں لے گیا۔ کہنا چاہیئے کہ مقام لاہور کے اہم ترین مقصدوں میں ایک مقصد یہی تھا۔ بعد عصر حاضری ہوئی۔ اور دیر تک حکمت ومعرفت کے کلمات اور اچھی اچھی باتیں سننے میں آتی رہیں۔ بزرگی صورت سے ظاہر ہے۔ اور تواضع وحسن اخلاق تو شاید ان کا حصہ ہے۔

باربار اٹھنا چاہا۔ لیکن مولانا کی شفقت نے اٹھنے نہ دیا۔ اور چائے اور ناشتہ سے خوب رہیں۔"

(صدق جدید ۲۷ مئی ۵۵ء صہ)

یہ صحیح اور سچے جانشین انھیں کے تھے۔ جن کے متعلق مولانا عبدالماجد صاحب کا ارشاد ہے کہ:۔

"مولانا کی ذات خود دینی حیثیت سے عجب ذات تھی۔ کوئی صرف فقیہہ ہوتا ہے اور طریقت سے کورا۔ کوئی محض صوفی

ہوتا ہے اور کلام کے مباحث سے نا آشنا۔ یہ حضرت ایک ہی وقت میں صوفی و محقق بھی تھے اور متکلم بے بدل بھی۔ رومیٔ عصر بھی اور رازیٔ وقت بھی۔ فقہ۔ اصولِ فقہ۔ تفسیر۔ حدیث و تصوّف کے علاوہ کلام قدیمی و جدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں و اعظوں میں برابر بیان ہوتے رہتے ہیں۔ اور ہم جیسے کتنے بے مایہ اور کم مایہ یہیں سے خوشہ چینی کر کر کے اپنی بات بناتے اور اپنی دکان چمکاتے ہیں۔"

(حکیم الامت صـ۶۴)

حضرت تھانوی رح کے اس آئینۂ صفات میں ان کے "صحیح اور سچے جانشین" کے "خط و خال" کتنے نمایاں ہو گئے ہیں۔

۶۔ مولانا عبدالباری ندوی

ندوۃ العلماء لکھنؤ نے عصر جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے یوں تو ایسے بڑے بڑے عالم فاضل۔ مفکّر اور مدبّر پیدا کیے۔ جنھوں نے علمی اور تحقیقی میدان میں قابلِ فخر کارہائے نمایاں دکھائے مگر وہ ایسے اہلِ نظر صرف تین ہی پیدا کر سکا۔ جنھوں نے اپنی بصیرت سے دورِ حاضر کے مجدّد کو پہچانا اور اس کی تعلیم و تربیت سے فیض پایا۔ ان میں سے ایک مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ جو فنا فی الشیخ کے مقام پر پہنچنے کے باوجود آخیر وقت تک ندویانہ خصوصیات کے بھی حامل رہے۔ دوسرے دار المصنفین اعظم گڑھ کے رکن مولانا عبدالباری صاحب ندوی سابق استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ہیں۔ مولانا عبدالباری صاحب ندوی سابق فنا فی الشیخ ایسے ہوئے کہ اپنی ندویت کو بھی بھلا بیٹھے۔ ان پر حضرت کا رنگ اتنا غالب ہے کہ ہر بات ان کے ہی انداز کی کہتے ہیں۔ اور ہر چیز ان کی ہی پسند کی چاہتے

ہیں اور شب و روز حضرت تھانوی کی تعلیمات و تجدیدات کی تہذیب و تسہیل اور ان کی اشاعت کثیر کی فکر میں رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں چار نادر کتابیں:
۱۔ جامع المجددین ۲۔ تجدید سلوک و تصوّف ۳۔ تجدید تعلیم و تبلیغ ۴۔ تجدید معاشیات کے نام سے ایسی مرتب فرمائیں کہ نو تعلیم یافتہ طبقہ کو پہلی دفعہ حضرت کی تجدیدات سے مستفید و مستفیض ہونے کا موقع ملا۔

۷۔ مولانا شبیر علی تھانوی

حضرت تھانوی کی اپنی تو کوئی اولاد نہ تھی۔ انھوں نے مولانا شبیر علی صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب سے یہ فرما کر لے لیا تھا کہ:-

"میری کوئی اولاد نہیں ہے لہذا شبیر کو مجھے دے دو۔ میں اس کو اپنی اولاد کی طرح رکھوں گا۔"

مولانا شبیر علی لکھتے ہیں کہ:-

"اگر حضرت کی صلبی اولاد ہوتی۔ تو شاید اتنے ناز حضرت ان کے بھی نہ اٹھاتے۔ جتنے اس خادم کے اٹھائے ہیں اور حقیقت ہے کہ حضرت کی شفقتوں کے سامنے میں اپنے والدین کی شفقتوں کو بھی بھول گیا۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آخر وقت تک حضرت ہی کی جوتیوں میں میری عمر گزری۔" (خاتمہ السوانح صـ ۱۴۸)

دوسرے حضرات نے تو حضرت تھانوی سے باطنی تربیت حاصل کی۔ مگر مولانا شبیر علی صاحب نے حضرت کے طبعی رجحان سے فائدہ اٹھایا۔ چونکہ خانقاہ امدادیہ کے تمام انتظامی امور انھی کے سپرد تھے۔ اس لیے انھیں انتظامی امور میں ہر وقت حضرت کی رہنمائی حاصل رہی۔

علاوہ ازیں سب سے زیادہ اور اہم اعزاز انھیں "سفیرِ اشرف" حاصل رہا۔ کیونکہ حضرت تھانوی اکثر انھیں ہی قائدِ اعظم کی خدمت میں بغرض تبلیغ و ارشاد بھیجا کرتے تھے اور انھوں نے قائدِ اعظم کو پابندِ نماز بنانے اور حضرت تھانوی کے قریب لانے میں بڑے تاریخی کارنامے سرانجام دیئے۔ جن کی تفصیل "تعمیرِ پاکستان اور علماء ربانی" کے تیسرے باب "تدینِ قائدِ اعظم" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

پاکستان تشریف لانے کے بعد انھوں نے کچھ عملی کام کرنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر انھیں کوئی اپنا ہم خیال رفیق نہ مل سکا۔ انھوں نے اس غرض کے لیے علماء کرام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی انتھک کوشش کی۔ مگر اربابِ غرض اور طالبِ جاہ حضرات کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور آخر کار وہ مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔

پاکستان تشریف لانے کے بعد انھوں نے پاکستان آکر مایوس ہونے والوں کے خواب کی تعبیر کی کہ،

> "ہندوستان سے پاکستان آنے والے قریباً ہر شخص نے یہی سمجھ لیا تھا کہ وہاں من و سلویٰ اتر رہا ہے۔ جاتے ہی پکی پکائی مل جائے گی۔ اور خوب مزے سے گزرے گی۔ اگر اس کی بجائے وہ یہ خیال کرتے کہ وہاں جا کر صرف اپنے لیے ہی جہد للبقا نہیں کرنی۔ بلکہ ایک نوزائیدہ سلطنت کے استحکام میں بھی معاون ہوتا ہے۔ تو انھیں ہرگز مایوس نہ ہونا پڑتا۔"

۸۔ مولانا قاری محمد طیب دیوبندی

نمونۂ سلف۔ یادگارِ قاسمؒ۔ فاضل اجل۔ مخزنِ علم مولانا قاری محمد طیب

صاحب مدظلہ مہتمم دار العلوم دیو بند کو شرف بیعت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہے۔ علمی استفاضہ آپ نے علامہ جلیل مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ۔ فخر العلماء مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اور دیگر مشاہیر سے کیا۔ مگر روحانی دولت اور منصب خلافت حضرت تھانویؒ سے پایا۔

آپ دار العلوم دیو بند کے طالب علم بھی ہیں اور مہتمم بھی۔ اسی چشمہ فیض کے فیض یافتہ بھی ہیں اور فیض رساں بھی۔ عالم و فاضل بھی ہیں اور پیر طریقت بھی۔ علم و عرفان کے دریا بھی ہیں۔ اور تحریر و تقریر کے دھنی بھی۔ نظم و نسق کے ماہر بھی ہیں۔ اور طی الارض کے مشاق بھی۔ کہ اکثر سفر میں رہتے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو۔ جہاں آپ نے پہنچ کر خدا اور رسولؐ کا پیغام نہ سنایا ہو یا جہاں آپ کی تصنیفات و تالیفات نہ پہنچی ہوں۔

جمیعتہ العلماء ہند کے روحِ رواں زیادہ تر اکابر دیو بند ہی تھے۔ مگر مشاہیر دیو بند سے ہونے کے باوجود آپ سیاسی مد و جزر سے کبھی اثر پذیر نہیں ہوئے اور نہ اپنے دامن کو موجودہ سیاست کی نجاست سے آلودہ ہونے دیا۔ بلکہ اپنے پیر و مرشد حضرت تھانوی کے مسلک کے مطابق سیاست کو بذیل دین ہی لانے کو اسلم سمجھا۔ آپ کی شخصیت دین کی اہم ترین ضروریات اور مسلمانوں کے دینی حوائج کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

مولانا خیر محمد صاحب جالندھری

فخر الاماثل۔ خیر مجسم حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مہتمم مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان حضرت تھانوی کے محبوب خلفاء میں سے تھے۔ تقسیم ہند سے قبل ان کا جالندھر میں رشد و ہدایت اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے سرزمین ملتان کو اس چشمہ فیض کے لیے منتخب فرمایا۔ جو کسی زمانہ میں

علماء و اولیاء کا مرکز اور علوم و معارف کا سرچشمہ تھی۔

بے سروسامانی کے عالم میں ملتان پہنچتے ہی آپ نے بلا تاخیر محض توکلاً علی اللہ وہی چشمۂ خیر جاری کر دیا۔ جس سے ہزاروں طالبانِ علم اور تشنگانِ طریقت مستفید و مستفیض ہونے لگے۔ جس سے اربابِ بدعات کے حلقوں میں ایک سراسیمگی سی پھیل گئی۔ اور باطل کی تمام قوتیں اس خیرِ مجسم کے مقابلہ میں آگئیں اور اس چشمۂ فیض کو بند کرانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگیں۔ مگر خیر کے مقابلہ میں شر کب کامیاب ہُوا تھا: جو اس دفعہ ہو جاتا۔

حاسدین و معاندین نے مدرسہ کو نقصان پہنچانے اور اہلِ مدرسہ کو بدنام کرنے کے لیے یہ مشہور کر دیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب کا تعلق جماعت احرار سے ہے۔ جو نظریۂ پاکستان کی مخالف تھی۔ اور انہی لوگوں نے مدرسہ کی شکل میں یہاں اپنا خفیہ اڈہ قائم کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے اپنے ہم مشرب و ہم مسلک اربابِ مسلم لیگ کی مدد سے مدرسہ کی عمارت خالی کرانے اور مولانا موصوف کو شہر بدر کرانے کی مہم بھی شروع کر دی۔ حالانکہ یہ الزامات قطعاً بے بنیاد ہیں۔ مولانا خیر محمد صاحب اپنے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی طرح کانگرس کے مخالف اور مسلم لیگ کے حامی تھے۔ ۱۳۶۴ھ میں اراکین مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے استفتار کے جواب میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دیو بند نے کانگرس کی مخالفت اور مسلم لیگ میں شرکت کے متعلق جو تاریخی شرعی فتویٰ وقایۃ المسلمین ولایۃ المشرکین نامی رسالہ نومبر ۴۵ء میں شائع کیا تھا۔ اور جو کانگرس کے لیے ایٹم بم ثابت ہُوا تھا۔ اس پر علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔ مولانا جمیل احمد تھانوی۔ مولانا شبیر علی تھانوی کے علاوہ مولانا خیر محمد جالندھری کی بھی تصدیق ثبت تھی۔ اتفاق سے وہ رسالہ ہماری لائبریری میں محفوظ تھا۔ چنانچہ وہی رسالہ اربابِ اختیار و اقتدار کو دکھلا کر ان کے ڈھول کا پول کھول دیا۔ جس سے ان کی تمام اُمید پر اوس

پڑگئی ۔ اس کے باوجود وہ مدرسہ کو نقصان پہنچانے سے باز نہ آئے ۔ مگر بفضلہٖ تعالیٰ نتیجہ ہمیشہ ان کے مخالف ہی رہا۔ جو ثمرہ ہے مولانا خیر محمد صاحب کی للّٰہیت اور خلوص کا۔

آپ کے چہرہ کی نورانیت ۔ بشرہ کی شگفتگی ۔ نظروں کی شفقت ۔ لبوں کی مسکراہٹ اور اخلاق کی وسعت اشرف جمال کی زندہ تصویر ہے ۔ اس پیرانہ سالی میں خرابیٔ صحت کے باوجود آپ کو خیر المدارس ایسے وسیع تعلیمی ادارہ کی انتظامی مشغولیتیں ۔ درس و تدریس کی مصروفیتیں اور طویل تبلیغی سفروں کی صعوبتیں برداشت کرتے دیکھ کر ان کے متعلق حضرت تھانوی کے اس ارشاد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ " انجن تو چھوٹا سا ہے ۔ مگر گاڑیاں بہت سی کھینچے لا رہا ہے "۔

۱۰۔ مولانا عبد الماجد دریابادی

حضرت مولانا دریابادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ۔ شروع شروع میں وادیٔ الحاد میں بھٹکتے رہے ۔ کفر کی ڈگری حاصل کی ۔ ہوش آئی تو " سچ " نگار بن بیٹھے ۔ مدتوں " خلافت " کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے ۔ جب اسے بچانے میں ناکام رہے تو اپنے " بچاؤ " کی فکر ہوئی ۔ باطنی اصلاح اور روحانی ترقی کے لیے اپنا ہاتھ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ہاتھ میں دے دیا ۔ ایک ایسے فلسفی کو جو ہر چیز کو اپنی عینک سے دیکھنے کا عادی ہو ایک جگہ کبھی اطمینان حاصل نہیں ہوتا ۔ مولانا دریابادی نے تعلقات طریقت تو مولانا مدنی سے قائم رکھے مگر عقیدت حضرت تھانوی سے بڑھا لی ۔ سب کچھ دیکھنے جانچنے تولنے اور صحیح و درست پانے کے باوجود کسی نہ کسی وقت آپ نے حضرت سے اختلاف بھی کیا ۔ اور عادتاً بے باکانہ کیا ۔ لیکن بایں ہمہ حضرت تھانوی نے ان سے جو شفقت آمیز سلوک کیا ۔ اور جس محبت سے پیش آتے رہے ۔ وہ صرف مولانا دریابادی کا ہی حصّہ تھا ۔ یہ حضرت تھانوی

کی ہی توجہات وعنایات کا فیض ہے کہ کفر کا ڈگری یافتہ دربارِ اشرفیہ سے مفسرِ قرآن بن کر نکلا۔ اور مفسر بھی ایسا کہ جس نے اپنے قلم حقیقت رقم سے معارفِ قرآنی کے انمول موتی نہایت سلیس۔ شگفتہ۔ دل کش مگر ادیبانہ انداز میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دیے۔ جنھیں دیکھ کر اربابِ نظر بے ساختہ پکار اُٹھے کہ اُنھوں نے قرآن پاک کی جو تفسیر لکھی ہے اس کی تمام تفسیری ذخیرہ کی موجودگی کے باوجود بھی اشد ضرورت تھی۔

ان کی بے مثل ذہانت۔ بے مثل تحریر۔ بے مثل طنز۔ بے مثل مزاح۔ بے مثل حق گوئی اور خوب گوئی ایسی نہیں کہ کوئی منصف مزاج اس کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل کرے۔ البتہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اربابِ علم وفضل بھی ہوش کے عالم میں نہیں جوش کے عالم میں ان سے برافروختہ رہتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان اُمور کو جو مابہ النزاع ہیں۔ خواہشات وجذبات کی کسوٹی پر نہیں۔ اصول و دیانت کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور منصف مزاجی سے کام لیا جائے۔ تو کوئی گنجائشِ اعتراض ہی باقی نہیں رہتی۔

فہرست مجازین

دربارِ اشرفیہ کی طرف سے مجازینِ بیعت اور مجازین صحبت کی جو آخری فہرست شائع ہوئی۔ اس کا مفصل ذکر خاتمۃ السوانح میں موجود ہے مگر ان میں سے بعض وفات پا گئے ہیں۔ بعض نقل مکانی کر کے دوسرے مقامات پر چلے گئے ہیں۔ اس لیے خاتمۃ السوانح میں شائع شدہ فہرست کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل فہرست مجازین مرتب کی گئی ہے۔ اور اس کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۱۔ جلد آشیاں مجازین

۲۔ فیض رساں مجازین

جو حضرات اس وقت (جون ۱۹۵۶ء میں) چشمۂ فیض اشرفیہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور جن کے جدید پتے معلوم ہو سکے ہیں۔ ان کے جدید پتے

درج کردیئے گئے ہیں۔ اور جن کے جدید پتے معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کے پرانے پتے ہی رہنے دیئے ہیں۔ جو حضرات ممنوع الاجازت قرار دیئے گئے ہیں۔ وہ اس میں شامل نہیں کیے گئے۔ لہذا اس فہرست میں درج شدہ حضرات کے علاوہ اگر کوئی شخص خود کو حضرت کا مجاز ظاہر کرے تو اس کا دعویٰ غلط تصور کیا جاوے۔

خلد آشیاں مجازین

جون ۱۹۵۵ء تک جو مجازین بیعت عالمِ بقا میں حضرت تھانوی کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

۱۔ مولوی محمد عیسیٰ صاحب محی الدین پوری پروفیسر عربی محلہ محتشم گنج الہ آباد۔

۲۔ مولوی عبد العلیم صاحب پنڈیرہ ڈاک خانہ بڑا شام بازار۔ ضلع بردوان۔

۳۔ مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری۔ محلہ کرم علی۔ میرٹھ شہر۔

۴۔ مولوی عبد المجید صاحب بچھرایونی۔ خانیوال۔

۵۔ خواجہ عزیز الحسن صاحب انسپکٹر مدارس لکھنؤ

۶۔ مولوی محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ عالیہ ڈھاکہ

۷۔ حاجی شمشاد علی صاحب کلانوری اشرف المطابع۔ تھانہ بھون۔

۸۔ محمد عبد اللہ خاں صاحب بیرون امالی دروازہ۔ ریاست بھوپال

۹۔ مولوی رفیع الدین صاحب محلہ سبزی منڈی متصل مسجد سوداگر۔ الہ آباد

۱۰۔ منشی حقداد خاں صاحب پنشنر محلہ مولوی گنج۔ لکھنؤ شہر۔

۱۱۔ مولوی ولی احمد صاحب۔ قصبہ برہان پور۔ ضلع کیمبلپور

۱۲۔ حکیم کرم حسین صاحب سیتاپور۔ اودھ۔

۱۳۔ محمد عثمان خان صاحب تاجر کتب متصل جامع مسجد دہلی۔
۱۴۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب چاندپور ضلع بجنور۔
۱۵۔ حکیم عبد الخالق صاحب ساکن ٹانڈہ چوک فرید امرتسر
۱۶۔ ماسٹر ثامن علی صاحب سندیلوی گورنمنٹ ہائی سکول کانپور
۱۷۔ مولوی عبد الودود صاحب آخون زادہ ۔ دوبیاں ۔ پوسٹ کالو خان پشاور
۱۸۔ حافظ ولی محمد صاحب محلہ کاغذیاں ۔ قنوج ۔ ضلع فرخ آباد
۱۹۔ حکیم خلیل احمد صاحب کھالہ پار محلہ پل حمران سہارنپور
۲۰۔ مولوی احمد علی صاحب کافل
۲۱۔ مولوی محمد صاحب چاٹگام
۲۲۔ مولوی نور حسین صاحب اڈرانہ ضلع جہلم
۲۳۔ مولوی عبید الحق صاحب موہن پور
۲۴۔ حکیم محمد یوسف صاحب بجنور
۲۵۔ حکیم نور احمد صاحب کانپور
۲۶۔ مولوی عبد الرحمٰن صاحب بکھرا
۲۷۔ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب اعظم گڑھ
۲۸۔ منشی محمد سلطان صاحب مدراس
۲۹۔ حاجی محمد مصطفیٰ صاحب ۔ خورجہ
۳۰۔ مولوی محمد عیسیٰ صاحب بنارس
۳۱۔ مولوی شاہ لطف رسول صاحب فتح پور ضلع بارہ بنکی
۳۲۔ حافظ محمد عمر صاحب نہٹوری ۔ مقیم علی گڑھ
۳۳۔ شیخ معشوق علی صاحب قنوجی
۳۴۔ مولوی محمد صادق صاحب مالی گاؤں ۔ ضلع ناسک
۳۵۔ صوفی رحیم بخش صاحب مقیم دہلی

۳۶- مولوی عبد الحی صاحب سہارنپوری مقیم حیدر آباد

۳۷- خیرات احمد خاں صاحب - سوندھیا ضلع گیا

۳۸- مولوی ابو الحسن صاحب جونپور

۳۹- حاجی محمد یوسف صاحب رنگون

۴۰- مولوی ابو بکر صاحب آرکانی

۴۱- سیّد فیروز شاہ صاحب منڈوری ضلع پشاور

۴۲- مولوی عبد المجید صاحب شاہ جہان پور

۴۳- مولوی عبد الرحمٰن صاحب بریلوی - مدرسہ اشاعت علوم بریلی

۴۴- مولانا سیّد سلیمان ندوی - مورخ اسلام اعظم گڑھ

ب - اسماء گرامی مجازین صحبت جو ملاء اعلیٰ میں پہنچ کر اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں۔

۱- حافظ علی نظر بیگ صاحب مغل پورہ کہنہ مراد آباد

۲- مولوی عبد الرحمٰن صاحب وکیل پٹنہ

۳- مولوی محمود الحق صاحب وکیل بردوئی۔

۴- مولوی انوار الحسن صاحب آنریری مجسٹریٹ کاکوری ضلع لکھنؤ

۵- ماسٹر مظہر احمد صاحب محلہ فتح گڑھ بھوپال

۶- حافظ زاہد حسن صاحب امروہوی - کوہ رانی کھیت

۷- مولوی محمد طاہر صاحب دار العلوم دیوبند

۸- مولوی ابو الفداء نور محمد صاحب صدر مدرس دینیات حیدر آباد دکن

۹- حاجی داؤد ہاشم صاحب پارک لین - رنگون

۱۰- منشی عبد الحمید صاحب تحصیلدار پنشنر - مقبول گنج لکھنؤ

۱۱- حکیم فیاض علی صاحب مقیم نصر اللہ گنج - گورنمنٹ بھوپال

۱۲- قاضی محمد مصطفیٰ صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر بھدوئی اسٹیٹ بنارس

۱۳۔ میر امام الدین صاحب محاسب صدارت العالیہ حیدر آباد دکن
۱۴۔ مولوی عبد المجید صاحب درس مدرسہ ناصر العلوم۔ گھوسی ضلع اعظم گڑھ
۱۵۔ مولوی عبد الکریم صاحب گم تھلوی مدرسہ حقانیہ شاہ آباد کرنال
۱۶۔ مولوی سید حسن صاحب مدرس دار العلوم دیوبند
۱۷۔ مولوی عبد الغنی صاحب رسولی ۔ ضلع بارہ بنکی

فیض رساں مجازین

ج ۔ اسماء گرامی خلفاء مجازین بیعت جو چشمۂ فیض اشرفیہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۱۔ مولوی عبد الغنی صاحب مہتمم مدرسہ روضۃ العلوم پھولپور۔ ضلع اعظم گڑھ
۲۔ حاجی شیر محمد صاحب گھوٹکی۔ ضلع سکھر (مہاجر مدینہ طیبہ)
۳۔ مولوی افضل علی صاحب تھلواڑہ۔ ڈاک خانہ کپلا ضلع بارہ بنکی
۴۔ مولوی حبیب اللہ صاحب سکھر
۵۔ مولوی واحد بخش صاحب مدرس اول مدرسہ عربیہ احمد پور شرقیہ ریاست بہاول پور۔
۶۔ سید فخر الدین شاہ صاحب گھوٹکی۔ ضلع سکھر (سندھ)
۷۔ مولوی صغیر محمد صاحب وزیرستان شمالی مقام ہرمز ڈاک خانہ عبد الحمید ضلع ڈور۔
۸۔ مولوی صغیر محمد صاحب مدرسہ عزیزیہ مغلٹولی شہر کمرلہ۔ بنگال
۹۔ مولوی اطہر علی صاحب شہیدی مسجد کشور گنج ضلع میمن سنگھ
۱۰۔ مولوی عبد الوہاب صاحب ڈاک خانہ ہارٹ ہزاری ضلع روح اللہ پور ضلع چاٹگام۔
۱۱۔ ابو البرکات صاحب مسجد محلہ نالہ ضلع سلطان پور (عوام کے لیے)

۱۲۔ مولوی نذیر احمد صاحب فاروق منڈی ضلع سرگودھا۔

۱۳۔ مولوی عبدالسلام صاحب موضع زیارت کاکا صاحب مسجد کلاں۔ تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور۔

۱۴۔ مولوی محمد موسیٰ صاحب مدرس حرم نبوی باب النساء مدینہ منورہ (مہاجر مدنی)

۱۵۔ مولوی محمد سعید صاحب مقام کیر نور۔ تعلقہ پلنی ضلع مدھرا۔ مدراس

۱۶۔ مولوی نذیر احمد صاحب متوطن کیرانہ ضلع مظفر نگر حال خان جہان پور۔ ضلع کیرانہ۔

۱۷۔ مولوی مقصود اللہ صاحب مدرسہ امدادیہ خانقاہ اشرفیہ موضع نلگاسیہ ڈاک خانہ اوراابونیہ ضلع بریسال۔

۱۸۔ مولوی وصی اللہ صاحب ندواسرائے موضع فتحپور تال نرجا ضلع اعظم گڑھ۔

۱۹۔ مولوی محمد حسن صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد۔ لاہور

۲۰۔ مولوی سراج احمد خاں صاحب امروہی محلہ چلہ امروہہ ضلع مراد آباد

۲۱۔ مولوی ممتاز احمد صاحب ڈاک خانہ باراچٹی موضع سونڈھیا۔ گیا

۲۲۔ مولوی خیر محمد صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس۔ بیرون دہلی دروازہ ملتان شہر

۲۳۔ مولوی عبدالجبار صاحب ہارون آباد ریاست بہاولپور

۲۴۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کاملپوری بہبودی ڈاک خانہ ملک والا ضلع کیمبلپور

۲۵۔ مولوی محمد طیب صاحب مہتمم مدرسہ دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور

۲۶۔ مولوی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان۔ مہتمم دارالعلوم نانک واڑہ کراچی۔

۲۷۔ مولوی محمد بلیہ صاحب ٹانڈہ بادلی ضلع مراد آباد

۲۸۔ موی محمد صابر صاحب محلہ گھیر مناف امروہہ ضلع مراد آباد

۲۹۔ نواب احمد علی خاں صاحب محلہ قلعہ نواباں۔ سہارنپور

۳۰۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب مٹوائمہ ضلع الہ آباد

۳۱۔ ماسٹر قبول احمد صاحب اسسٹنٹ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سیتاپور
۳۲۔ مولوی جلیل احمد صاحب علی گڑھی مدرسہ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور
۳۳۔ شہاب الدین صاحب خیاط کھٹور۔ ضلع میرٹھ
۳۴۔ مولوی مسیح اللہ خاں صاحب مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد۔ ضلع مظفر نگر
۳۵۔ حافظ عنایت علی صاحب امام مسجد باجڑاں لدھیانہ (للعوام)
۳۶۔ مولوی نور بخش صاحب نواکھالی مدرسہ صوفیہ پوسٹ بھیر دار ہانٹ ضلع چاٹگام۔
۳۷۔ مولوی ولی محمد صاحب گورداسپوری مدرسہ آثار الولی صدر راولپنڈی
۳۸۔ مولوی اسعد اللہ صاحب رامپوری مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
۳۹۔ مولوی حکیم الٰہی بخش صاحب اعوان محلہ ہزاری دروازہ شہر شکارپور ضلع سکھر۔ سندھ
۴۰۔ ماسٹر محمد شریف صاحب انگلش ٹیچر مکان ۷۰۹ع نواں شہر۔ ملتان چھاونی
۴۱۔ ماسٹر شیر محمد صاحب کبیر والہ ضلع ملتان
۴۲۔ مولوی کفایت اللہ صاحب مدرس مدرسہ سعیدیہ مہمند ہدف۔ شاہجہانپور
۴۳۔ مولوی حامد حسن صاحب امروہی مدرس مدرسہ عربی جامع مسجد تھانہ بھون
۴۴۔ حکیم فضل اللہ صاحب شکارپور سندھ۔
۴۵۔ بابو عبد العزیز صاحب ریٹائرڈ شیڈ کلرک متصل مسجد ملک لال خاں گوجرانوالہ
۴۶۔ مولوی رسول خاں صاحب مدرس اورنٹیل کالج لاہور۔ متوطن ہزارہ تحصیل مانسہرہ ڈاک خانہ شکیاری مقام اچھڑیاں۔
۴۷۔ مولوی محمد اللہ صاحب نواکھالی۔ مدرس مدرسہ اشرف العلوم بڑا کٹرہ۔ ڈھاکہ۔
۴۸۔ حکیم مولوی عبد الحق خاں صاحب ساکن کورٹ ضلع فتح پور ہسوہ
۴۹۔ محمود الغنی صاحب سہارنپوری کراچی۔

۵۰۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب ہومیوپیتھ۔ پرنس روڈ۔ مقابل آگرہ ہوٹل۔ کراچی
۵۱۔ مولوی عبدالباری صاحب ندوی شبستان قدم رسول۔ ہارڈنگ روڈ لکھنؤ
۵۲۔ مولوی ابرارالحق صاحب مدرسہ اسلامیہ ہردوئی
۵۳۔ مولوی فقیر محمد صاحب معرفت حاجی محمد شریف صاحب صحاف۔ دکاندار موضع توتی۔ قوم مہمندیہ سرحد

ح۔ فہرست مجازین صحبت جو اشاعتِ طریق میں سرگرم عمل ہیں۔

۱۔ سعید احمد خاں صاحب بوہرہ ڈاکخانہ بلرام ضلع ایٹہ
۲۔ شیخ محمد حسن صاحب انور بک ڈپو بندر روڈ کراچی
۳۔ منشی عبدالولی صاحب نائب ناظم ریاست کپورتھلہ معرفت کتب خانہ امدادالغربا سہارنپور۔
۴۔ شیخ عبدالکریم صاحب پنشنر سشن جج جوناگڑھ
۵۔ محمد جلیل صاحب پنشنر جج اعظم گڑھ
۶۔ منشی علی شاکر صاحب قانونگو۔ گولا ضلع کھیری کلیم پور۔
۷۔ محمد نجم احسن صاحب۔ وکیل۔ پرتاپ گڑھ
۸۔ مولوی منفعت علی صاحب وکیل ۲۲۷/۵ ڈی لیلی روڈ۔ صدر کراچی
۹۔ منشی علی سجاد صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر تھانہ بھون ضلع مظفر نگر
۱۰۔ حافظ محمد طٰہٰ صاحب کورٹ انسپکٹر گورکھپور
۱۱۔ خواجہ محمد صادق صاحب امرتسری (لاہور)
۱۲۔ منشی عبدالصبور صاحب نائب منشی حصہ اول ڈویژن دفتر سارده شاہجہانپور
۱۳۔ بخشش احمد صاحب۔ مدرسہ سعیدیہ قاضی پور خورد۔ گورکھپور
۱۴۔ حافظ لقاءاللہ صاحب پانی پتی
۱۵۔ مولوی ظہورالحسن صاحب ناظم کتب خانہ امدادالغربا سہارنپور
۱۶۔ مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب مدرسہ ٹنڈوالہیار۔ ضلع حیدرآباد سندھ

۱۷- مولوی سلطان محمود صاحب مدرس اوّل فتحپوری - دہلی

۱۸- حافظ محمد اسماعیل صاحب ولد حاجی جیون بخش. محلہ بلی ماراں - حویلی حسام الدین حیدر دہلی۔

۱۹- منشی محمد یعقوب صاحب کلانوری انگلش کلرک سررشتہ تعلیم رہتک

۲۰- مولوی عبدالصمد صاحب بنارسی مدرس کرنیل گنج. کانپور

۲۱- مولوی حمید حسن صاحب دیوبندی. مفتی ریاست مالیر کوٹلہ

۲۲- مولوی ریاض الحسن صاحب پوسٹ بکس ۳۰۷ مکہ مکرمہ

۲۳- حکیم محمد سعید صاحب گنگوہی - سرائے پیرزادگان. محلہ چوک گنگوہ. ضلع سہارنپور

۲۴- عبدالغفور صاحب ٹھیکیدار اشرف منزل. ہالی روڈ. جودھپور

۲۵- مولوی محمد داؤد دیوسف محلہ تائی داڑہ - راندیر ضلع سورت

۲۶- مولوی محمد میاں صاحب نبیرہ مولانا محمد حسین صاحب دائرہ شاہ حجۃ اللہ۔ الہ آباد۔

۲۷- مولوی محمد یوسف صاحب بنوری کراچی۔

۲۸- علی ساجد صاحب ڈاکٹر ہاشمی ہومیوپیتھک. مولوی گنج لکھنؤ۔

۲۹- مولوی سعید احمد صاحب لکھنوی صدر مدرس مدرسہ تکمیل العلوم احاطہ کمال خان کانپور۔

۳۰- سیّد مولوی عبدالکریم صاحب لکھنوی طوطہ کان ڈاک خانہ بٹ خیلہ مالاکنڈ ایجنسی براستہ مردان۔ صوبہ سرحد۔

۳۱- شیخ عبدالغفار صاحب رئیس گھوسی. ضلع اعظم گڑھ۔

۳۲- مولوی محمد نعیم صاحب بخاری ضلع بدخشاں. قصبہ ترگنی. ملک کابل

۳۳- مولوی سخاوت حسین صاحب مقام گوہاٹی پورہ. ڈاک خانہ سونگڈہ. ضلع کٹک صوبہ اڑیسہ۔

۳۴- منشی عرفان احمد صاحب کلرک ڈاک خانہ تار گھر. سہارنپور

۳۵۔ عزیز الرحمٰن صاحب نبیرۂ مولوی عبد الاحد صاحب مرحوم خلیق منزل۔ گلی چوڑی والان دہلی۔

۳۶۔ شفیق احمد صاحب گنگوہی مدرس مدرسہ سلیمانیہ۔ ہوا محل بھوپال

۳۷۔ شاہ محمد صاحب طوطہ کان۔ ڈاکخانہ بٹ خیل۔ مالاکنڈ ایجنسی۔ ضلع مردان

۳۸۔ خواجہ وحید اللہ صاحب پنشنر تارگھر۔ سرکاری گڈھ باوان ریاست کوٹہ۔ راجپوتانہ۔

۳۹۔ سید حسن صاحب ڈپٹی کلکٹر سید واڑہ نگرام۔ ضلع لکھنؤ

۴۰۔ مولوی مسعود علی صاحب شبلی منزل۔ اعظم گڑھ

۴۱۔ مولوی حکیم عبد الرشید محمود صاحب انصاری۔ گنگوہ۔ ضلع سہارنپور

۴۲۔ مولوی حکیم محمد مسعود صاحب گنگوہی معروف بہ حکیم اجمیری۔ محلہ کھڑک بمبئی

۴۳۔ ماسٹر منظور احمد صاحب تحصیلی اسکول رڑکی۔ ضلع سہارنپور

۴۴۔ حکیم بہاؤ الدین صاحب ہردوئی محلہ بورڈنگ ہاؤس سہارنپور۔

۴۵۔ ظفر احمد صاحب تھانوی ۴۵۲/۵ ہارون مینشن پرنس روڈ۔ کراچی

۴۶۔ انوار احمد صاحب وکیل۔ ڈاک خانہ قدم کنواں۔ پٹنہ

۴۷۔ شفیع محمد صاحب قریشی پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ حیدرآباد سندھ

۴۸۔ شاہ محمد حلیم صاحب۔ فیض اللہ پور۔ ڈاک خانہ محمد پور۔ ضلع اعظم گڑھ۔

تصنیفات و خطبات

امداد الٰہی

حضرت تھانوی رح کے تصنیفی کام پر "علم و ادب" کے باب میں بخوبی روشنی

ڈالی جا چکی ہے اب ان کی تصنیفات اور خطبات و ملفوظات کی تفصیل پیش خدمت کی جاتی ہے۔ جو بظاہر ایک انسان کا نہیں بلکہ ایک بہت بڑے ادارہ یا اکاڈمی کا کام نظر آتا ہے اور جس کی طویل فہرست آپ کے لیے موجب حیرت ہو گی۔ جیسا کہ خود صاحب سیرت کے لیے موجب حیرت ثابت ہوئی۔ ایک مرتبہ ایک خادم نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کا اتنی عمر میں اتنی کتابیں تصنیف کرنا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا:۔

"...تالیف و تصنیف کے بعد اب میں بھی تعجب کرتا ہوں کہ مجھ سے اتنا کام کیسے ہو گیا اور تعجب کی ایک بات اور ہے کہ بعض اوقات بعض مضامین میرے لکھے ہوئے میری ہی سمجھ میں نہیں آتے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے کہ ایک جنگ میں ایک کافر پہلوان نے آکر للکارا کہ کہاں ہیں ابو عبیدہ؟ میرے مقابلہ میں آدیں! آپ نے جانے کا قصد کیا۔ تو لوگوں نے کہا کہ ہم حاضر ہیں۔ آپ اس دیو کے مقابلہ کو کیوں جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے مجھ کو غیرت آتی ہے۔ کیونکہ اس نے میرا ہی نام پکارا ہے۔ چنانچہ تشریف لے گئے۔ مقابلہ ہوا۔ دونوں جانب سے وار ہوئے۔ دفعتہً دیکھا کہ اس کا سر کٹا ہوا علیحدہ پڑا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ فرمانے لگے کہ حیرت ہے کہ یہ کیسے ہوا عقل کام نہیں کرتی۔ اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد ہے وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى کہ یہ تو سب اللہ تعالیٰ کی امداد ہے بجز اس کی عنایت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

اور ایک صاحب نے حضرت کی تالیفات کی کثرت کی مدح و تعریف کی تو فرمایا کہ:۔

"جو کچھ کام ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی امداد و توفیق سے ہوا ہے جس

سے چاہا اپنا کام لے لیا اس میں بندے کی کیا تعریف ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے۔ جیسے کسی منشی نے ایک بچے کے ہاتھ میں قلم دے کر اور اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے کر خوشخط لکھ دیا۔ اب بچہ خوش ہو رہا ہے کہ میں نے لکھا ہے۔ حالانکہ وہ منشی جی نے لکھا ہے۔" (تالیفات اشرفیہ صہ)

اسباب کثرت تالیفات

کثرتِ تالیفات کی دوسری وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی کہ:۔

"میرے مزاج میں حرارت ہے۔ اس حرارت ہی کی وجہ سے اتنی حدّت بھی ہے اگر دوسرے کا مزاج اتنا گرم ہو۔ تو وہ اتنا ضبط نہ کر سکے میں بہت ضبط کرتا ہوں اور اسی حرارتِ مزاج کا یہ بھی اثر ہے کہ اتنے تھوڑے سے زمانہ میں بحمد اللہ اتنی تصانیف ہو گئیں۔ ٹھنڈے مزاج والے سے اتنی تصانیف تھوڑا ہی ہو سکتی ہیں۔"

مزید فرمایا:۔

"اس میں حضرت حاجی صاحب کی دُعا کا بھی اثر ہے۔ مکہ معظمہ میں حضرت مرشد علیہ الرحمۃ کے حکم سے "تنویر" کا ترجمہ لکھا کرتا تھا۔ اور حضرت کو سنا بھی دیتا تھا۔ ایک بار حسب معمول سنایا تو حضرت نے فوراً دریافت فرمایا کہ کتنی دیر میں لکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اتنے وقت میں فرمایا۔ اتنے سے وقت میں تو کوئی بھی اتنا مضمون نہیں لکھ سکتا۔ اور بہت دعائیں دیں۔ میں نے ابھی (۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء تک کی) اپنی تصانیف کا شمار کیا۔ تو پانسو انتیس ہوئی ہیں۔ ان کو اس طرح شمار

نہیں کیا کہ مثلاً تفسیر کی بارہ جلدیں ہیں۔ تو بارہ ہی شمار کر لی گئی ہوں بلکہ اس کو ایک ہی شمار کر لیا گیا ہے۔ ایک کتاب اور لکھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ ۵۳۰ ہو جائیں گی"۔

جدول مضامین

۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء کے بعد کی تصنیفات و تالیفات اور خطبات (القول الجلیل) ملفوظات اور کتب الغنا کل کی تعداد ۹ سو سے زائد ہو جاتی ہے۔ اتنی کتب کے مضامین کا یاد رکھنا کہ کون سا مضمون کس کتاب میں ہے بڑا مشکل تھا۔ اور فوری حوالہ دینے کی جب ضرورت ہوتی۔ تو تلاش میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس مشکل کے حل کی آپ نے ایک عجیب ترکیب نکالی۔ جس کی تفصیل آپ کے اس بیان میں ملتی ہے فرمایا کہ:۔

"میرا حافظہ ضعیف ہے۔ اپنا بعض ضروری مضمون تلاش کرتا ہوں کہ کس جگہ اور کس کتاب میں ہے۔ تو نہیں ملتا۔ اس لیے میں نے سب کتابوں کو دیکھ کر بطور یادداشت کے ایک جدول بنائی ہے۔ تاکہ اس کو دیکھ کر کتاب میں نکال لوں جو جدول جدید مضامین کی ہے۔ اس کا نام "غرائب الغرائب" ہے یہ مطبوع بھی ہے اور دوسری جدول جو قدیم مضامین کی ہے۔ اس کا نام "الکلام الدالۃ علی الحکم الضالہ" ہے۔ اگر انہیں مضامین کو ایک جگہ جمع کرتا۔ تو محنت ہوتی اور خرچ بھی پڑتا۔ اب کوڑیوں میں کام نکل گیا۔ بلکہ کوڑی بھی صرف نہیں ہوئی"۔

اہمیت و افادیت

تصنیف و تالیف کوئی آسان کام نہیں ہے اور اُمور دین و اسلام کے

متعلق کتب لکھنا تو اور بھی مشکل کام ہے کیونکہ اس سلسلہ میں خفیف سی لغزش۔ کوتاہی اور تسامح کے نتائج بہت ہی مضرت رساں نکلتے ہیں۔

کسی کتاب کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں مصنف یا مولف کو جن جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کا قارئین کرام کو قطعاً اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اتنی کثیر کتب کے مصنف کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ صرف "حیات المسلمین" کی تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ:۔

"یہ کتاب ان اعمال کی فہرست ہے کہ جن سے یقینی طور پر دنیا کی بھی فلاح حاصل ہوگی اور دین کی بھی۔ میں نے اس کو بہت سوچ سوچ کر لکھا ہے۔ اس کے لکھنے میں مجھ کو تعب ہوا ہے میں اوّل اس کے مضامین لکھتا تھا۔ پھر ان کو سہل کرتا تھا۔ اس کے بعد دیکھتا تھا۔ اگر کم سہل ہوئے تو پھر دوبارہ سہل کرتا تھا۔ اور ہر ماہ میں اس کے دو ورق لکھا کرتا تھا۔ اور وہ دو ورق بھی بعض مرتبہ کئی کئی بار کے مسودے میں لکھے جاتے تھے۔ لوگ اس کو اُردو میں دیکھ کر بے وقعت سمجھتے ہیں۔ اس کی قدر ان علماء کو ہو سکتی ہے جو حدیث شریف پڑھاتے ہیں۔ وہ دیکھیں گے کہ کون سا اشکال کہاں پر کس ذرا سے لفظ سے حل ہو گیا ہے"۔

گو حضرت کی کتابیں بے شمار ہیں اور ہر موضوع پر ہیں مگر اگر انسان خلوص کے ساتھ کسی ایک کتاب پر بھی عمل کرے۔ تو دینی اور دنیوی صلاح و فلاح یقینی ہے۔ چنانچہ حضرت فرماتے تھے کہ:۔

"اگر مناسبت ہو جائے تو انھیں کتابوں کو لے کر بیٹھ جاوے۔ عمر بھر کے لیے رہبری کے واسطے کافی ہیں۔ مثلاً" قصد السبیل

"تعلیم الدین"۔ "تربیت السالک" وغیرہ"۔
(ملفوظ مورخہ ۲۸ شوال ۱۳۴۴ھ)

اسی طرح "حیات المسلمین" کے متعلق فرمایا کہ:۔
"مجھ کو اپنی کسی تصنیف کے متعلق یہ خیال نہیں ہے کہ یہ میرا سرمایۂ نجات ہے۔ البتہ حیات المسلمین" کے متعلق میرا غالب خیال قلب پر ہے کہ اس سے میری نجات ہو جائے گی۔ اس کو میں اپنی ساری عمر کی کمائی اور ساری عمر کا سرمایہ سمجھتا ہوں"۔
(تالیفات اشرفیہ ص۲۴)

مواعظ کے متعلق فرمایا کہ:۔
"لوگ مواعظ نہیں دیکھتے۔ حالانکہ ان میں سب کچھ ہے۔ گو وہ چھپے ہوئے ہیں مگر چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں وہی باتیں ہیں۔ جو علماء و صلحاء کی کتابوں میں ہیں کوئی جدید بات نہیں ہے صرف زمانہ کا لحاظ ہے۔ جو شیخ الرئیس کے نسخے ہیں۔ وہ بعینہ حکیم محمود خاں صاحب کے زمانہ میں کام نہیں آتے۔ وہاں قدح بھر دوائیں ہوتی تھیں۔ یہاں مختصر سے کام لیا جانے لگا"۔ (ملفوظ مورخہ ۶ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ)

تردید و تنقید

حضرت کی تحریروں میں دوسرے فرقوں کا براہِ راست رد نہ ملے گا۔ جیسا کہ آپ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ:۔
"میں نے قصداً کسی کا رد نہیں لکھا۔ نہ اہل تشیع۔ نہ قادیانی۔ نہ غیر مقلدین۔ نہ اہل بدعت کا۔ البتہ جس کسی نے کسی کے متعلق سوال کیا۔ اس کا جواب لکھ دیا۔ اور مجھ کو یاد نہیں رہتا کہ کس

کے متعلق کیا لکھا ہے "۔

آپ نے اپنی کسی کتاب پر تقریظ نہیں لکھوائی۔ کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ :۔

"میں نے اپنی تالیف پر کسی سے تقریظ لکھوانے کی کوشش نہیں کی۔ تحریر موجود ہے۔ دیکھ لو۔ تقریظ کی کیا ضرورت ہے "۔

موضوعِ تصنیف

حضرت تھانوی نے مختلف موضوعات پر حسب ذیل کتابیں لکھیں :۔

علم القرآن

۱۔ ترجمہ قرآن ۲۔ تفسیر بیان القرآن در ۱۲ جلد ۳۔ جمال القرآن ۴۔ تجوید القرآن ۵۔ آداب القرآن ۶۔ یادگار القرآن ۷۔ متشابہات القرآن ۸۔ ظہور القرآن ۹۔ اصلاح ترجمہ دہلویہ ۱۰۔ اصلاح ترجمہ حیرت۔ ۱۱۔ التواجہ ما یتعلق بالتشابہ ۱۲۔ رفع الخلاف فی حکم الاوقاف ۱۳۔ سبق الغایات فی فسق الآیات ۱۴۔ تصویر المقطعات لیسیر بعض العبادات ۱۵۔ وجوہ المثانی (عربی) ۱۶۔ زیادات علی کتب الروایات۔ ۱۷۔ ذنابات لما فی الزیادات ۱۸۔ تنشیط الطبع فی اجراء السبع ۱۹۔ تقریر بعض النبات ۲۰۔ رفع البناء فی نفع السماء ۲۱۔ احسن الاثاث فی النظر الثانی ۲۲۔ التقیر فی التفسیر ۲۳۔ الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان ۲۴۔ تمہید الفرش فی تحدید العرش ۲۵۔ تبصیر الزجاج

علم الحدیث

۱۔ جامع الآثار ۲۔ تابع الآثار ۳۔ حفظ اربعین ۴۔ المسک الذکی۔

۵۔ الثواب الجلیؔ ۶۔ اطفاء الفتن ۷۔ موخرۃ الظنون ۸۔ الادراک و التواصل الی حقیقۃ الاشتراک و التوسل۔

عقاید

۱۔ اکسیر فی اثبات التقدیر ۲۔ فروع الایمان ۳۔ حفظ الایمان
۴۔ بسط البنان ۵۔ تغییر العنون فی بعض عبارات حفظ الایمان۔
۶۔ احکام التجلی ۷۔ ظہور العدم بنور القدم ۸۔ طلوع البدر فی سطوح القدر
۹۔ شق الجیب فی حق الغیب ۱۰۔ نموذج بعض معتقدات ابن العوج۔
۱۱۔ نافع الاشارہ الی منافع الاستخارہ ۱۲۔ جزاء الاعمال ۱۳۔ احکام الایقان

عبادات

۱۔ القول البدیع ۲۔ زکوٰۃ الفرض ۳۔ سراج الذیت۔
۴۔ الساعات للطاعات ۵۔ تعلیم الدین ۶۔ حیات المسلمین۔
۷۔ باب الریّان ۸۔ بیت الدیّان ۹۔ عیش الجیان۔ ۱۰۔ الخطب الماثورہ
۱۱۔ خطبات الاحکام ۱۲۔ کلمۃ القوم فی حکمۃ الصوم۔

تصوُّف

۱۔ دخول و خروج بر نزول و عروج ۲۔ قصد السبیل ۳۔ تعلیم المطالب
۴۔ رفع الشکوک ۵۔ مسائل السلوک ۶۔ التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف۔ چہار حصے ۷۔ تکمیل التصرف ۸۔ ملخص الانوار دوا التجلی ۹۔ مسائل مثنوی۔
۱۰۔ حقیقت الطریقت ۱۱۔ النکت الدقیقہ ۱۲۔ التکشف عن مہمات التصوف ۱۳۔ تائید الحقیقۃ ۱۴۔ انوار الوجود فی اطوار الشہود (عربی)
۱۵۔ التجلی العظیم فی احسن تقویم ۱۶۔ حق سماع ۱۷۔ کلید مثنوی (جلد ۵)

۱۸۔ عرفان حافظ ۱۹۔ معارف العوارف دو حصّے ۲۰۔ مغارف المعارف۔
۲۱۔ الابتلاء لاہل الاصطفاء ۲۲۔ تربیت السالک ۲۳۔ الجلاء والشوف فی الرضا
والخوف ۲۴۔ ارضی الاقوال ۲۵۔ انوار النظر فی آثار الظفر ۲۶۔ الیم فی السم
۲۷۔ الظم فی السم ۲۸۔ رفع الضیق عن اہل الطریق ۲۹۔ البصائر فی الدوائر
۳۰۔ الرفیق فی سوء الطریق دو حصے ۳۱۔ شمس الفضائل لطمس الرذائل ۳۲۔ لامع
علامات الاولیاء ۳۳۔ التحریض علی صالح التعریض ۳۴۔ الارشاد الی مسئلۃ الاستعداد
۳۵۔ شجرۃ المراد ۳۶۔ الحصحصہ فی حکم الوسوسہ ۳۷۔ الاعتدال فی متابعۃ الرجال
۳۸۔ القول الفصل فی البعض آثار الوصل ۳۹۔ تمییز العشق من الفسق۔
۴۰۔ مثنوی زیر وبم ۴۱۔ رونمائے مثنوی ۴۲۔ حسن العلاج لسوء المزاج
۴۳۔ اصلاح المزاج

منطق

۱۔ تلخیص المرقات ۲۔ تلخیص الشریفیہ ۳۔ تسہیل المعانی ۴۔ تلخیص المنار
۵۔ المدار ۶۔ درایۃ العصمۃ ۷۔ تلخیص ہدایۃ الحکمۃ ۸۔ تلخیص البدایۃ۔
۹۔ تذییل شرح عقائد ۱۰۔ عشرہ طروس (یہ سب عربی میں ہیں) ۱۱۔ تیسیر المنطق

علم الکلام

۱۔ اقامۃ الطامہ علی زاعم ۲۔ الانتباہات المفیدہ ۳۔ تعلیم الدین مع
تکمیل الیقین ۴۔ المصالح العقلیہ ۳ جلد ۵۔ الخطاب الملیح فی تحقیق المہدی
والمسیح ۶۔ قائد قادیان ۷۔ القول الفاصل ۸۔ التادیب لمن لیس لہ۔
۹۔ التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی ۱۰۔ ارسال الجنود الی ارسال الهنود۔
۱۱۔ تقطیف الثمرات فی تخفیف السطرات ۱۲۔ الفتوح فیما یتعلق بالروح
۱۳۔ الحق ۱۴۔ تقدیس القدسی عن تدلیس اللهبی ۱۵۔ نہایت الادراک

فی اقسام الاشراک ۱۶۔ عمارۃ العالم بإمارۃ الآدم ۱۷۔ بلوغ الفائتیہ فی تحقیق خاتم الولایۃ
۱۸۔ حفظ الحدود لحقوق الجدود ۱۹۔ اضیعم فی الجیم ۲۰۔ رفع الزحمۃ من وسع الرحمۃ
۲۱۔ الکلمۃ التامہ فی النبوۃ العامہ ۲۲۔ نعم العون فی تحقیق توبۂ فرعون (۱۶ سے ۲۴
تک سب عربی میں ہیں) ۲۵۔ القطر المشید المعصر الجدید

اصلاحیات

۱۔ تصحیح العلم فی تقبیح القلم ۲۔ تحقیق تعلیم انگریزی ۳۔ التحقیق الفرید فی حکم الہ
تقریب الصوت البعید (لاؤڈ سپیکر) ۴۔ تفصیل الکلام فی حکم تقبیل الاقدام۔
۵۔ اصلاح المعتوہ فی تعریف الحرام والمکروہ ۶۔ اصلاح الرسوم ۷۔ اصلاح الخیال
۸۔ اصلاح انقلاب دو حصہ ۹۔ آداب المعاشرت ۱۰۔ آداب الاخبار۔
اخبار بینی ۱۲۔ افکار دینی ۱۳۔ فیصلہ ہفت مسئلہ ۱۴۔ نصیحت نامہ بجواب
وصیت نامہ ۱۵۔ علاج الخیال سجادہ نشینی ۱۶۔ شذرات الحکم ۱۷۔ المواہب
۱۸۔ اغلاط العوام ۱۹۔ تسہیل الطریق۔

سیاسیات

الروضۃ المناظرہ ۲۔ حکایات الشکایات ۳۔ الصحف المنشورہ فی
فضائل الماشۃ انگورہ ۴۔ معاملۃ المسلمین ۵۔ صیانۃ المسلمین ۶۔ ضم شارد الابل
فی زم شارد الابل ۷۔ المحفوظ الکبیر للحافظ الصغیر ۸۔ احقر کے مسلک کی شرح
۹۔ احکام ائتلاف ۱۰۔ قند دیوبند ۱۱۔ تلبیس العرائک فی تصحیح اسٹرائک (ہڑتال)
۱۲۔ الشکر والدعا النصر وبالنصر یوم اللقاء

معاملات

۱۔ صفائی معاملات ۲۔ الحق الصراح فی تحقیق اُجرت النکاح ۳۔ التوریع

عن فساد التوزیع (چندہ) ۴۔ دافع الفتنک عن منافع البنک (سود بنک) ۵۔ کشف الغشو عن وجہ الرشوۃ (رشوت) ۶۔ تحذیر الاخوان عن الربوا (سود) ۷۔ جلائل الانبار ۸۔ آداب المعاشرت ۹۔ ردالتواحد فی طلاق ذات التعدد ۱۰۔ الخطوب المذہبہ للقلوب المنیبہ ۱۱۔ تحقیق التشبہ باہل السفاح لمن لایرید اداء اطہر فی النکاح ۱۲۔ تعدیل اہل الدہر فی درجۃ تقابل المہر ۱۳۔ الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد

تذکار

۱۔ نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب (یہ اب حبیب خدا کے نام سے شائع ہوئی ہے) ۲۔ شم الطیب ۳۔ یادیاراں (ذکر محمود) ۵۔ خوانِ خلیل ۶۔ الترتیب اللطیف فی قصہ الکلیم والخلیف ۷۔ سیدنا یوسف ۸۔ تعلیم الطالب شجرہ طیبہ چشتیہ عالیہ ۹۔ السنتہ الجلیلہ فی الچشتیہ العلیہ ۱۰۔ یادگار دربار پرانوار حضرت خواجہ اجمیری ۱۱۔ حکایات موعظت ۱۲۔ انوار المحسنین ۱۳۔ احسن التطہیم لمقولہ سیدنا ابراہیم ۱۴۔ تحسین دارالعلوم تزئین انوار النجوم ۱۵۔ شریف الدرایات

اذکار

۱۔ خیر الدلالہ ۲۔ القول الصحیح فی تحقیق دوازدہ تسبیح ۳۔ اوراد رحمانی ۴۔ الاستبصار فی فضل الاستغفار ۵۔ قربات عند اللہ وصلوٰۃ الرسول ۶۔ تتمہ قربات عند اللہ ۷۔ طریقہ مولد شریف ۸۔ زاد السعید فی الصلوٰۃ علی النبی ۹۔ امواج طلب ۱۰۔ مناجات مقبول ترجمہ قربات

فتاویٰ

۱۔ امداد الفتاویٰ جلدین اولین ۲۔ امداد الفتاویٰ جلدین اخریں۔ ۳۔ تتمہ

اولیٰ وثانیہ امداد الفتاویٰ ۴۔ تتمہ ثالثہ امداد الفتاویٰ ۵۔ تتمہ اربعہ امداد الفتاویٰ
۶۔ امداد الفتاویٰ تتمہ ۷۔ حوادث الفتاویٰ تتمہ ۸۔ فتاویٰ اشرفیہ اول۔
۹۔ فتاویٰ اشرفیہ دوم ۱۰۔ فتاویٰ اشرفیہ سوم ۱۱۔ تتمہ خامسہ امداد الفتاویٰ۔
۱۲۔ اکمل الادیان فی اسہل اللسان ۱۳۔ الفصل المحرم فی فصل المحرم ۱۴۔ مسائل
اہل الخطہ ۱۵۔ القول الدہلی ۱۶۔ اعداد الجنتہ۔

اسلامیات

۱۔ درجہ الحسام من اشاعت الاسلام ۲۔ حقوق الاسلام ۳۔ حقوق العلم
۴۔ ارشاد الہائم فی حقوق البہائم ۵۔ شہادۃ الاقوام ۶۔ آداب المساجد
۷۔ تنویر السراج ۸۔ تعدیل حقوق الوالدین ۹۔ شوق وطن ۱۰۔ تنبیہات
وصیت ۱۱۔ ظل صفہ ۱۲۔ العذر والندر ۱۳۔ الاستحضار للاحتضار
۱۴۔ وصل السبب فی فصل السبب ۱۵۔ بیان الوفود فی اعوان ابن سعود۔
۱۶۔ اخبار اہل المجد عن آثار اہل النجد ۱۷۔ بہشتی گوہر ۱۸۔ بوادر النوادر۔
۱۹۔ الانسداد لفتنۃ الارتداد۔

نسائیات

۱۔ بہشتی زیور دس حصے ۲۔ بہشتی جوہر ۳۔ اصلاح النساء ۴۔ دفع الارتیاب
عن مسئلہ ثبوت الانساب ۵۔ کسوۃ النسوۃ ۶۔ ثبات الستور ۷۔ القاء السکینہ
۸۔ الحیلۃ الناجزہ ۹۔ القول الصواب فی مسئلہ الجواب ۱۰۔ کثرۃ الازواج

عملیات

۱۔ التقیٰ فی احکام الرقیٰ ۲۔ اعمال قرآنی ۳۔ خواص فرقانی۔
۴۔ آثار بتیانی۔

متفرقات

۱۔ اسکات المنکر الآفات المسکر ۲۔ تعدیل التقویم ۳۔ ترجیح الراجح
۴۔ کراماتِ امدادیہ ۵۔ امداد المشتاق ۶۔ سواد خوبی ۷۔ الطرائف و
الظرائف ۸۔ نوال السنۃ فی اعمال السنۃ ۹۔ نیل الشفا بنعل المصطفیٰ۔
۱۰۔ نصح الاخوان فی حروف الزمان ۱۱۔ القول الاحکم ۱۲۔ الحکم الحقانی۔
۱۳۔ صدق الرویا ۱۴۔ الشراب السراب ۱۵۔ بناء القبہ ۱۶۔ خاتمہ بالخیر
۱۷۔ تشنیف الاسماء ۱۸۔ لوح الالواح ۱۹۔ عبور البراری ۱۹۔ النخب
من الخطب ۲۱۔ الکلم الدالہ ۲۲۔ موائد العوائد ۲۳۔ غرائب الرغائب
۲۴۔ الرق المنشور ۲۵۔ جمع الصکوک فی قمع الشکوک ۲۶۔ چار جوئے بہشت
۲۷۔ تحصین دار العلوم ۲۸۔ الکلم الطیب ۲۹۔ جزل الکلام فی عزل الامام
۳۰۔ سبعہ سیارہ ۳۱۔ نضیری بشرح کلام نضیری ۳۲۔ نقایات القیب
۳۳۔ مائۃ دروس ۳۴۔ اللطائف للطائف ۳۵۔ اماثل الاقوال لافاضل الرجال
۳۶۔ رفع الاغلط ۳۷۔ تفصیل محمودیت ۳۸۔ الشوارق فی الخوارق

مکتوبات

۱۔ خطاب الندوہ ۲۔ خطوط خوبی ۳۔ المعلومات الاشادیہ۔
۴۔ مکتوبات امدادیہ ۵۔ ضیاء الافہام ۶۔ مکتوب محبوب القلوب۔
۷۔ مکتوبات خبرت۔

ملفوظات

۱۔ کمالاتِ امدادیہ ۲۔ الماثن الامدادی ۳۔ حسن العزیز چہار حصہ۔
۴۔ مقالات حکمت ۵۔ مجادلات معدلت ۶۔ مزید المجید۔ ۷۔ مجالس الحکمت

۸۔ مقالاتِ حسنہ ۹۔ الطاحون ۱۰۔ القول الجلیل ۱۱۔ السلسبیل لعابری السبیل
۱۲۔ القطائف من الاطائف ۱۳۔ ملفوظات خبرت ۱۴۔ ملحوظات ۱۵ محظوظات
۱۶۔ جدید ملفوظات ۱۷۔ ریاض الفوائد ۱۸۔ حکم الحکیم ۱۹۔ ارشاد الرشید
۲۰۔ الافاضات الیومیہ ۲۱۔ ادب الاعتدال ۲۲۔ ادب الطریق۔
۲۳۔ ادب الترک ۲۴۔ ادب العشیر ۲۵۔ ادب الاسلام۔ ۲۶۔ ادب
الاعلام ۲۷۔ ملفوظات بقلم حافظ صغیر احمد ۲۸۔ خیر الحضور فی الکانپور۔
۲۹۔ خیر العبور فی سفر گورکھپور۔ ۳۰۔ خیر الحدود ۳۱۔ سفرنامہ پانی پت
۳۲۔ ذم الخلائق ۳۳۔ الصناعات فی العبارت ۳۴۔ المفتاح المعنوی۔
۳۵۔ فیوض الخالق ۳۶۔ نیل المراد ۳۷۔ سفرنامہ دیوبند ۳۸۔ سفرنامہ کوٹ
۳۹۔ فضل العزیز ۴۰۔ رحمۃ العزیز دو جلد ۴۱۔ بصر الناظر ۴۲۔ ناظر الباطہ
۴۳۔ انوار الحقائق ۴۴۔ وصیۃ الوصی ۴۵۔ حسن یوسف دو حصّہ ۴۶۔ بزمِ
جمشید ۴۷۔ فرائد الفوائد ۴۸۔ علو النازل ۴۹۔ نظر عنایت ۔ ۵۰۔ جبر الکبیر
۵۱۔ رحمت اعظم ۵۲۔ اسعاد الاسعد ۵۳۔ خیر الاختبار فی خبر الاختیار۔
۵۴۔ سفرنامہ گنگوہ ۵۵۔ کلمۃ الحق دو جلد ۵۶۔ سنۃ المعصوم ۵۷۔ جبر الکبیر
۵۸۔ فیوض الخالق ۵۹۔ اسعاد الطالبین ۶۰۔ تصحیح الخیال ۶۱۔ کلام الحسن
۶۲۔ ارمغانِ عید ۶۳۔ دنیا کی پستی اور دین کی مستی ۶۴۔ سرمایۂ ہستی۔

تفصیل المواعظ

حضرت تھانویؒ کے جو مواعظ ضبط تحریر میں لائے گئے۔ ان کی موضوع وار تفصیل درج ذیل ہے۔

اتباع و اتقاء

۱۔ حیاتِ طیبہ ۲۔ طاعت الاحکام ۳۔ حق الاطاعۃ ۴۔ الغالب للطالب

۵۔ سبیل السعید ۶۔ الرحیل الی الخلیل ۷۔ اتباع المنیب ۸۔ الشریعۃ
۹۔ صلوٰۃ الحزین ۱۰۔ سنت ابراہیم ۱۱۔ الاتباع ۱۲۔ اعانۃ للتقویٰ
۱۳۔ التقویٰ ۱۴۔ طریق القرب ۱۵۔ العزت ۱۶۔ شرائط الطاعت
۱۷۔ سلوٰۃ الحزین۔

اخلاص و ایمان

۱۶۔ الاخلاص حصّہ اوّل ۱۷۔ الاخلاص حصّہ دوم۔ ۱۸۔ شرط الایمان
۱۹۔ شعب الایمان

اتّحاد و اخوت

۲۰۔ الاتفاق ۲۱۔ الاعتصام بحبل اللہ ۲۲۔ اصلاح ذات البین
۲۳۔ الاخوۃ۔

استغفار

۲۴۔ ضرورۃ التوبہ ۲۵۔ تفصیل التوبہ ۲۶۔ الاستغفار
۲۷۔ استمرار التوبہ ۲۸۔ الہدیٰ و المغفرۃ ۲۹۔ آثار الحوبہ فی اسرار التوبہ

اسلام

۳۰۔ تکمیل الاسلام ۳۱۔ احسان الاسلام ۳۲۔ درجات الاسلام۔
۳۳۔ السلام التحقیقی ۳۸۔ محاسن الاسلام ۳۹۔ الدوام علی الاسلام۔
۴۰۔ الاسلام الحقیقی ۴۱۔ الاتمام لنعمۃ الاسلام تین حصّے ازالۃ الفتنۃ۔

اخلاق و آداب

۴۲۔ سیرۃ الصوفی ۴۳۔ آداب المساجد ۴۴۔ اشرف المکالمہ ۴۵۔ السؤال

۴۶۔ النور ۴۷۔ الدعوۃ الی اللہ ۴۸۔ الرفع والوضع ۴۹۔ آداب التبلیغ
۵۰۔ رجا الغیوب ۵۱۔ اعانتہ النافع ۵۲۔ ایقاد العبد ۵۳۔ المحسنات
۵۴۔ التفقہ ۵۵۔ الارادہ ۵۶۔ التوکل ۵۷۔ احسان التدبیر ۵۸۔ دستور
سہارنپور ۵۸۔ اجابت الداعی ۵۹۔ الاستقامتہ

اصلاح الاعمال

۶۰۔ تسہیل الاصلاح ۶۱۔ تیسیر الاصلاح ۶۲۔ التصدی للغیر ۶۳۔ الظاہر
۶۴۔ الباطن ۶۵۔ المجاہدہ ۶۶۔ الارتیاب والاغتیاب ۶۷۔ قرب الحساب
۶۸۔ ذم المکروہات ۶۹۔ تغافل الاعمال ۷۰۔ طریق النجات ۔ ۷۱۔ الافنضاح
۷۲۔ الطباع

اصلاح النفس

۱۔ اصلاح النفس ۲۔ نسیان النفس ۳۔ مراقبتہ الارض ۴۔ ذم النسیان
۵۔ زکواۃ النفس ۶۔ اسباب الغفلت ۷۔ ازالتہ الغین عن آلتہ العین ۔
۸۔ وعظ چرتھاول ۹۔ ترک مالایعنی ۱۰۔ مظاہر الاقوال ۱۱۔ غض البصر
۱۲۔ تطہیر الاعضاء ۱۳۔ حفظ اللسان ۱۴۔ الارتعاظ بالغیر

ترغیب وترہیب

۱۔ جمال الجلیل ۲۔ التوجہ ۳۔ الوصل الفصل ۴۔ العزت ۔
۵۔ رفع الموانع ۶۔ الوصل والفصل

تسلیم ورضا

۱۔ قطع التمنی ۲۔ الخلط ۳۔ المعرق والرحیق ۴۔ الرضاء الحق دو حصے۔

۵۔ المعترف بالتصرف ۶۔ فناء النفوس ۷۔ افناء المجبوب

ذکر و فکر

۱۔ تفصیل الذکر ۲۔ ذکر الرسول ۳۔ دواء الضیق ۴۔ المراقبہ
۵۔ اکبر الاعمال ۶۔ الذکر ۷۔ راحت القلوب ۸۔ القاف ۹۔ الاسعاد والایعاد ۱۰۔ رطوبت اللسان۔

دین و دنیا

۱۔ ضرورۃ الاعتنا بالدین ۲۔ ضرورۃ العلم بالدین ۳۔ ضرورۃ العمل بالدین
۴۔ الدین الخالص ۵۔ نفی الحرج ۶۔ ملت ابراہیم ۷۔ تفصیل الدین
۸۔ الحیوۃ ۹۔ تاسیس البنیان ۱۰۔ الرضا بالدنیا ۱۱۔ متاع الدنیا
۱۲۔ مظاہر الکال ۱۳۔ الفانی ۱۴۔ غریب الدنیا ۱۵۔ الاطینان بالدنیا
۱۶۔ الدنیا ۱۷۔ الکمال فی الدین الرجال

دار الآخرت

۱۔ تذکیر الآخرت ۲۔ الدنیا والآخرہ ۳۔ ہم الآخرت ۴۔ المراد
۵۔ ترجیح الآخرت ۶۔ سبیل النجاح ۷۔ دار المسعود۔ ۸۔ تجارت آخرت
۹۔ رجاء اللقاء

دعا و دوا

۱۔ مہمات الدعا و حصے ۲۔ الاضافۃ فی معنی الاجابۃ ۳۔ نشر الرحمۃ
۴۔ الدعاء ۵۔ دوا العیوب ۶۔ علاج العرض ۷۔ الافتضاح۔
۸۔ علاج الکبر ۹۔ حب العاجلہ ۱۰۔ الخنوع ۱۱۔ الغضب۔

۱۲۔ غوائل الغضب ۱۳۔ الفرض ۱۴۔ اوج قنوج

ردِّ بدعات

۱۔ تقویم الزیغ ۲۔ غضل الجاہلیۃ ۳۔ نقد اللبیب فی عقد الجیب۔
۴۔ الحضور الامور الصدور۔

حدود و حقوق

۱۔ خیر الارشاد فی حقوق العباد ۲۔ اصلاح الیتامیٰ ۳۔ رمضان فی رمضان
۴۔ حرمات الحدود ۵۔ الحدود والقیود ۶۔ العبد الربانی ۷۔ حقوق البیت
۸۔ التبشیر ۹۔ الاسراف ۱۰۔ کف الاذٰے ۱۱۔ حقوق السراء والضراء
۱۲۔ حقوق المعاشرت ۱۳۔ حفظ الحدود ۱۴۔ حقوق القرآن ۱۵۔ الوقت
۱۶۔ الباب الاولی الالباب ۱۷۔ النفحات فی الاوقات ۱۸۔ الفشر
۱۹۔ الرغبۃ المرغوبہ ۲۰۔ التبشیر

خیر و شر

۱۔ عمل الذرہ ۲۔ ایواء الیتامیٰ ۳۔ الانسداد للفساد ۴۔ الظلم
۵۔ مفتاح الخیر ۶۔ التعاون علی الخیر

خوف و خشیت

۱۔ خواص الخشیّت ۲۔ مواعظ اشرفیہ کانپور ۳۔ العلم والخشیّۃ۔
۴۔ مواعظ اشرف (میرٹھ) ۵۔ ثمرات الخوف

حرص و ہوس

۱۔ ذم الہویٰ ۲۔ منازعۃ الہویٰ ۳۔ الہویٰ ۴۔ الہویٰ والہدیٰ

حج وقربانی

۱۔ ترغیب الاضحیہ ۲۔ تعظیم الشعائر ۳۔ روح الحج والثج ۴۔ السوال فی شوال ۵۔ العبرۃ بذبح البقرۃ ۶۔ تکمیل الانعام فی سودۃ ذبح الانعام۔ ۷۔ الحج المبرور ۸۔ الحج ۹۔ روح الارواح

صبر وشکر

۱۔ الصبر ۲۔ حقیقۃ الصبر ۳۔ ما علیہ الصبر ۴۔ الاجر النبیل فی صبر الجمیل ۵۔ الجبر والصبر ۶۔ الصبر والصلوٰۃ ۷۔ السبر بالصبر۔ ۸۔ الشکر ۹۔ تحقیق الشکر ۱۰۔ شکر المثنوی ۱۱۔ النعم المرغوبہ ۱۲۔ شکر النعمۃ ۱۳۔ عمل الشکر ۱۴۔ شکر العطا

صوم وصلوٰۃ

۱۔ قطیر رمضان ۲۔ اکمل الصوم والعید ۳۔ احکام العشر الاخیر۔ ۴۔ نداء رمضان ۵۔ الصیام ۶۔ شعبان فی الشعبان ۷۔ روح الجوار ۸۔ روح الافطار ۹۔ عصم الصنوف عن رغم الالوف النسوان فی رمضان ۱۰۔ اجر الصیام ۱۱۔ اجر الصیام بلا انصرام ۱۲۔ اکمال العدہ ۱۳۔ اصلاحات فی الصلوات ۱۴۔ تحصیل المرام ۱۵۔ الیسر مع العسر ۱۶۔ الصلوٰۃ ۱۷۔ مثلث رمضان ۱۸۔ التہذیب چھ حصے، ۱۹۔ العتق من النیران

صحبت بزرگاں

۱۔ دعاۃ الامّت وہداۃ الملّت ۲۔ تتمہ الملک ۳۔ اختیار الخلیل۔ ۴۔ فوائد الصحبت ۵۔ انوار السراج ۶۔ البصیر بالبشیر

سلوک و تصوّف

۱۔ تقلیل الطعام ۲۔ تقلیل المنام ۳۔ تقلیل الکلام ۴۔ تقلیل الاختلاط
۵۔ التحصیل والتسہیل ۶۔ المرابط ۷۔ طریق القلندر

عبادت

۱۔ العبادۃ ۲۔ آثار العبادہ ۳۔ اسرار العبادہ ۴۔ اصل العبادۃ
۵۔ اداء الفضلۃ ۶۔ علو العبادہ

علم و عمل

۱۔ طلب العلم ۲۔ تعلیم البیان ۳۔ نور الصدور ۴۔ تعظیم العلم مع تقسیم العلم
۵۔ تعمیم التعلیم ۶۔ کوثر العلوم ۷۔ الفاظ القرآن ۸۔ وعظ شفاء العی السوال ۹۔ الفاد المجازفہ ۱۰۔ فطار الاحوال ۱۱۔ التواصی بالحق۔
۱۲۔ الفصل والانفصال ۱۳۔ الاکرمیتہ بالاعلمیۃ والاعمالیۃ ۱۴۔ الجناح
۱۵۔ شرط التذکیر ۱۶۔ تجدید الامثال تبعد دالاعمال ۱۷۔ تعدد الامثال
۱۸۔ تکمیل الاعمال ۱۹۔ اول الاعمال ۲۰۔ آخر الاعمال ۲۱۔ ضرورۃ العلماء
۲۲۔ العمل للعلماء

عیدین

۱۔ روح الصیام ۲۔ الفطر ۳۔ نمود العید۔ ۴۔ عود العید۔
۵۔ العید والوعید۔

میلاد النبی

۱۔ الظہور ۲۔ السرور ۳۔ الحبور النور الصدور ۴۔ الشذور

فی جقوق البدور ۵۔ نور النور ۶۔ الموالد الفریخی فی الموالد البرزخی۔
۷۔ الرحمۃ علی الاُمتہ

مال وجاہ

۱۔ احکام المال ۲۔ مظاہر الاموال ۳۔ انفاق المحبوب ۴۔ المال والجاہ
۵۔ خیر المال للرجال ۶۔ خیر الاثاث للاناث ۷۔ احکام الجاہ

مضار المعصیتہ

۱۔ استخفاف المعاصی ۲۔ ترک المعاصی ۳۔ مضار المعصیتہ ۴۔ ترجیح المفسد ۵۔ الکاف

مصیبت وراحت

۱۔ تادیب المصیبتہ ۲۔ التنبیہ ۳۔ التیسیر المتیسیر ۴۔ التراحم فی التراحم
۵۔ الامتحان ۶۔ الجلاء للابتلاء ۷۔ الجلاء عن البلاء

محبت ومودت

۱۔ مواسات المصابین دو حصے ۲۔ آثار المحبت ۳۔ وحدت الحب
۴۔ اسباب الفتنہ ۵۔ المودۃ الرحمانیہ

موت وحیات

۱۔ ذکر الموت ۲۔ خیر الحیات والممات ۳۔ التثبیت بمراقبتہ المیت
۴۔ یقظۃ النائم

فضائل

۱۔ فضائل العلم والخشیۃ ۲۔ فضل العلم والعمل ۳۔ شعبان ۴۔ راس الاربعین ۵۔ التعمیم التعلیم القرآن الکریم ۶۔ اسباب الفضائل ۷۔ الجمعین بین التفعین ۸۔ الفشر ۹۔ الفضل العظیم ۱۰۔ الضحایا ۱۱۔ اشرف العلوم ۱۲۔ شب مبارک ۱۳۔ روز مبارک ۱۴۔ ماہ مبارک

نسوانیات

۱۔ اصلاح النسواں ۲۔ الباقی ۳۔ العفتہ ۴۔ اکمال فی الدین للنساء ۵۔ الاستماع والاتباع ۶۔ غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح ۔ ۷۔ رفع الالتباس ۸۔ برکت النکاح ۹۔ کساء النساء

متفرقات

۱۔ اصلاح ذات البین ۲۔ الخیانت ۳۔ شوق اللقاء ۴۔ الصلاح والاصلاح ۵۔ تحریم المحرم ۶۔ نیل البر ۷۔ اقسام الریا ۸۔ جمال یوسف ۹۔ الطاحون ۱۰۔ الاستعداد ۱۱۔ الاولایت ۱۲۔ الاستعذاد ۱۳۔ العاقلات الغافلات ۱۴۔ الدعویٰ ۱۵۔ العود الی المقاصد ۱۶۔ التمدن ۱۷۔ المبنومان ۱۸۔ السکن ۱۹۔ آثار المزاج ۲۰۔ سنت ابراہیمؑ ۲۱۔ نظام الحدیث ۲۲۔ احدی الحنیین ۔

تفصیل اعتناء

بعض اہلِ علم نے حضرت تھانوی کی تالیفات کے ساتھ مختلف طریق سے اعتناء فرمایا ۔ کسی نے تسہیل عبارت سے ۔ کسی نے تلخیص انتخاب

سے اور کسی نے دوسری زبان میں ترجمہ سے۔ تاکہ حضرت کے علوم و معارف سے اُمّت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی اعلیٰ و ادنیٰ اور عام و خاص محروم نہ رہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:۔

کتب معتنیٰ بہ

۱۔ امثال عبرت ۲۔ علم غیر منقول ۳۔ تفسیر المواعظ ۴۔ علوم امدادیہ ۵۔ ابیات حکمت ۶۔ عروس المواعظ ۷۔ اصول الوصول ۸۔ رفع الضیق ۹۔ الشفاء ۱۰۔ ترجمہ اُردو زیروبم ۱۱۔ حواشی رسالہ انتباہات ۱۲۔ ابانۃ البیان ۱۳۔ تسہیل قصد السبیل ۱۴۔ الشراب الطہور ۱۵۔ حل الانتباہات ۱۶۔ مناجات مقبول ۱۷۔ معمولات اشرفی ۱۸۔ فرائد الفوائد ۱۹۔ معمولات سفر ۲۰۔ ترجمہ مائۃ دروس ۲۱۔ تسہیل شوق وطن ۲۲۔ صلوٰۃ السفر ۲۳۔ معمولاتِ خانقاہ ۲۴۔ اشرف السوانح ۲۵۔ انفاس عیسیٰ ۲۶۔ ادراالنعمت فی اشعار حکمت ۲۷۔ بہشتی ثمر ۲۸۔ انوالۃ الوسن ۲۹۔ خلاصہ بیان القرآن ۳۰۔ کمالات اشرفیہ ۳۱۔ المحیص بیان القرآن ۳۲۔ الحصون الحصینہ ۳۳۔ تصحیح الاغلاط ۳۴۔ اشرف المعمولات ۳۵۔ افادۃ العوام ترجمہ خطبات الاحکام ۳۶۔ تسہیل تمہید حیات المسلمین ۳۷۔ عنوان التصوف ۳۸۔ مرأۃ المواعظ، ۳۹۔ تالیفاتِ اشرفیہ ۴۰۔ اشرف الجواب ۴۱۔ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ شریعت اور طریقت ان کے علاوہ تقریباً ۶۰ مواعظ کی بھی تسہیل وغیرہ کی گئی ہے۔

تالیفات مترجمہ

ان کے علاوہ حضرت کی تالیفات کے بکثرت دوسری زبانوں میں

بعض اربابِ علم نے ترجمے بھی کیے۔ ان کی تفصیل تالیفاتِ اشرفیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں صرف تعداد پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ فرانسیسی	زبان میں	۱
۲۔ ہندی	"	۱
۳۔ ناگری	"	۱
۴۔ پشتو	"	۱
۵۔ برہمی	"	۵
۶۔ انگریزی	"	۸
۷۔ سندھی	"	۱۱
۸۔ گجراتی	"	۱۴
۹۔ بنگالی	"	۲۰

ماہنامے

حضرت تھانوی کے فیوض وبرکات ظاہری و باطنی کی تبلیغ و اشاعت کے لیے حسب ذیل ماہنامے خانقاہ امدادیہ اشرفیہ سے جاری ہوتے رہے۔

النّور

یہ ماہوار رسالہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون سے زیرادارت مولانا شبیر علی صاحب ہر قمری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے مع ٹائیٹل ۳۶ صفحے تھے جو ۱۳۳۹ھ سے جاری ہوا۔ اس کا سال ماہ جمادی الاولیٰ سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

المبلّغ

اسے بھی مولانا شبیرؔ علی صاحب تھانہ بھون سے شائع کیا کرتے تھے

۴۰ صفحات کا یہ رسالہ ہر قمری مہینہ کو شائع ہوتا تھا۔ یہ ۱۳۴۹ھ سے جاری ہوا۔ اس کا سال شوال المکرم سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرت کے جدید مواعظ شائع ہوا کرتے تھے۔

الابقاء

یہ رسالہ دریبہ کلاں دہلی سے جناب محمد عثمان خاں صاحب تاجر کتب نے ہر قمری مہینہ کی پندرھویں تاریخ کو شائع کرنا شروع کیا۔ اس میں مع ٹائیٹل ۳۶ صفحے ہوتے تھے یہ رسالہ ۱۳۴۶ھ میں جاری ہوا۔ اس کا سال ماہِ رمضان سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں حضرت کے کمیاب مواعظ شائع ہوتے ہیں۔ یہ اب تک کراچی سے شائع ہوتا رہتا ہے۔

الہادی

یہ رسالہ بھی دریبہ کلاں دہلی سے زیر اہتمام خان صاحب موصوف ہر قمری مہینہ میں شائع ہوتا تھا۔ ۴۸ صفحات کا یہ رسالہ ۱۳۴۲ھ میں جاری ہوا۔ اس کا سال جمادی الاولیٰ سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرت کے ہر قسم کے علوم عقلیہ و نقلیہ شائع کیے جاتے تھے۔

الامداد

یہ رسالہ امداد المطابع تھانہ بھون سے رجب ۱۳۳۲ھ سے جاری ہوا۔ ضخامت ۴۰ صفحات کی تھی۔ حضرت کے ہر قسم کے مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔

اشرف العلوم

یہ رسالہ دفتر اشرف العلوم سہارنپور سے زیر ادارت مولانا ظہور الحسن صاحب

کسولوی محرم الحرام ۱۳۵۴ھ سے جاری ہونا شروع ہوا۔ ہر قمری مہینہ میں شائع ہوتا تھا۔ شروع میں یہ ۲۲۵ صفحات پر چھپتا رہا بعد میں اس کی ضخامت ۴۰ صفحات رہ گئی۔

الاشرف

یہ ماہوار رسالہ انوار بک ڈپو لکھنؤ سے زیر ادارت مولوی محمد حسن صاحب نکلا کرتا تھا۔ یہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ سے جاری ہوا۔ اس کے نصف میں جدید ملفوظات اور نصف میں کتاب بوادر النوادر شائع ہوتی تھی۔

جدید اضافے

حال ہی میں حضرتؒ کے متعلق مندرجہ ذیل کتب شائع ہوئیں۔

۱۔ حیاتِ اشرف — مصنفہ جناب غلام محمد صاحب عثمانیہ

۲۔ جامع المجددین
۳۔ تجدید تصوّف وسلوک
۴۔ تجدید معاشیات
۵۔ تجدید تعلیم و تبلیغ

} مصنفہ مولانا عبد البارى صاحب ندوی

۶۔ حکیم الامت — مصنفہ مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی

تعداد کتب

اس وقت تک حضرت تھانویؒ کی اپنی اور ان کے متعلق شائع ہونے والی تمام کتابوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے۔

حیرت فرنگی

جیسا کہ "علم و ادب" کے باب میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت

تھانوی نے اپنی کسی تصنیف پر رائلٹی لینی پسند نہ کی۔ ورنہ جس طرح آپ سینکڑوں کتابیں اپنی علمی یادگار کے طور پر چھوڑ گئے تھے اسی طرح ان کی رائلٹی سے کمایا ہوا لاکھوں روپیہ بھی پس انداز کر جاتے۔ مگر حضرت کو تو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر تھی۔ اس لیے جب ایک مرتبہ ایک انگریز نے حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کو تفسیر لکھنے میں کتنے روپے ملے تو حضرت نے فرمایا "کچھ نہیں" اس پر اس نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ پھر اتنی بڑی کتاب لکھنے کی آپ نے محنت ہی کیوں کی۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"ہم لوگ اس کے قائل ہیں کہ علاوہ اس زندگی کے ایک اور بھی زندگی ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ میں نے یہ محنت اس توقع پر کی ہے کہ انشاء اللہ مجھے اس کا عوض اس دوسری زندگی میں ملے گا۔ اور ایک اس سے دنیا کا فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب میں دیکھوں گا کہ میرے مسلمان بھائی پڑھ پڑھ کر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تو مجھ کو خوشی ہو گی۔"

اس پر وہ انگریز بہت متاثر ہوا اور حضرت کے دینی جذبہ کی تعریف کی۔ اگر حضرت تھانویؒ ان کتابوں پر رائلٹی لیتے تو آج اکثر گھروں میں حضرت کی علمی یادگار نظر نہ آتیں۔

اہل و عیال

ازواج محترمات

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دو بیویاں تھیں۔ اور دونوں بفضلہ تعالیٰ نہایت

شفیق۔ غربا پرور۔ متوکل۔ قانع۔ مہمان نواز اور حضرت کی خدمت گزار تھیں۔ دوسرے عقد سے گو شروع میں بڑی بیگم صاحبہ کو طبعاً کچھ رنج ہوا۔ مگر حضرت کے عدل و مساوات کے پیش نظر یہ بہت جلد دُور ہو گیا۔ اور دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش و خرم رہنے لگیں۔

عقد ثانی پر اعتراض

حضرتؒ کے عقد ثانی کرنے پر معاندین و مخالفین نے آسمان سر پر اُٹھا لیا کہ آپ نے عقد ثانی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"نہیں میں نے یہ دروازہ کھولا نہیں۔ بلکہ بند کر دیا ہے۔ کیونکہ جب لوگ دیکھیں گے، کہ عدل یوں کیا جاتا ہے۔ اور عدل کی اتنی رعایت کرنی پڑتی ہے تو اس کو دشوار سمجھ کر عقد ثانی کی ہمت نہ کر سکیں گے۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت کے عدل و مساوات نے عہد نبویؐ کی یاد تازہ کر دی۔ دراصل حضرت کا عقد ثانی نظامِ تکوینی کے ہی ماتحت ہے۔ اور اس زمانہ میں قدرت کو حکیم الامت کے ذریعہ یہ دکھلانا مقصود تھا کہ بیویوں کے ساتھ یوں عدل کیا جاتا ہے۔

ابتدائی دشواریاں

حضرت کو شروع شروع میں تو عدل کی جزئیات دقیقہ کی رعایت میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ لیکن چونکہ حضرت والا حقوق العباد کے متعلق بہت ہی زیادہ محتاط تھے۔ اس لیے برابر فکر و اہتمام بلیغ میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے حسب وعدہ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ سب دشواریوں کو آسان فرما دیا۔ رفتہ رفتہ ساری جزئیات عدل کے متعلق طریق عمل

سمجھ میں آگیا۔ اور پھر حضرت کو بفضلہٖ تعالیٰ کبھی کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کیونکہ جب انسان کی نیت صحیح ہو تو حالات خود بخود صحیح ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں شروع سے نیت ہی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی ہو۔ وہاں عموماً یہی دیکھا گیا کہ عشق ومحبت کی بناء پر ہونے والے عقد ثانی بھی وبالِ جان ہی بن کر رہے۔

کمال عدل

حضرت ہر معاملہ میں مابین زوجین پورا پورا عدل برتتے تھے۔ ہر لحاظ سے مساوی برتاؤ کرتے تھے۔ یہاں تک جب نیا نیا عقد ثانی ہوا۔ تو آپ فرماتے تھے کہ:-

"میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہو گی۔ جس کی باری ہے اور یہ اس کی حق تلفی ہے۔ اسی طرح اب میں کپڑے خانقاہ میں ہی رکھتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا۔ تو دوسرے گھر والوں کو شکایت پیدا ہوتی۔ کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں۔ جتنی دوسری کے ساتھ ہے"

حضرت والا نقد یا غیر نقد جو کچھ دیتے۔ دونوں کو برابر دیتے۔ یہاں تک کہ ایسی چیزوں کی تقسیم کے لیے جو وزن کی جاتی ہیں۔ ایک نہایت صحیح کانٹا اپنی نشست گاہ کے سامنے لٹکا رکھا تھا۔ جس کو مزاحاً "میزانِ عدل" فرمایا کرتے تھے۔ کھانا بھی ایک دن ایک گھر میں تناول فرماتے اور دوسرے دن دوسرے گھر میں۔ اسی طرح رمضان المبارک میں افطار کے وقت بڑے گھر اور سحری کے وقت چھوٹے گھر سے کھانا کھاتے۔

بے نظیر احتیاط

حضرت والا طبعاً بڑے غیور واقع ہوتے تھے اور کسی کا احسان لینا گوارا

نہیں فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے بیویوں کے بھی احسان مند نہیں ہوتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ان کے ساتھ تو احسان کرنا چاہیئے نہ کہ الٹا ان کا احسان لینا چاہیئے۔

آپ اپنی آمدنی کے تین حصّے فرماتے۔ ایک ایک دونوں گھروں میں دے دیتے۔ ایک حصّہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے اپنے پاس رکھتے۔ آپ دونوں گھروں سے جو کھانا کھاتے۔ مختلف طریقوں سے اس کا معاوضہ بھی اپنی زوجین کو ادا کر دیتے۔ تاکہ ان کا احسان نہ رہے۔ گو وہ منع فرماتیں۔ مگر آپ معاملہ کو صاف رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ اپنے کھانے کی رقم ایسے ذرائع سے ادا فرماتے کہ وہ بھی محسوس نہ کرتیں اور ان پر بھی بار نہ رہتا۔

مزید براں جن مکانات میں آپ کی ازواج محترمات رہتی تھیں۔ وہ دونوں ان کی ملک تھے اس لیے آپ ان مکانوں میں اپنی رہائش کے تمتع کا معاوضہ بھی انھیں لوا کرتے رہتے۔ تاکہ کسی کا حق آپ کے ذمہ نہ رہے۔

آپ کی برادری میں ادائے مہر کا دستور نہیں تھا۔ مگر آپ نے دونوں گھروں کا مہر ادا کر دیا۔ حالانکہ آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ نے آپ کو اپنا پانچ ہزار حق مہر بخوشی معاف کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ نے وہ پانچ ہزار روپیہ انھیں ادا فرما دیا۔ کیونکہ حضرت کے نزدیک وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کی راجح تفسیر یہی تھی۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ :-

"اگر عورت مہر معاف بھی کر دے۔ تب بھی مرد کی غیرت کا مقتضا یہی ہونا چاہیئے۔ کہ وہ پھر بھی مہر ادا کر دے۔"

انتہائی رعایت

ایک حدیث شریف کی رو سے نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ اپنے بعد بھی بیویوں کی آسائش کی فکر سنّت ہے۔ اس لیے حضرت اپنے دونوں گھروں کی

راحت وعافیت کا بہت ہی خیال رکھتے تھے۔ اور ہر موقع اور محل کا پورا پورا حق ادا فرماتے تھے۔ ان سے بہت ہی نرمی لطف اور بے تکلفی کا برتاؤ فرماتے تھے۔ حتی الوسع ان پر کوئی بوجھ نہ ڈالتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی خاص کھانے کی بھی کبھی فرمائش نہیں کرتے تھے۔ الّا نادراً۔ البتہ جب گھر والوں کی طرف سے اصرار ہوتا۔ تو دل شکنی بھی نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ یہ دریافت فرماتے تھے کہ اچھا تم خود ہی چند کھانوں کے نام بتا دو۔ جو تمھیں پکانا آسان ہو۔ پھر ان میں سے جو مجھے مرغوب ہوگا۔ میں بتا دوں گا۔ جب چند کھانوں کے نام لیے جاتے۔ تو حضرت ان میں سے کسی کی فرمائش کر دیتے۔ بقول خواجہ عزیز الحسن صاحب حضرت میں غیرت تو تھی۔ لیکن غیریت نہ تھی۔

اسی طرح اگر کبھی اتفاق سے کھانا کھاتے وقت دستر خوان پر پانی نہ پاتے۔ تو کسی سے مانگنے کی بجائے خود ہی جا کر گھڑے سے پانی لے لیتے۔

اگر گھر میں سے کوئی بیمار ہو جاتیں۔ تو ہر قسم کی تکالیف اور اخراجات برداشت کر کے انھیں بڑے شہروں میں بہترین طبی امداد پہنچانے کے لیے جاتے اور وہاں رہ کر ان کا علاج کراتے۔

ایک دفعہ بڑی اہلیہ صاحبہ چھت پر سے گر پڑیں۔ اس وقت حضرت خانقاہ میں فجر کی سنتیں پڑھ رہے تھے۔ اس دوران میں اطلاع ہوئی۔ چونکہ ایسی حالت میں نیت توڑ دینا شرعاً واجب ہے۔ اس لیے آپ نے فوراً نیت توڑ دی اور گھر تشریف لے جا کر ان کی تیمارداری فرمائی۔

غرضیکہ اگر آج ہر مرد اپنی بیوی یا بیویوں کے حقوق کی اس طرح حفاظت کرے تو عورتیں تعددِ ازدواج کے خدائی قانون کو ملکی اسمبلیوں کے ذریعہ منسوخ اور معطل کرانے کی کوششیں کیوں کریں۔ جو خاوندوں کے خلاف نہیں۔ خدا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے مترادف ہے۔

نوعیّتِ تعلقات

حضرتؒ کو بوجہ کثرت مشاغل دینیہ گھر میں تشریف لے جانے کے لیے بہت ہی کم وقت ملتا۔ لیکن بہت ہی التزام کے ساتھ تشریف لے جاتے۔ اگر کثرتِ کار کی وجہ سے مغرب سے ذرا قبل فارغ ہوتے۔ تو تب بھی دو چار منٹ کے لیے ضرور گھر تشریف لے جاتے اور کھڑے کھڑے دو تین باتیں کر کے واپس آجاتے۔ محترمات کو بھی چونکہ حضرت کے دینی مشاغل کا علم تھا۔ اس لیے اُنھوں نے کبھی حضرت کے زیادہ دیر مشغول رہنے کی شکایت نہیں فرمائی تھی اور جب حضرت گھر تشریف لاتے اور اہلیہ محترمہ کو کسی کام میں مشغول پاتے۔ تو ازراہِ لطف و بے تکلفی فرماتے کہ ہم تو دن بھر کے کام کے بعد تھکے تھکائے تھوڑی دیر کے لیے اپنے دماغ کو راحت دینے کی غرض سے تمھارے پاس آتے ہیں اور تم اس وقت بھی اپنے کام میں لگی رہتی ہو۔ بس حضرت کے اس فرمانے سے آپ کی سارے دن کی غیر حاضری کا ازالہ ہو جاتا۔

غرضیکہ حضرت جتنی دیر ہیں گھر رہتے۔ اتنی دیر تو اتنے بے تکلف اور ہشاش بشاش نظر آتے جیسے ان کی کل کائنات یہی یہی ہے مگر مخدومیّت کی شان قطعاً نہ جتاتے۔ لیکن تنبیہہ کے وقت برابر تنبیہہ فرمانے اور تنبیہہ کرنے میں قطعاً لحاظ نہ فرماتے۔ جب گھر سے نکل کر خانقاہ میں پہنچتے اور مشاغل دینیہ میں مصروف ہو جاتے۔ تو پھر ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی دنیا اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ لیکن ہر ایک کا حق ادا کرتے ہوئے بھی اپنے محبوبِ حقیقی کے تعلق میں سرِ مو فرق نہ آنے دیتے۔

خالہ کی خواہش

حضرت تھانویؒ کے قیام مکّہ معظمہ کے زمانہ میں آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ مع

اپنی خالہ صاحبہ کے وہیں پہنچ گئی تھیں۔ خالہ صاحبہ نے حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ سے حضرت والا کے متعلق عرض کیا کہ ان کے لیے صاحبِ اولاد ہونے کی دعا کیجئے۔ حضرت حاجی صاحب نے باہر آکر حضرت والا سے فرمایا کہ تمہاری خالہ مجھ سے دعا کے لیے کہتی ہیں کہ تمہارے اولاد ہو۔ سو دُعا تو میں نے کر دی ہے۔

آرزوئے شیخ

لیکن بھائی میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں۔ ویسے ہی تم بھی رہو جو حالت میری ہے۔ وہ حالت تمہاری بھی رہے؛" پھر دیر تک اس زمانہ کی اولاد کی خرابیاں بیان فرماتے رہے۔ حضرت تھانوی نے عرض کیا کہ جو حالت حضرت کو پسند ہو۔ وہی حالت میں بھی اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ یعنی بے اولاد رہنا۔ یہ سن کر حضرت حاجی صاحب بہت خوش ہوئے۔

اولاد

چنانچہ دوسرا عقد کر لینے کے بعد بھی حضرت کی کوئی اولاد نرینہ یا مادینہ نہ ہوئی۔ اور حق تعالیٰ نے آپ کو اولاد کے فتنہ سے بچا لیا۔ گو آپ صاحبِ اولاد نہ تھے مگر بچوں سے محبت اور مزاح خوب فرماتے تھے۔

جانشینی

جانشینی یا سجادہ نشینی محض ایک دنیوی رسم ہے۔ جسے محض ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے قائم رکھا جاتا ہے۔ ایک اور خاص مقام کو ہر حال میں آباد رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خواہ اسے آباد رکھنے والوں میں رشد و ہدایت کی اہلیت ہو یا نہ۔ حالانکہ شرعاً اس کا کہیں جواز موجود نہیں۔ اہل اللہ کے ہاں صرف اسی امر کو ترجیح دی جاتی ہے کہ جس میں تربیت و ارشاد کی صلاحیت

پاتے ہیں۔ اسے رشد وہدایت کی اجازت دے دیتے ہیں۔ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ جہاں چاہے بیٹھ کر خدمتِ دین انجام دے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ۱۸۵۷ء میں ہجرت کر کے مکّہ تشریف لے جانے کے بعد مدتوں تھانہ بھون کی خانقاہ خالی رہی۔ اگر حضرت حاجی صاحب یا ان کے خلفاء کے نزدیک جگہ کو کوئی اہمیّت حاصل ہوتی۔ تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی یا ان کے خلفاء اس گدی کو آباد رکھتے۔ جو ہر لحاظ سے آباد رکھنے کے اہل تھے۔ مگر کسی نے اس بدعت کو جاری نہ رکھا۔ جس کے نقصان حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "سجادہ نشینی" میں بتفصیل گنوائے ہیں۔ جو رسالہ تحفۃ الشیوخ کا ضمیمہ ہے اور ۱۳۳۷ھ میں تصنیف وطبع ہوا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد بھی بعض نافہموں نے یہ سوال اُٹھایا کہ حضرت اقدس کا جانشین کون ہوگا۔ حالانکہ جو شیخ کمالِ علم۔ کمال تقوٰی۔ کمال معرفت۔ کمال عشق اور کمالِ ارشاد بلکہ جملہ کمالات میں فرد۔ اپنے زمانہ کا مجدد۔ امام اور مرجع اہل علم و کمال و مشیخت ہو۔ اس کا جانشین کون ہو سکتا تھا۔ حضرت کی طرح ان کے خلفاء میں کوئی جامع الکمالات تو نہیں ہوا۔ لیکن آپ کا ہر مجاز آپ کی بعض بعض خصوصیات کا مظہر اتم ضرور ہے۔

مولانا عثمانی کا تجسس

چنانچہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اس سلسلہ میں حضرت والا رحؒ سے یہ سوال کیا کہ اپنے خدام یعنی منتبین میں سے سب سے زیادہ محبوب آپ کو کون ہے۔ اور یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر اس راز کو پوشیدہ رکھنے کے لیے حکم ہوگا۔ تو عمر بھر کسی پر ظاہر نہ کروں گا۔ اس پر حضرت رحؒ نے بے تکلف

تحریر فرمایا کہ:۔

"میں بتلانے میں کبھی پس و پیش نہ کرتا۔ اگر کوئی اس کا مصداق ہوتا۔ برخوردارِ من سچ بات تو یہ ہے کہ اب تک ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درونِ من بجست اسرارِ من

پوری مناسبت کسی کو نہیں ہوئی۔ اور اجنبیت کا مدار وہی ہے۔ ممکن ہے اس کا منشا میری ہی کمی ہو۔ بہر حال اس سوال کا جواب شائع نہ کیا جائے۔"

مولانا ظفر احمد صاحب کو بوجہ عزیز ہونے کے چونکہ رسوخ اور خصوصیت حاصل تھی۔ اور اس سوال کا محرک چونکہ ان کا تجسسِ اسرار تھا۔ اس لیے انھوں نے حضرت کی خدمت میں لکھا کہ:۔

"یہ جواب تربیت السالک میں نقل ہو جانا سالکین کے لیے زیادہ نافع معلوم ہوتا ہے۔ شاید کسی اللہ کے بندہ کو حضرت سے پوری مناسبت پیدا کرنے کا شوق پیدا ہو جائے۔ میری جو حالت اس جواب کو دیکھ کر ہوئی۔ واللہ میں کیا عرض کروں۔ سچ فرمایا کہ ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درونِ من بجست اسرار من

واللہ مجھے حضرت کے اسرار معلوم ہو جانے کی بہت طلب ہے اور یہی اس سوال کا منشا رہے۔ اگر اس نالائق کے ضبط و تحمل سے زیادہ اسرار نہ ہوں۔ تو خدا کرے مجھ کو معلوم ہو جائیں۔"

حضرت کی وضاحت

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس عریضہ کا یہ جواب لکھا۔

"عزیزم بہتر ہے۔ نقل کر دیا جائے۔ مجھ کو صرف یہ خیال مانع ہوا تھا۔ کہ احباب کی دل شکنی نہ ہو۔ باقی جب اس سے اہم مصلحت نقل میں ہے۔ تو موافقت کرتا ہوں۔ برخوردارِ من میرے اسرار ہی کیا ہیں۔ مولانا کا قوال تو میں نے تبرکاً نقل کر دیا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ میرے مذاق سے پوری مناسبت کسی نے پیدا نہیں کی۔ سو عزیزمن یہ بات کرنے کی نہیں۔ خود اہلِ محبت کا فعل تبع اور استحضار اور اتباع اس کا طریق ہے۔ واللہ الموفق۔ اور اس مناسبت کے بعد خود بخود مجھ کو اظہار اسرار کا جوش ہو گا: اگر کچھ اسرار ہوں گے۔ یا نئے پیدا ہو جائیں گے۔"

مقامِ اشرف

دراصل یہ اسرار حق تعالیٰ کی امانت ہوتے ہیں اور سوا اس کے فضلِ خاص کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتے ہیں اس کے فضلِ خاص کو متحرک کرنے کے لیے فنا ورضا کے مقام تک پہنچنا لازمی ہے۔ جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ثانیاً حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے جن کا خصوصی تعلق بھی رہا۔ وہ بھی زیادہ تر توجہ صرف اپنی ظاہری اور باطنی اصلاح کی طرف ہی مبذول رکھتے تھے۔ اور اسرار کا تجسس تو بہت آگے کی منزل تھی۔ ثالثاً ان کے معلوم ہو جانے سے یہ تھوڑا ہی تھا۔ کہ آئندہ کے لیے اتباعِ کتاب وسنّت کی منزلیں طے نہ کرنی پڑتیں۔ بلکہ ان کے معلوم ہو جانے میں اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر کسی وقت انسان تعلی

ہیں اگر کوئی راز فاش کر بیٹھے۔ تو ہمیشہ کے لیے مردود ہو جائے۔ رابعہ

ہے عقل و فہم سے بالا مقام حضرتِ والا
کوئی جانے۔ تو کیا جانے۔ کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کیونکہ حضرت تو اس کے مصداق تھے

وہ راز ہوں کہ جو عیاں ہو کے بھی عیاں نہ ہوا
وہ نکتہ ہوں جو بیاں ہو کے بھی بیاں نہ ہوا

حضرت تھانوی رح کے حقیقی بھتیجے اور منہ بولے بیٹے مولانا شبیر علی صاحب نے خانقاہ امدادیہ کے تمام انتظامی اُمور سنبھالنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اور انھیں حضرت تھانوی کی خواہش کے مطابق انجام دے کر ان کے دل میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ مگر انتظامی امور میں شب و روز مشغول رہنے کی وجہ سے وہ ان سے کما حقہ روحانی اور باطنی فیض حاصل نہ کر سکے جس کا حضرت تھانوی کو ازحد احساس تھا۔

اپنی زندگی کے آخری لمحات میں حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی صاحب کو بارہا طلب فرمایا مگر آپ کو ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ وہ سہارنپور دوائی لینے گئے ہیں۔ اگر کوئی بات انھیں کہنی یا سمجھانی ہو تو ہمیں تبلا دیجئے۔ ہم انھیں تبلا یا سمجھا دیں گے مگر حضرت تھانوی نے اصرار کے باوجود وہ بات تبلانے سے گریز فرمایا اور مولانا شبیر علی صاحب کی عدم موجودگی پر بار بار اظہار افسوس فرماتے رہے۔ آپ جس بے تابی سے مولانا شبیر علی کو طلب فرماتے اور جس حسرت سے انھیں موجود نہ پا کر افسوس فرماتے اس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ان کی خدمت کا معاوضہ اپنے بعض اسرار انھیں منتقل کر کے دینا چاہتے تھے مگر

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ آپ اپنے دل کی بات دل میں ہی لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور مولانا شبیر علی صاحب آپ کے انتقال کے بعد پہنچے۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حقیقی جانشین

حضرتؒ کے مجازین اپنے اپنے مقام پر حضرت کا چشمہ فیض جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر حضرت تھانوی کے حقیقی جانشین تو آپ کے ملفوظات وخطبات اور تصنیفات وتالیفات ہیں۔ جن سے قیامت تک رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اِہتمام سَفرِ آخرت

صفائی معاملات

حضرت تھانویؒ کے حالاتِ زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس امر میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ کی انتہا درجہ کی احتیاط۔ غایت درجہ کا ورع وتقویٰ۔ اعلیٰ درجہ کی صفائی معاملات صرف اس لیے تھی کہ آپ بقول ع

شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

ہر وقت اس بات کے اہتمام میں رہتے تھے کہ ان کی وجہ سے کسی معاملہ میں کسی قسم کی دوسرے کو الجھن نہ ہو اور عند اللہ مواخذہ نہ ہو آپ صرف اپنے

سوالات میرے پاس آرہے ہیں جو اب تک مسلم لیگ کے سرگرم اور حامی ممبر تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ لیگ جب خاکساروں سے تعاون کرتی ہے۔ تو اب مسلم لیگ میں رہنا جائز ہے یا نہیں؟ غرض ان خاکساروں سے ملنے کی وجہ سے بھی لیگ بدنام ہو رہی ہے۔ اور جو شخص اب لیگ کی جدید حمایت کرے گا۔ وہ بھی بدنام ہو گا۔ دوسری چیز لیگ والوں کا بلاکسی استثناء کے علماء کے وقار کو تباہ کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ اگر کانگرسی علماء سے بچایا جاتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اختلاف مسلک کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر بلاکسی استثناء کے علماء کے اثر کو مٹانے کی سعی کے معنی تو مذہب کو مٹانے کی سعی کرنا ہے۔ اور جو جماعت دین کو مٹانے کی فکر میں ہو۔ آپ ہی انصاف فرمائیں کہ اس سے میں کہاں تک تعاون کر سکتا ہوں۔

مجھے بھی افسوس ہے کہ مجھے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہے اور سر سکندر حیات خاں صاحب کے ارشاد کے بعد مجھے ایک ایسی تحریر لکھنا پڑی جو بظاہر خلاف تہذیب ہے۔ مگر مسلمانوں کی اصل تہذیب چونکہ دین ہے۔ اور دین کی خیر خواہی مجھے مجبور کرتی ہے۔ کہ ان حالات میں میں اس ارشاد کی تعمیل سے عذر کردوں۔ اس لیے مجھے اُمید ہے۔ وہ معاف فرمادیں گے۔ اور اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمادیں گے۔ تو شاید وقت آجائے۔ اور لیگ خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام پر عمل کرنا شروع کردے۔ تو میں لیگ کا ہر وقت خادم ہوں اخیر میں ایک دم تنزل کرکے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اور وزیر صاحب کی خدمت میں بھی عرض

حالات و معاملات کو ہی آئینہ کی طرح صاف و شفاف نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اپنے تربیت یافتوں کو بھی موت کا اس قدر استحضار کرا دیتے تھے۔ کہ دربارِ اشرفیہ کا اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ خادم خود کو ہر وقت موت کے لیے تیار اور اپنی زندگی کو حتی الوسع ہر طرح پاک صاف رکھتا تھا۔ اور جب تک اسے اس مقام تک نہ پہنچا دیتے تھے۔ چین نہ لیتے تھے۔ چنانچہ

۱۔ ایک بار چند طالب علموں نے خانقاہ میں مستقل قیام کرنا چاہا۔ تو دریافت فرمایا کہ کسی کے حقوق تو ذمہ نہیں اور جب معلوم ہوا کہ ہیں۔ تو فرمایا کہ پہلے جا کر ان کو اداءً یا ابراءً معاف کرا آؤ۔ چنانچہ ایک صاحب طالب نے جو غیر مستطیع تھے۔ تھانہ بھون سے الہ آباد تک کا لمبا سفر محض اس غرض سے پاپیادہ کیا اور بعد صفائی معاملات پاپیادہ ہی واپس آکر تھانہ بھون میں مقیم خانقاہ ہوئے۔ اور اخیر وقت تک مقیم رہے۔

۲۔ ایک بار ایک طالب علم اپنی بیوی کو جس سے اسے کوئی دل چسپی نہ تھی اور نہ وہ ادائے حقوق زوجیت پر قادر تھا۔ ایک بھائی کے گھر چھوڑ کر خانقاہ میں گیا۔ جب حضرت کو دریافت پر اس بات کا پتہ چلا تو آپ نے اسے فرمایا کہ ایسی حالت میں اس کو معلق نہ رکھا جائے اس کا تصفیہ کر کے اور اس سے یکسوئی حاصل کر کے آؤ۔ چنانچہ جب وہ اس کو طلاق دے کر آئے تو آپ نے اس کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔

۳۔ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں ایک ایسا غریب شخص آیا۔ جو کسی زمانہ میں چوری کی واردات کا مرتکب ہو چکا تھا۔ آپ نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے یہ شرط لگائی کہ پہلے سب سے معافی لکھوا کر آؤ۔ چنانچہ وہ سب سے معافی لکھوا کر لایا۔ ان معافی دہندگان میں ایک ایسا ہندو بنیا بھی تھا۔ جس کے اس نے ریل میں پانچ سو روپے چرائے تھے۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت تھانوی کی زیر تربیت آنا چاہتا ہے۔ اور نہ اب آئندہ

پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا طالب صادق ہے تو اس نے بھی اس عنوان سے معافی نامہ لکھ دیا کہ میں نے حسبتہً للہ معاف کیا۔ چنانچہ آپ نے طریق کے مطابق ان معافی ناموں کی تصدیق کرانے کے بعد اپنی تعلیم و تربیت سے اس چور کو متقی بنا دیا۔

یہ تو دوسروں سے معاملہ تھا۔ حضرت کی اپنی حالت اور عادت یہ تھی کہ اگر کبھی تھوڑا سا بھی مسجد کا گرم پانی وضو سے بچ جاتا تھا۔ تو آپ اس کو بھی سقاوہ میں ڈال آتے تھے تاکہ مسجد کا اتنا سا مال بھی ضائع نہ ہو۔ اس سے آپ کی احتیاط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

طریق وصیت

جب حضرت تھانوی اپنی حین حیات میں اس قدر محتاط تھے تو سفر آخرت کے سلسلہ میں اُنھوں نے کس قدر احتیاط سے کام لیا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ کے وصیت نامہ سے ہو سکتا ہے۔ جو کل من علیہا فان کی منزل سے گزرنے والے ہر مسافر کے لیے سرمایہ عبرت و بصیرت ہے اور جامعیت و ندرت کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت کا طریق وصیت یہ تھا کہ آپ نے بعد وفات پیش آنے والے واقعات کے متعلق تو ایک مفصل وصیت لکھ رکھی تھی۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے مگر چونکہ روزمرہ کے حالات میں تغیر و تبدل لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے منضبط کرنے کے لیے آپ نے وصیت نامہ کے محاذات میں اصل مضامین کے ہی مساوی خالی جگہ چھوڑ دی ہوتی تھی اور اس میں یومیہ حالات کے تقلبات کو منضبط کرتے رہتے تھے۔ اور جب کسی جزو کی ترمیم کی مقدار زیادہ ہو جاتی۔ تو اصل کو اس کی جگہ سے کاٹ کر بقیہ مضامین کے بعد مع لحاظ ترمیمات اس کو ایک مستقل نمبر بنا کر متن میں اس کی جگہ گوند وغیرہ سے چسپاں کر دیتے۔ اور اگر کوئی مستقل

نمبر بڑھانا ہوتا۔ تو اسے آخیر میں درج کر دیتے اور اس طرح آپ روز کا معاملہ روز ہی صاف کرتے رہے تا آنکہ سفر آخرت پیش آگیا۔

ان وصایا میں آپ نے اپنے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کو وصی بنایا اور ان کے لیے یہ دو مشورے درج وصیت نامہ کیے۔

۱۔ ان وصایا کی تنقید کے وقت کسی متدین خوش فہم عالم کو بھی شریک کر لیں۔

۲۔ تنبیہات وصیت مدرسہ سے یا کہیں اور سے لے کر اور اس کے تتمات میرے ڈیکس میں سے نکال کر ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ اور ان میں جو وصایا مقتضائے وقت ہوں ان کو بھی عمل یا ان کا اعلان خاص یا عام کیا جائے اور ان کے کسی جزو میں اگر تعارض ہو اخیر پر عمل کیا جائے۔ جس کی تعیین تاریخ کتابت سے ہو جائے گی۔

کتبہ اشرف علی۔ آغاز محرم ۱۳۴۶ھ

اثاثیث البیت کے متعلق وصیت

اثاثیث البیت کے متعلق وصیت اشرف السوانح جلد سوم میں صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۷ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں آپ نے اپنی مملوکہ۔ غیر مملوکہ اشیاء اور وقف جائداد کی فہرست وغیرہ اسی تفصیل سے دی ہے، جیسی مملکت اسلامیہ جمہوریہ کا محکمہ تشخیص موت ٹیکس (اسٹیٹ پراپرٹی ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۰ء) کی رُو سے کسی لاکھ پتی کے مرنے پر طلب کرتا ہے۔ یعنی جس تفصیل سے متوفی کی جائداد کی فہرست پیش کرنے کا مذکورہ بالا ایکٹ ۱۹۵۰ء تقاضا کرتا ہے۔ وہی تفصیل قانون کے خوف سے نہیں۔ خدا کے خوف سے آپ نے خود بخود اپنے وصیت نامہ میں درج کر دی تھی۔ جس سے ظاہر ہے کہ اگر طبائع میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔ تو قانون سازی کا کام بالکل برائے نام رہ جائے۔

اہل حقوق کو وصیّت

حضرت تھانوی اپنے مذکورہ بالا وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"میرے بعد اخلاق سئیہ کے سبب بعض بندگانِ خدا کو حاضرانہ وغائبانہ میری زبان اور ہاتھ سے کچھ کلفتیں پہنچی ہیں۔ اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں۔ خواہ اہل حقوق کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ میں نہایت عاجزی سے سب چھوٹے بڑوں سے استدعا کرتا ہوں کہ للہ دل سے معاف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تقصیرات سے درگزر فرمادیں گے۔ میں بھی ان کے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دارین میں عفو و عافیت عطا فرمادیں۔ معذرت کرنے والے کی تقصیر سے درگزر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اور اگر معاف کرنے کی ہمت نہ ہو تو حسبِ فتویٰ شرعی مجھ سے عوض لے لیں۔ خدا کے لیے قیامت پر مواخذہ نہ رکھیں کہ اس کا کسی طرح تحمل نہیں۔

اس قبیل کی کوتاہیاں جو دوسروں سے میرے حق میں ہو گئی ہوں۔ میں بطیب خاطر گزشتہ اور آئندہ کے لیے محض خدا تعالیٰ کے راضی کرنے کو اور اپنی خطاؤں کی معافی کی توقع پر وہ سب معاف کرتا ہوں۔"

علماء و طلباء کو وصیّت

"جو مدرسہ دینیہ فی الحال یہاں میرے تعلّق میں جاری ہے۔ وہ ایک خاص شان کا مدرسہ ہے۔ جس کی تفصیل ضروری میرے

میرے مشفق مولوی عبداللہ صاحب کی تحریر مسمی بہ ظل صفحہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ میرا دل یوں چاہتا ہے کہ میرے بعد بھی اس کے ابقاء کی طرف توجہ رکھی جائے۔ اور خدا تعالیٰ اس مدرسہ کی خدمت کی جس کو توفیق دے تو وہ اس کے طرز کو جس کا مہتم بالشان جزو تربیتِ اخلاق و اصلاحِ نفس ہے نہ بدلے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی میں بہت خیر و برکت کی اُمید ہے۔

دینی یا دنیوی مضرتوں پر نظر کر کے ان اُمور سے خصوصیت کے ساتھ احتیاط رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں کہ

۱۔ شہوت و غضب کے مقتضا پر عمل نہ کریں۔

۲۔ تعجیل نہایت بری چیز ہے۔

۳۔ بے مشورہ کوئی کام نہ کریں۔

۴۔ غیبت قطعاً چھوڑ دیں۔

۵۔ کثرتِ کلام اگرچہ مباح کے ساتھ ہو۔ اور کثرتِ اختلاط بلا ضرورت شدیدہ و بلا مصلحت مطلوبہ اور خصوصاً جبکہ دوستی کے درجہ تک پہنچ جائے۔ بالخصوص جبکہ ہر کس و ناکس کو راز دار بنا لیا جاوے۔ نہایت مضر چیز ہے۔

۶۔ بدوں پوری رغبت کے کھانا ہرگز نہ کھاویں۔

۷۔ بدوں سخت تقاضا کے ہم بستر نہ ہوں۔

۸۔ بدوں سخت حاجت کے قرض نہ لیں۔

۹۔ فضول خرچی کے پاس نہ جائیں۔

۱۰۔ غیر ضروری سامان جمع نہ کریں۔

۱۱۔ سخت مزاجی و تند خوئی کی عادت نہ کریں۔ رفق اور ضبط و

تحمل کو اپنا شعار بنا دیں۔

۱۲۔ زیادہ تکلف سے بہت بچیں۔ اقوال و افعال میں بھی طعام و لباس میں بھی۔

۱۳۔ مقتداء کو چاہیئے کہ اُمراء سے بدخلقی نہ کرے اور نہ زیادہ اختلاط کرے۔ اور ان کو حتی الامکان مقصود بنا دے۔ بالخصوص دنیوی نفع حاصل کرنے کے لیے۔

۱۴۔ معاملات کی صفائی کو دیانات سے بھی زیادہ مہتم بالشان سمجھیں۔

۱۵۔ روایات و حکایات میں بے انتہا احتیاط کریں۔ اس میں بڑے بڑے دین دار اور فہیم لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں خواہ سمجھنے میں یا نقل کرنے میں۔

۱۶۔ بلاضرورت بالکلیہ اور ضرورت میں بلا اجازت و تجویز طبیب حاذق مشفق کے کسی قسم کی دوا ہرگز استعمال نہ کریں۔

۱۷۔ زبان کی غایت درجہ ہر قسم کی معصیت و لایعنی سے احتیاط رکھیں۔

۱۸۔ حق پرست رہیں۔ اپنے قول پر جمود نہ کریں۔

۱۹۔ تعلقات نہ بڑھائیں۔

۲۰۔ کسی کے دنیوی معاملہ میں دخل نہ دیں۔

طالب علموں کو وصیت کرتا ہوں کہ نرے درس و تدریس پر مغرور نہ ہوں۔ اس کا کار آمد ہونا اہل اللہ کی خدمت و صحبت و نظر عنایت پر موقوف ہے۔ اس کا التزام نہایت اہتمام سے رکھیں۔

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق"

دوستوں کو وصیّت

"میں اپنے سب دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے سب معاصی صغیرہ وکبیرہ عمد وخطا کے لیے استغفار فرمادیں۔ اور میرے اندر جو عادات و اخلاق ذمیمہ ہیں۔ ان کے ازالہ کے لیے دُعا کریں۔

میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اور اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرض عین ہے۔ خواہ بذریعہ کتاب ہو یا بذریعہ صحبت۔ بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتنہ دینیہ سے حفاظت ہو سکے۔ جن کی آج کل بہت کثرت ہے۔ اس میں ہرگز غفلت یا کوتاہی نہ کریں۔"

منتسبین کو وصیّت

"میں اپنے تمام منتسبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی عمر بھر یاد کر کے سورۂ یٰسین شریف۔ تین بار قل ھو اللہ شریف پڑھ کر مجھ کو بخش دیا کرے۔ مگر اور کوئی امر خلافِ سنت و بدعات عوام و خواص میں سے نہ کریں۔

میرے ایصال ثواب کے لیے کوئی جمع نہ ہوں۔ نہ اہتمام سے نہ بلا اہتمام۔ اگر کسی دوسرے اتفاق سے بھی جمع ہو جائیں تو تلاوت وغیرہ کے وقت قصداً متفرق ہو جائیں اور ہر شخص منفرداً بطور خود جس کا دل چاہے دعا و صدقہ و عبادت نافلہ سے نفع پہنچا دے۔ نیز میری مستعمل چیزوں کے ساتھ متعارف طریق سے تبرکات کا سا معاملہ نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی محبت سے شرعی طریق سے اس کا مالک بن کر مخفی طور پر اپنے پاس رکھے تو مضائقہ نہیں۔ اس کا اعلان اور دوسرں

دکھلانے کا اہتمام نہ کیا جاوے۔

حتی الامکان دنیا و مافیہا سے جی نہ لگاویں اور کسی وقت فکر آخرت سے غافل نہ ہوں ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگر اُسی وقت پیام اجل آجاوے۔ تو فکر اس تمنا کا مقتضی نہ ہو۔ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ اور ہر وقت یہ سمجھیں کہ ع

شاید ہمیں نفس۔ نفسِ واپسیں بود

اور علی الدوام دن کے گناہوں سے قبل رات کے اور رات کے گناہوں سے قبل دن کے استغفار کرتے رہیں اور حتی الوسع حقوق العباد سے سبکدوش رہیں۔"

قرض کے متعلق وصیت

"خدا تعالیٰ کے فضل سے اس وقت میرے ذمہ بالکل کسی کا قرض نہیں اور حق تعالیٰ کا جو معاملہ فضل اس ناکارہ کے ساتھ ہے۔ اس سے اُمید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اس سے محفوظ رہے گا۔ اور اگر اتفاق ہوا یا کسی کی امانت میرے پاس ہوئی۔ تو اس کی یادداشت زبانی یا تحریری ظاہر کر دی جائے گی۔ اس کے ضمن میں یہ امر بھی قابل اطلاع ہے کہ مہر اہلیہ کا بھی ادا کر چکا ہوں۔ مکان مسکونہ اور بعض دیگر اموال ملا کر یہ سب مہر میں دے دیا۔ اس وقت وہ مکان خالص ان کی ملک ہے۔ وہ اس میں جو چاہیں تصرف کریں۔ اسی طرح اثاث البیت اکثر ان کی ملک ہے اور بعض جو مشترک یا خاص میری ملک ہے وہ ہم دونوں کو یاد ہے۔ ہر ایک کا قول اس میں انشاء اللہ تعالیٰ

قابل تصدیق ہے۔

میرے ذمہ جو کسی کا دین (امانت وغیرہ) ہے۔ یا اوروں کے ذمہ میرا دین ہے۔ اس کی تفصیل میرے ڈیکس کے ایک دراز میں ایک کرمچ کے بٹوہ میں ہے۔ اور کبھی مکان خورد کے کمرہ خورد کی الماری میں چوبی صندوقچہ میں بھی رکھ دی جاتی ہے۔ اور احتیاطاً سیاہ جلد والی بیاض میں بھی تلاش کر لیا جاوے اس بیاض میں بعضی اور سرخیاں بھی نظر آویں گی۔ ان کا وصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ ایک سُرخی ملے گی۔ حساب طعام خانہ۔ اس کا مفہوم وہ خرچ ہے جو اپنے کھانے کی بابت گھروں میں دیتا ہوں۔ ان سے پوچھ لیا جاوے کہ ان کا کچھ باقی ہے یا میرا کچھ نکلتا ہے۔ وہ دین کی فرد ہے۔"

امانات کے متعلق وصیت

امانات کی تھیلیوں یا لفافوں میں جو کہ میری ملک ہیں۔ اہل امانات کے نام اور پتے اور کچھ یادداشتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان پتوں پر ان لوگوں کو مع ان یادداشتوں کے بذریعہ خط و رجسٹری کے اطلاع کی جاوے اس اطلاع میں جو صرف ہوگا۔ وہ میرے ترکہ سے خرچ کیا جائے۔ اگر کوئی صاحب امانت زندہ نہ ہوں۔ تو ان کے ورثہ کو اس طرح اطلاع کی جاوے۔ مگر نابالغ کا حصہ ہر حال میں ان کو ہی پہنچایا جائے۔ اگر کسی کا جواب نہ آئے۔ تو علماء سے حکم شرعی پوچھ کر اس پر عمل کیا جاوے۔ اور تحقیق ورثہ میں بھی اس پر اسی مد اطلاع سے یعنی میرے ترکہ سے صرف ہوگا اور جس میں کچھ لکھا ہوا نہ ملے یا لفظ ذاتی لکھا ہوا ملے۔ وہ میری ملک ہے اور شامل ترکہ ہے۔ اور شاید کسی تھیلی میں لفظ حساب مشترک لکھا ہوا پایا جاوے۔ یہ وہ

رقم ہے۔ جس کو میں ہر مہینہ کے ختم پر گھروں میں تقسیم کر دیتا تھا مگر قبل تقسیم وہ میری ہے۔ اس میں تقسیم نہ ہوگی۔ البتہ ربع اس کا بھی نکال کر اس رقم میں شامل کر لیا جائے گا۔ جو اصل ترکہ سے بقدر ربع بعد وضع اخراجات تجہیز و تکفین وادائے دین امانات وغیرہ کی واپسی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس تھیلی میں اگر کسی اہلیہ کے نام پر کوئی رقم جمع شدہ نظر آوے۔ وہ ان کو تملیکاً بہ توقع دوسری کو مساوی کر دینے کے دی گئی ہے۔ مگر نہ وہ ان سے واپس لی جاوے۔ نہ دوسری کو عدل کے واسطے اتنی دی جاوے۔ کیونکہ عدل واجب حیات کے ساتھ منقطع ہو چکا ہے۔ اور نیّت کے سبب عدم عدل کا مواخذہ بھی نہ ہوگا۔ البتہ اگر ایک کو حالت یاس میں دنیا حجتہ شرعیہ سے ثابت ہو جاوے۔ تو وہ واپس کر لیا جاوے۔

کتب خانہ کے متعلق وصیّت

"میرے کتب خانہ میں ہر قسم کی اور بعض دوسرے فرقوں کی بھی کتابیں بلا میرے قصد کے جمع ہو گئی ہیں۔ سو محض ان کے کتب خانہ میں ہونے سے سب کی صحت مضامین کا شبہ نہ کیا جاوے۔ جو کتاب یا جو مضمون قواعد شرعیہ کے خلاف ہو اس کو باطل سمجھا جاوے۔

مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں جو کتب احقر کے آنے سے پہلے کی ہیں۔ ان کو مع ان کی فہرست کے جدا رکھا گیا ہے اور جو کتب میری معرفت آئی ہیں۔ وہ مع فہرست جدا ہیں۔ اور واقفین نے ان کے نقل وغیرہ کا مجھ کو پورا اختیار دیا ہے۔ اس لیے میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت یہاں ان سے انتفاع نہ

ہو سکے۔ تو مدرسہ دیوبند میں ان کو منتقل کر دیا جائے۔"

تالیفات کے متعلق وصیت

تالیفات کے بعض مقامات مجھ سے اختصار موہم یا زیادت موہمہ یا غفلت سے کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں۔ جو اس وقت ذہن میں حاضر ہیں۔ ان کی اطلاع جزئی طور پر دیتا ہوں۔ اور جو اس وقت ذہن میں حاضر نہیں ان کے لیے دو قاعدے عرض کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ میری کسی ایسی تصنیف میں جو اس محل لغزش سے متاثر ہو۔ اس کی اصلاح کر دی گئی ہو۔ اور متاخر ہونا تاریخ کے ملانے سے جو کہ ہر تصنیف کے کے آخر میں التزاماً لکھی گئی ہے۔ معلوم ہو سکتا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم کر لینا چاہیئے کہ میری تالیفات میں جو مضمون متعارض ہو۔ اس میں اخیر کا قول میرا سمجھا جائے۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مشتبہ کو دوسرے علماء محققین سے تحقیق کر لیا جاوے۔ اور ان کے قول کو میرے قول پر ترجیح دی جاوے۔ اس طرح اگر میرا لکھا کوئی مشتبہ فتویٰ کسی کی نظر سے گزرے۔ اس میں بھی یہی تقریر معروض ہے۔ کیونکہ بعض اوقات لکھنے کے بعد خود مجھ کو بعض جوابوں کا غلط ہونا محقق ہوا ہے۔ میں نے سائل کا پتہ معلوم ہونے پر اس کو مطلع بھی کر دیا۔ لیکن پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں یا اس سائل کے پاس میری تصحیح کے محفوظ نہ رہنے کی تقدیر پر احتمال غلطی میں پڑنے کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے احتیاطاً یہ عرض کیا گیا۔ اب اوّل جزئی غلطیوں کے مقامات کو نقل کرتا ہوں۔

مقام اوّل۔ "بہشتی زیور" میں عشاء کے بعد چار سنتیں لکھ دی ہیں صحیح یہ ہے کہ دو سنت ہیں اور دو نفل۔

مقام دوم۔ بہشتی زیور میں ایام بیض ۱۲-۱۳-۱۴ تاریخوں کو لکھ دیا ہے صحیح ۱۳-۱۴-۱۵ ہیں۔

مقام سوم۔ تعلیم الدین و بہشتی زیور میں تیجے چالیسویں وغیرہ کے بدعت کے ہونے کے ذکر میں یہ لفظ لکھا گیا ہے۔ ضروری سمجھ کر کرنا اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید غیر ضروری سمجھ کر کرنا جائز ہو۔ سو یہ قید واقعی تھی۔ احترازی نہ تھی۔ حکم یہ ہے کہ خواہ کسی طرح سے کرے بدعت ہے۔

مقام چہارم۔ "تعلیم الدین" میں قبروں پر چراغ جلانے کے بارہ میں یہ لفظ لکھا گیا ہے "کثرت سے چراغ جلانا" اس میں بھی مثل مقام سوم کے سمجھنا چاہیئے۔ حکم یہ ہے کہ ایک چراغ رکھنا بھی بدعت ہے۔

مقام پنجم۔ تعلیم الدین میں روپیہ کے پیسے ادھار لینے کو مطلقاً منع لکھ دیا ہے۔ اور واقع میں اس حکم میں تفصیل ہے۔ اگر عقد میں پورے پیسے ٹھہرے ہوں۔ دونی چونی وغیرہ نہ ٹھہری ہوں۔ اور عاقد کے پاس مبادلہ کے وقت پیسے پورے موجود بھی ہوں۔ لیکن کسی وجہ سے اس وقت قبضہ نہیں کرایا۔ تب تو جائز ہے۔ اور اگر ایک شرط بھی مفقود ہو تو ناجائز ہے۔ چونکہ عام لوگ ان دونوں شرطوں کا لحاظ نہیں کرتے اس لیے انتظاماً علی الاطلاق منع کر دیا گیا ہے۔

مقام ششم۔ "شوق وطن" گیارھویں کتاب صفحہ ۲۳ میں ایک حدیث میں بوجہ غلطی نسخہ کے لم یؤمن لکھا گیا ہے۔ اور دوسرے کالم میں اس بناء پر ترجمہ بھی غلط ہو گیا۔ صحیح متن لم یوص ہے اور ترجمہ یہ ہونا چاہیئے۔ جو شخص (باوجود ایسے حقوق متعلق ہونے کے جن میں وصیت کرنا واجب ہو) وصیت نہ کر جائے۔ اس کو مردوں کے

ساتھ کلام کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ الخ

مقام ہفتم۔ یادگار دربار پر انوار کے بالکل آخر میں ایک مضمون از قبیل عملیات لکھا ہے وہ کسی بزرگ سے منقول نہیں۔ ایک صاحب کانپوری کاتبِ مضمون نے بہ نیت نفع وہاں کے مدرسہ کی ایک تاویل سے ایسا لکھ دیا ہے۔ اس لیے اس عمل کو منقول سمجھ کر استعمال نہ کریں۔ نیز اس کی ترکیب بھی بلا تکلف قواعد سنت پر منطبق نہیں ہوتی۔

"فروع الایمان" میں ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ اگر پابندی احکام کے ساتھ ڈپٹی کلکٹری یا بیرسٹری وغیرہ اختیار کرد۔ تو چشم ماروشن دلِ ماشاد انتہی۔ اس سے بظاہر شبہ ان اعمال کے جواز کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مقصود اس عبارت سے یہ ہے کہ اگر پابندی احکام کے ساتھ ترقی دنیوی ہو۔ تو اجازت ہے۔ یہ مثالیں خود مقصود نہیں کیونکہ ان اعمال کا مشروع ہونا نہ ہونا محتاج تفصیل مستقل ہے۔ البتہ ان مثالوں کو ارخاء عنان و تسامح پر محمول کرنا چاہیئے۔ اور ان کے جواز علی الاطلاق کا شبہ نہ کرنا چاہیئے۔

میری تحریرات میں جو مضامین از قبیل علوم مکاشفہ ہیں۔ جو کہ علم تصوف کی ایک قسم ہے۔ جس کو حقائق و معارف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور حجج شرعیہ ان سے ساکت ہیں۔ ان کو حسب قاعدہ اصولیہ وکلامیہ امور ثابتہ بدلائل شرعیہ کے درجہ میں نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ بالکل اعتقاد نہ رکھنا بھی جائز ہے۔ اور اگر اعتقاد رکھے۔ تو محض احتمال کے درجے سے تجاوز نہ کرے۔"

اصلاح مسودات کے متعلق وصیت

مولوی ظفر احمد (عثمانی) کو وصیت کرتا ہوں کہ جو مواعظ میری نظر

اصلاحی سے رہ جائیں۔ بشرطیکہ مولوی شبیر علی یا خواجہ عزیز الحسن یا حکیم محمد مصطفٰے یا اور جو ان کی نظر میں صالح للاعانت ہوں۔ ان کی معیت میں ان پر منجانب مجلس نظر اصلاحی کر لیں۔“

غیر مکمل مسوّدات کی تکمیل کے متعلق وصیّت

”جو مضمون میری طرف منسوب ہے۔ وہ بدوں میری نظر ثانی کے جس کی علامت جا بجا میرا بنانا ہے۔ جس کو میرا خط پہچاننے والے جان سکتے ہیں۔ اور مدت سے یہ بھی التزام ہے کہ اخیر میں یہ عبارت کہ معائنہ کردہ شد“ لکھ کر دستخط کر دیتا ہوں۔ بسبب احتمال غلطی نقل کر کے میری طرف منسوب نہ کیا جاوے۔ (۲) ایسے غیر مکمل مضامین کی تکمیل بشرط امکان مولوی حبیب احمد صاحب و مولوی شبیر علی صاحب و مولوی ظفر احمد و مولوی حکیم محمد مصطفٰے صاحب اور صرف صفائی مواعظ میں خواجہ عزیز الحسن صاحب سے یا جس کو یہ سب منتخب کریں۔ کرائی جاوے۔ اور مسودہ اجمالیہ کی اگر تسوید تفصیلی میں تکلف معلوم ہو۔ تو ان کو بصورت ملفوظات ہی صاف کر لیں۔ (۳) اور اس صورت میں اس مضمون کی نسبت اس تکمیل کنندہ کی طرف کی جاوے اور تکمیل کنندہ کی ہر طرح کی اصلاح میں پورا اختیار ہے۔“

مکرر تحقیق تالیفات کے متعلق وصیّت

”یہ سب مضامین میں اہم ہے۔ ضمیمہ تتمہ خامسہ تنبیہات کے مضمون ثانی میں بذیل نمبر ۲، ۷ ایک کتاب کا نام لکھا ہے۔ تصحیح الاغلاط۔ جس کی نسبت (لفظ) زیر تحریر لکھا ہے۔ اب بفضلہٖ تعالیٰ اس کا کام جاری ہو گیا ہے۔ حقیقت اس کتاب کی یہ ہے

کہ مجھ کو اپنے فہم یا تحقیق پر وثوق تو کبھی نہیں ہوا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھ اتنی بدگمانی بھی نہ تھی۔ کہ از خود اپنی زلات و اغلاط کی تفتیش کا اہتمام کرتا۔ البتہ اگر اتفاقاً کسی نے کسی غلطی کی اطلاع دی۔ بحمد اللہ فوراً رجوع کر لیا۔ اور کسی نہ کسی موقع پر اس کو شائع کر دیا چنانچہ میری تحریرات سے یہ بات ظاہر ہے خصوص امداد الفتاویٰ کے بعض حصص کے آخر میں ایک طویل فہرست بھی اس کی ملحق ہے یہ ایک دور ہے۔

پھر جب ان تنبیہات کی تعداد معتد بہ ہو گئی۔ تو مصلحت معلوم ہوئی۔ کہ اس کا ایک مستقل سلسلہ جاری رکھا جائے۔ چنانچہ ترجیح الراجح کی یہی حقیقت ہے۔ جس کا اس سنہ میں حصہ رابع ہو رہا ہے۔ اور یہ دوسرا دور ہے۔ پھر خیال یہ ہوا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر لغزش پہ کوئی نہ کوئی متنبہ بھی کر دیا کرے۔ تو اس صورت میں بہت زلات اصلاح سے رہ جاویں گے۔ اس لیے اس کا یہ اہتمام کیا گیا کہ اہلِ علم میں سے ایسے متدین و معتمد علماً و عملاً حضرات کو جو نہ میری رعایت کریں اور نہ خواہ مخواہ کا عناد کریں۔ اپنی تمام مؤلفات پر نظر ثانی کرنے کے لیے منتخب کر کے ان کو یہ کام سپرد کر دیا گیا۔ کہ ایسے مواقع پر پوری تحقیق اور آزادی سے کام لے کر ایسے زلات کی تصحیح فرما دیں۔ چنانچہ نہایت خوبی سے یہ کام ہو رہا ہے اور حقیقت اس کتاب کی یہی ہے۔ اور یہ تیسرا دور ہے۔

میری وصیت یہ ہے کہ اگر میرے سامنے یہ کام مکمل نہ ہو۔ تو میرے بعد بھی اس کو جاری رکھیں۔ اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل و اشاعت کو سہل فرما دیں۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین علی اللہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ اجمعین ''

تنقید متعلق مؤلفات خود

"یوں تو اپنے جمیع مؤلفات کے متعلق احتیاطاً مشورہ دیتا ہوں کہ دوسرے محققین علماء سے ان کی تنقید کراکر عمل کریں۔ مگر بعض مؤلفات کی نسبت خصوصیت سے کچھ تنبیہات کرتا ہوں۔

۱۔ انوار الوجود کو عام لوگ نہ دیکھیں اور خواص بھی ان کو صرف ذوقیات ولطائف کے درجہ سے آگے نہ بڑھادیں۔

۲۔ نیل الشفاء کے متعلق النور نمبر ۹ جلد ۳ میں ایک تنبیہ شائع ہوئی ہے۔ اس کے خلاف نہ کریں۔

۳۔ فیصلہ ہفت مسئلہ کے متعلق تنبیہات وصیت کی تنبیہ وھم واجب العمل ہے۔

۴۔ بہشتی زیور وگوہر وامداد الفتاویٰ مع تتمات اور حوادث کے ساتھ ترجیح الراجح کا ضرور مطالعہ فرمادیں کہ اس میں بہت سے مقامات کی اصلاح ہے۔ اور مکمل دلائل بہشتی زیور و گوہر کی طبع میں مولوی شبیر علی نے ان ضروری اصلاحات کو لیا بھی ہے۔

۵۔ جمال القرآن میں متعدد تسامحات ہو گئے ہیں۔ اب اصلاح کے بعد مولوی شبیر علی اس کو مکرر شائع کرنے والے ہیں۔ اس کو مکمل سمجھیں۔

۶۔ نصح الاخوان کے بعض مضامین میں بھی بعض علماء نے بعض عبارات کے اعمال یا ابہام کے سبب اختلاف کیا ہے۔ کسی محقق سے سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور اختلاف میں جو حق ثابت ہو اس کا اتباع کریں۔

۷. مسائل اہل الخلہ میں میری آخری تحریر کو قولِ فیصل نہ سمجھیں۔ مستقل تحقیق کر لیں۔

آخر دُعا ہے کہ حق تعالیٰ میری خطا و عمد کو معاف فرماویں۔ اور میری تقریرات وتحریرات کو اضلال کا سبب نہ بنادیں۔"

سوانح حیات کے متعلق وصیت

چونکہ محبت میں اکثر مدائح غیر واقعیہ مشہور کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لیے میں اپنی سوانح کا لکھا جانا پسند نہیں کرتا۔ اگر کسی کو بہت ہی بے تابی کا شوق ہو۔ اور دوسرے اہل تدین و تحقیق بھی اجازت دیں تو روایت میں احتیاطِ شدید کو واجب سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ میں بری ہوتا ہوں۔

خطوط کے متعلق وصیت

"میرے بعد میرے نام کے خطوط خواہ لفافے ہوں۔ یا کارڈ جوابی ہوں یا غیر جوابی اسی طرح منی آرڈر بھی وصول نہ کیے جاویں۔ بلکہ ان پر کیفیت لکھ کر واپس کر دیئے جاویں۔ البتہ اگر کسی منی آرڈر کو بن سے مدرسہ کا معلوم ہو تو ڈاک والے اگر وعدہ کریں کہ مرسل کا خط دیکھ کر ہم دے دیں گے۔ تب تو جس قدر قانوناً گنجائش ہو۔ ڈاکخانہ میں امانت رکھا کر مرسل کے پاس خط بھیج کر دریافت کر لیا جاوے اور اس کا خط کا محصول میرے اس ربع سے دیا جائے۔ جو ترکہ میں سے اس غرض کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ پھر وہ خط اہل ڈاک کو دکھلا کر منی آرڈر وصول کر لیا جائے۔ اور اگر اس طرح وصول کرنا خلافِ قواعد ڈاکخانہ کے ہو۔ تو ابتدا ہی سے واپس کر دیا جائے۔"

اجازت یافتگان کے متعلق وصیّت

"میں نے مختلف اوقات میں جن صاحبوں کو بیعت لینے اور تعلیم و تلقین کی اجازت دی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات اگرچہ وہ قلیل ہی ہیں مجھ سے خط و کتابت اس قدر کم رکھتے ہیں کہ وہ ان کے موجودہ حالات کے اندازہ کرنے کے لیے کافی نہیں اور اجازت کی حالت کا دکہ ان کا حاصل حالاً درستی اور بنا بر مناسبت مآلاً توقع رسوخ ہے متغیر ہو جانا کچھ مستبعد نہیں۔ فان الحی لا تومن علیہ الفتنۃ بلکہ یہ احتمال بعد راسخ ہو جانے کے بھی محال نہیں۔ اگرچہ نادر بحکم معدوم ہے کیونکہ رسوخ واقعی کا جس میں تغیر عادۃً محال ہے۔ علم قطعی کس کو ہو سکتا ہے اور ظن کی خود حقیقت منجانب مخالف کے محتمل ہونے کو بتلا رہی ہے۔ اس لیے احتیاطاً سب مجازین کے متعلق بالخصوص مکاتبت نہ رکھنے والوں کے بارہ میں یہ عرض عام ہے کہ ان سے رجوع کرنے میں محض میری اجازت پر اعتماد نہ رکھیں۔ بلکہ جو علامات احقر نے "تعلیم الدین" میں صاحب کمال کی لکھی ہیں۔ ان پر منطبق کر کے عمل کریں۔ میں اپنے بعد اس کا بار نہیں رکھنا چاہتا۔

چونکہ بعض کے حالات ہی معلوم نہیں ہوتے۔ اور بعض کے حالات مشتبہ سننے میں آتے ہیں۔ اس لیے احتیاطی انتخاب کے بعد مجازین کی ایک مستقل فہرست تجویز کرتا ہوں۔ ان کے سوا اوروں کو فی الحال مجاز نہ سمجھا جائے۔ البتہ اگر کسی کا حال قابل اطمینان ثابت ہو گا اس کا نام از سر نو درج کیا جاوے گا۔ بقیہ اوروں کو مجاز نہ سمجھنا ان کی صلاحیت کی نفی نہیں۔ میرے علم صلاحیت کی نفی ہے۔ یعنی ان کے قابل اجازت ہونے کی مجھ کو تحقیق نہیں۔"

وصیّت متعلق معاش اہل علم

"چونکہ ظاہر بینوں کو اہل علم پر شبہ دین فروشی کا ہو جاتا ہے اس لیے مدّت سے خیال تھا کہ اہل علم کو کچھ حلال صنعتیں و حرفتیں بھی سیکھ لینا چاہئیے۔ تاکہ اگر توکل کے ساتھ دین کی خدمت نہ کر سکیں۔ تو ان ذرائع سے اکتساب معاش کر کے اپنی اور دین کی آبرو محفوظ رکھ سکیں۔ ذیل میں ایک فہرست ان ذرائع کی مع ان ماہرین کے نام و نشان کے دی جاتی ہے۔ جنھوں نے خلوص کے ساتھ ان کی تعلیم کر دینے کا صراحتہً دلالتہً وعدہ فرمایا ہے۔

۱۔ مدرسی مدارس اسلامیہ ۲۔ زراعت حاجی عزیز الرحمٰن صاحب اچولی ضلع میرٹھ ۳۔ طب مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب میرٹھ محلہ کرم علی ۴۔ بیگ سازی و چمڑا سازی مینجر کارخانہ ٹینری و مولوی عبدالحلیم صاحب ۵۔ گھڑی سازی حافظ عبدالرزاق صاحب نصیر واچ کمپنی میرٹھ صدر بازار ۶۔ کتابت و چھپائی منشی محبوب علی صاحب مطبع نامی میرٹھ ۷۔ تجارت کتب محمد عثمان خاں صاحب تاجر کتب دریبہ کلاں دہلی ۸۔ صابون سازی میر معصوم علی نا روے سوپ کمپنی خیر نگر دروازہ میرٹھ ۹۔ حدادی ۱۰۔ نجاری مستری محمد صدیق کیرانہ ضلع مظفر نگر ۱۱۔ بیڑی سازی ۱۲۔ خیاطت سلیمان پوسٹ مین گڈی پختہ ضلع مظفر نگر ۱۳۔ صحافی یعنی بندی۔ ۱۴۔ ٹین سازی۔ ۱۵۔ ملازمت اسکول ہائے سرکاری بذریعہ امتحان مولوی فاضل وغیرہ"

بھلا اب یہ احتیاط و اہتمام کہاں۔ اس کی نظیر تو عہدِ متاخرین میں بھی باآسانی ملنی مشکل ہے۔

علالت و رحلت

قابلِ رشک صحت

حضرت تھانوی کی صحت کے متعلق مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں کہ :۔

"حضرت کی صحت جسمانی مدتوں قابل رشک رہی ایک تو جثّہ قدرۃً قوی تھا۔ کاٹھی اچھی تھی۔ اور پھر حضرت کی احتیاط خوئے اعتدال اور ہر بد پرہیزی سے پرہیز۔ میلوں چلنے اور خوب چلنے کی عادت، نتیجہ قدرۃً یہ تھا کہ اپنے اصل سن سے ۱۰۔۱۵ سال کم معلوم ہوتے تھے اور مدتوں بیماری پاس بھی نہیں پھٹکنے پائی (حکیم الامت صـ۵۳۰) ۷۲ سال کی عمر میں بھی رات کے وقت لکھنے پڑھنے کا کام بے تکلف بلا عینک کی مدد کے کر لیتے تھے۔" (ایضاً صـ۲۹۸)

وفات کی پیش گوئی

مولانا دریابادی کا اکثر تھانہ بھون آنا جانا رہتا تھا۔ نومبر ۱۹۳۲ء کے آغاز میں جب ان کی وہاں حاضری ہوئی۔ تو پہلی دفعہ ان کے کان چند ایسے فقروں سے آشنا ہوئے۔ جن کے سننے کے لیے نہ تو وہ تیار تھے۔ اور نہ متحمل۔ لکھتے ہیں :۔

"اب کی بار طبیعت کو ذرا ناساز پایا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ

نہ دکھلالیں اور اس سے رائے نہ لے لیں۔ ہرگز نہ دیکھیں۔

اخبارات کے بعض مفاسد۔ اس قسم کے احقر نے ایک مستقل تحریر مسمی بہ "اخبار بینی" میں ایک زمانہ میں لکھے تھے۔ جس پر بلاتدبّر بعض معترضین نے غل مچایا۔ مگر وہ تحریر بغور پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ کسی اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ بہر حالت میں حرام ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ چونکہ ان چیزوں میں بعض اوقات ایسے مفاسد ہوتے ہیں۔ اور ان مفاسد سے بچنا ملّتِ اسلامیہ میں واجب ہے۔ اور بچنا بدوں معرفت کے ہو نہیں سکتا۔ اور معرفت خود ہے نہیں۔ اس لیے کسی صاحبِ معرفت یعنی عالم محقق سے مشورہ لے کر اس کا اتباع ضروری ہوگا۔

افسوس ہے کہ باوجود وضوع اس امر کے پھر اس ممانعت کو تنگ خیالی و تعصب پر محمول فرمایا جاتا ہے کیا خیر خواہ باپ اپنے بچے کو زہریلی ہوئی مٹھائی کے کھانے سے روکے۔ کوئی عاقل اس باپ کو متعصب یا تنگ خیال کا لقب دے گا۔ غایت رافت کے ساتھ اس کو متعصب کہے گا۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم خُذ ما صفا ودع ما کدر کے طور پر اس کو دیکھتے ہیں۔ اس کا جواب ادھر کی تقریر سے واضح ہو گیا ہے کہ اس امتیاز کے لیے علم کامل اور فہم دانی کی حاجت ہے اور کلام اس کے فاقد میں ہے۔ رہا کسی کا اپنے کو فاقد نہ سمجھنا۔ یہ معتبر نہیں۔ بلکہ کسی عالم کا کسی کو فاقد کہنا اس کے اثبات کے لیے کافی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جناب رسول کریم و نبی حکیم صلی اللہ علیہ وسلم

ایک روز صبح کی مجلس خصوصی میں کچھ الفاظ اس طرح کے ادا فرمائے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اب اپنا وقت موعود قریب سمجھ رہے ہیں۔ کلمات میں یاس کا پہلو مطلق نہ تھا۔ کچھ اس طرح کا ذکر تھا کہ لکھنے پڑھنے کا کام جو کرنا تھا۔ وہ کر چکا۔ یہ کلمات کچھ اس مؤثر انداز میں زبان مبارک سے نکلے کہ میرا تو دل لرز گیا۔ اور یہ خیال کر کے کہ شمع اب جلد ہی بجھنے والی ہے۔ وہیں سر محفل آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے"۔

(حکیم الامت ص ۴۹-۵۰)

اس سے ان کے دل میں جو ایک خطرہ سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی تصدیق کے لیے انھوں نے اپنے ۲۳ دسمبر ۳۲ء کے مکتوب میں حضرت تھانوی کو لکھا کہ :-

"رسالہ استوار کے خاتمہ پر جو عربی عبارت درج ہوئی ہے اس سے دل بہت متاثر ہوا کہ اب تصنیف و تالیف کا دور ختم ہو گیا۔ پچھلے مہینہ زبانی میں نے جناب والا سے یہی مضمون سنا تھا۔ اس وقت بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ بلا تشبیہ وہی کیفیت ہوئی جو آیہ الیوم اکملت لکم دینکم الخ کو سن کر حضرت صدیق رضؓ کی ہوئی تھی۔ خدا جانے آپ کو کیا کچھ معلوم ہوا ہو گا۔ جب ہی تو آپ نے اپنی تصانیف کے خاتمہ کا اعلان فرما دیا"۔

حضرت نے اس آخری سوال کے جواب میں لکھا کہ :-

"صرف بڑھاپا اور کچھ نہیں"۔

مولانا دریابادی کی اس خواہش کا جواب کہ :-

"میں تو خالص اپنی خود غرضی کی بناء پر دعا کرتا ہوں کہ

جب تک میں زندہ رہوں کم از کم اس وقت تک تو ضرور ہی جناب کو زندگی عطا ہو۔"

تو آپ نے لکھا کہ :۔

"اور اگر پھر کوئی یہی دُعا کرے۔ تو میں کہاں تک کھینچتا چلا جاؤں۔ یہ دُعا کیجئے کہ وہاں سب مل جائیں۔"

(حکیم الامت ص ۲۷۳)

آغازِ ضعف

اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں پہلی بار حضرت کے زبان وقلم پر اپنے قویٰ، خصوصاً قوائے دماغی کے متعلق ایسے الفاظ آنے لگے :۔

"اب میرا دماغ متحمل نہیں رہا۔" (حکیم الامت ص ۳۶۰)

"اب غائر نظر سے دیکھنے کی ہمت نہیں رہی۔" (ایضاً ص ۳۶۱)

"لیکن آخر کہاں تک اور کب تک۔ اب سن ۸۰ سال کا تھا۔ اور ضعف نمایاں ہو چکا تھا۔ وسط ۱۹۳۸ء سے علالت مزاج مسلسل رہنے لگی۔ اس کی خبریں مختلف ذرائع سے آتی رہیں۔ سن سن کر ہول بڑھتا رہا۔ اور دعائیں اضطراب و اضطرار کے ساتھ ہونٹوں پر آتی رہیں۔" (حکیم الامت ص ۵۳۰)

مگر اس کے باوجود آپ کے ڈاک کے معمول میں فرق نہ آیا، البتہ ان میں حسب عذر کچھ نہ کچھ تخفیف ہوتی رہی۔ اور احباب میں سے جن کے طول طویل خط آتے۔ ان کو حتی الوسع مایوس نہ فرماتے مگر آخر نوبت باینجا رسید کہ مولانا عبد الماجد صاحب کو "اطلاع خاص بنا بر بے تکلفی" ان الفاظ میں بھیجی :۔

"مدت سے دماغی کام سے قاصر ہو گیا ہوں اور اکثر ایسی خدمات (علمی فقہی سوالات کے جواب دینے کے) عذر کر کے دوسرے

اہلِ علم کا پتہ دیتا ہوں۔ چنانچہ استفتاء عموماً واپس ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ کے خط کے جواب میں عذر کرنے کو جی نہ چاہا۔ چونکہ طبع میں اضمحلال محسوس ہوتا ہے۔ اس کے نفع کے انتظار میں رہا۔ کل قدرے نشاط معلوم ہوا۔ جواب لکھا۔ مگر اس قدر تعجب ہوا کہ اس وقت تک دماغ میں درد اور طبیعت میں کسل غیر معمولی موجود ہے۔ اس تجربہ کے بعد صرف اس کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر کبھی کسی جواب سے تقاعد کا اتفاق ہو جائے تو اس عذر پر محمول فرما لیا جاوے۔ لیکن سوال میں آپ بالکل آزاد ہیں۔" (حکیم الامت ص ۵۲۶)

مرض الموت

خواجہ عزیز الحسن صاحب خاتمۃ السوانح میں لکھتے ہیں کہ :-

"اصل مرضِ وفات ضعفِ معدہ اور ورمِ جگر تھا۔ جس کے آثار یہ تھے کہ کبھی قبض لاحق ہو جاتا۔ جس سے حضرت اقدس کو سخت الجھن اور اذیت ہوتی۔ اور کبھی دستوں کے دورے ہونے لگتے۔ جس سے شدید ضعف ہو جاتا۔ علاوہ بریں مختلف اعضاء پر ورم بھی رہنے لگا تھا۔ آخر زمانہ میں اشتہا مفقود ہو گئی تھی۔ اور اکثر اوقات غنودگی کا عالم طاری رہنے لگا تھا۔ ان میں سے اکثر شکایات کم و بیش تقریباً پانچ سال متواتر رہیں۔ اس عرصہ میں علاج برابر جاری رہا۔ جس کے سلسلہ میں ایک بار سہارنپور اور دو بار لکھنؤ بھی معتدبہ مدت تک قیام فرمایا۔ مختلف طبیب بھی بدلے۔ جنھوں نے نہایت دل سوزی اور والہانہ توجہ سے علاج کیا۔

کیونکہ ان میں اکثر معتقدین جاں نثار تھے۔ لیکن اگر کبھی افاقہ ہوا تو محض عارضی ہوا۔ مرض کا استیصال کلی کسی علاج سے نہ ہو سکا۔ بالآخر نوبت باینجا رسید کہ سقوط اشتہا کے باعث غذا تقریباً بالکل متروک ہو گئی۔ اور ضعف روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کی جانب حضرت اقدس بار بار معالجین کی توجہ منعطف فرماتے رہے اور اس عنوان سے کہ جب یہ حالت ہے اس کا انجام سوچ لیا جائے۔ گو میں تو اس انجام کے لیے تیار ہوں۔ لیکن گوش گزار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

بالآخر باوجود انتہائی ضعف کے لکھنؤ کے طویل سفر کا پھر قصد فرمایا۔ لیکن اتنے میں دستوں کا آخری دورہ شروع ہو گیا۔ جس کا امتداد نہایت اشتداد کے ساتھ تقریباً ایک ماہ تک رہا۔ اور جس نے رفتہ رفتہ بالکل صاحبِ فراش کر کے سفر کا امکان ہی منقطع کر دیا۔ اس دوران میں وہ چند مرغوبات بھی چھوٹ گئیں جو کسی درجہ میں قوت پہنچاتی رہتی تھیں۔ اس حالت کے متعلق وفات سے چند روز قبل حاضرین خاص سے فرمایا کہ اب تو کسی چیز کی بھی رغبت نہیں رہی۔ بس خواجہ صاحب کا یہ شعر حسب حال ہے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی"

قوتِ قدسیہ

لیکن بایں ہمہ حضرت اقدس کی قوتِ قدسیہ ایسی کارفرما تھی کہ باوجود

صرف پوست و استخواں رہ جانے کے جس وقت غنودگی سے چونکتے ہوش و حواس تدبر و انتظام۔ تحقیق و تدقیق۔ ہمہ گیری و رسائی۔ فکر و استحکام و اصابت رائے وغیرہ جملہ خصوصی اوصاف حضرت والا اپنے اس بے نظیر امتیازی شان سے نمودار ہونے لگتے۔ جو بحالت صحت ہمیشہ سے تھی۔ بس صرف آواز کی پستی کا فرق ہوتا۔ ان حالات میں آخر وقت تک نہ صرف خدام و متعلقین ہی کو بلکہ طبیبوں کو بھی افاقہ کا دھوکہ رہا۔ گویا دو چار روز سے چہرہ اقدس پر بھی جس کہ اس سے قبل ہمیشہ انتہائی ضعف و علالت کی حالت میں بھی جو بصد رعب و داب و ہیبتِ شاہانہ ہی دیکھا گیا۔ ضعف کی خاص حالت تھی۔ اس سے مایوسی کے بھی خیالات آنے لگتے۔ خود حضرت نے بھی اس زمانہ میں بعض اوقات فرمایا کہ گو جسمانی تکلیف ہے۔ لیکن الحمد للہ طبیعت منشرح ہے۔ ایک بار فرمایا کہ کبھی کبھی خیال کرتا ہوں کہ بیکار تو پڑا ہی ہوں۔ لاؤ لیٹے لیٹے کچھ ذکر اللہ ہی کروں۔ لیکن ضعف اس قدر ہے کہ زبان اُٹھتی ہی نہیں۔ گو الحمد للہ قلب سے تو ذکر کرتا رہتا ہوں۔ ایک دن بعد عصر آنکھیں بند کیے حسب دستور کروٹ لیے ہوئے تھے۔ ہم لوگ سمجھے کہ غنودگی میں ہیں۔ مولوی جمیل احمد صاحب نے کچھ استفسار کسی غذا کے متعلق کیا تو جھنجھلا کر آنکھیں بند کیے ہوئے فرمایا کیا واہیات ہے۔ ایک مشغول آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔ مولوی صاحب نے عرض کیا بہت اچھا۔ تو اپنے مخصوص طرز تنبیہ میں فرمایا کہ ہمیشہ یہی جواب ملتا ہے کہ بہت اچھا۔ لیکن عمل کبھی نہیں ہوتا۔

اس انتہائی عالمِ ضعف و انحطاط میں خطوط کو سن سن کر جوابات زبانی لکھواتے رہے۔ ان سے بھی سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ہر لحاظ سے ہر مضمون نہایت جامع مانع اور سارے ضروری پہلوؤں پر بالکل حاوی ہوتا تھا۔ حالانکہ غنودگی بھی طاری ہو ہو جاتی۔ لیکن جب افاقہ ہوتا۔ پھر لکھوانا

شروع فرمادیتے ۔ اور تسلسل میں ذرا فرق نہ آنے پاتا۔ اسی دوران میں ایک مصیبت زدہ بی بی کے جو حضرت اقدس کے کانپور کے زمانہ کے دیوبند معتقد بلکہ دوست کی بیٹی تھیں۔ ایک نہایت دردناک خط کو جو بہت طویل اور متعدد مضمونوں اور درخواستوں پر مشتمل تھا۔ پورا سنا۔ گو ہم لوگوں کے گمان میں کبھی کبھی غنودگی سی بھی طاری ہو گئی لیکن جب اس کا یکجائی جواب لکھوایا تو سننے والے حاضرین مجلس کو حیرت ہو گئی ۔ کیونکہ کوئی جز ایسا نہ چھوڑا جس کا جواب نہ لکھا دیا ہو۔ اور وہ بھی نہایت شفقت آمیز۔ تسلی بخش۔ مؤثر۔ جامع ۔ مانع اور باربط۔ دورِ غنودگی میں اس درجہ حاضر دماغی۔ اللہ اکبر۔

حقیقتِ غنودگی

ایسے ہی حالات کو دیکھ کر جناب حکیم خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے جو حضرت کے معالج تھے یہ فرمایا کہ یہ غنودگی طبی نہیں ہے بلکہ ظاہراً استغراق اور توجہ الی اللہ سے ناشی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم نے بہت سے مریض غنودگی والے دیکھے ہیں۔ ان پر غنودگی سے افاقہ کے بعد بھی کچھ اثر اس کا کافی رہتا ہے ۔ دماغ کچھ بھولا بھولا سا رہتا ہے ۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ خود غنودگی سے ہوشیار ہوئے تو پھر دماغ پر غنودگی کا کوئی اثر ہی محسوس نہیں ہوتا۔" اور حضرتؒ چونکہ ہر حال میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے عادی تھے ۔ تکلیف میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو ایسا نکال لیتے تھے جو قابل فکر ہو۔ کسی بھی تکلیف میں کبھی کوئی شکایت حضرت کے قلب میں پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے آپ اس غنودگی کی یہ تعبیر فرماتے تھے کہ

"یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے ۔ کیونکہ غنودگی میں مرض کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔" (خاتمۃ السوانح صن۳۰)

تفکّر و تردّد

ایسے نازک وقت میں عام طور پر لوگ مریض کی تسلی کرانے کی تدابیر اختیار کرتے

ہیں۔ مگر یہاں مریض طبع پرسی کرنے والوں کی فکر میں تھا۔ آپ انھیں اس عالم میں ایسے عجیب جواب دیتے تھے۔ جن سے نہ تردّد پیدا ہوتا تھا۔ اور نہ بے فکری گویا بیماری کے اس شدید ترین دَور میں بھی دماغ صحیح کام کر رہا تھا۔ فرماتے تھے کہ اگر یہ لکھ دیا جائے کہ طبیعت اچھی ہے۔ حالانکہ اچھی نہیں۔ تو اس میں پوچھنے والوں کے سوال کو گویا مہمل قرار دینا ہے۔ اور یہ بھی دل شکنی کا باعث ہے۔ نیز ان کا حق بھی ہے کہ ان کو طبیعت کا حال بتایا جائے۔ ہاں اس طور پر نہیں کہ وہ پریشان ہو جاویں چنانچہ حضرت کسی کو تحریر فرمادیتے کہ بیماروں میں تندرست ہوں اور تندرستوں میں بیمار! کسی کو لکھوا دیتے کہ مرض میں کمی ہے مگر ضعف میں زیادتی ہے۔ کسی کو لکھوا دیتے کہ جیسا دیکھ گئے ہو۔ ویسا ہی ہوں۔ اور کسی کو لکھاتے کہ مزاج تو اچھا ہے۔ معدہ اچھا نہیں ہے۔ گویا آخری وقت بھی مصالحہ عقلیہ۔ جذباتِ نفسیہ اور ضروریاتِ شرعیہ پر پوری طرح نظر رہی۔

سخت قدغن

شدتِ علالت کی اطلاع کی ہمیشہ خدام کو سخت ممانعت تھی۔ تا کہ دوسروں کو پریشانی نہ ہو مگر اس کے باوجود علالت کی خبریں دور دراز تک برابر پہنچ رہی تھیں۔ مشتاقانِ دید پروانہ وار خانقاہ اشرفیہ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور دربار اشرفیہ کے ضابطوں کی پابندیوں کو اس پریشانی کے عالم میں بھول رہے تھے۔ مگر ضابطوں کا بادشاہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی ان کی پوری طرح پابندی کر رہا تھا۔ کوئی پشاور سے بھاگا آ رہا ہے۔ تو کوئی گورکھپور سے اور کوئی کسی دوسرے دور دراز مقام سے بلا اطلاع آ رہا ہے۔ مگر ہر آنے والے سے یہی ارشاد ہوتا کہ اجازت نامہ کہاں ہے؟ جب وہ معذوری ظاہر کرتے اور اعترافِ قصور کرتے تو فرماتے کہ تمھاری غلطی کا خمیازہ میں کیوں اٹھاؤں۔ پھر حاضرین سے خطاب کرتے کہ ان کو میں محروم کر کے بھی محروم نہیں کرتا ہوں۔

ایک سبق دے رہا ہوں ان کے ناکام واپس جانے کا یہ اثر ہوگا کہ یہ خبر سن کر دوسرے لوگ آنے بند ہو جائیں گے اور اس طرح ان کو فائدہ پہنچے گا۔ اسی بے اجازت آنے والے ہجوم میں ہمارے علامۃ العصر مورخ اسلام سید سلیمان ندوی رح بھی تھے۔ جو ہزاروں معتقدوں کی طرح زیارت کے لیے بے چین تھے۔ چنانچہ وہ بھی بلا اجازت تھانہ بھون کو چل پڑے لکھتے ہیں کہ:۔

"خاکسار بھی خلاف دستور بے اطلاع ۶ جولائی کو لکھنؤ سے روانہ ہو گیا اور ۷ کی دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے پہنچا۔ دریافتِ حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے۔ جس سے تسکین ہوئی۔ میرا اس طرح خلاف دستور بے اطلاع اچانک پہنچ جانا حضرت کے لیے تعجب کا موجب ہوا۔ میری آمد کی خبر دینے والے سے پوچھا کہ "تم مولوی سلیمان کو پہچانتے بھی ہو یا یونہی کہہ رہے ہو" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تو ارشاد ہوا کہ "ان کی عادت بے اطلاع آنے کی نہ تھی"۔ حضرت کے عزیز خاص مولانا جمیل احمد صاحب نے عرض کی علالت کی خبر سن کر چلے آئے ہوں گے۔ نماز ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی۔ ضعف سے بستر پر لیٹے تھے۔ مصافحہ فرمایا، خاکسار نے دست مبارک کو بوسہ دیا شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی۔ سفر کا حال پوچھا۔ کسی خادم کے ساتھ نہ لینے پر نصیحت فرمائی"۔

(یاد رفتگاں صفحہ ۲۸۸)

اہتمام مجلس

خواجہ عزیز الحسن صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"باہر چھتہ کے نیچے بیرونی اور مقامی مشتاقانِ دید گھنٹوں اس اشتیاق میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب اطلاع کی نوبت آئے۔ اور محض ایک جھلک ہی دیکھنا نصیب ہو جائے۔ مگر اس کا موقع بھی بعض وقت نہ ملتا تھا۔ اور اکثر تو باوجود عدم باریابی ویسے ہی بیٹھے رہنے کو موجب تسلی سمجھتے تھے۔ ان کا برابر جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ جو بار یاب بھی ہو جاتے تھے۔ تو صرف شروع میں۔ اور صرف دو چار کلمات حضرت کی زبان فیض ترجمان سے سننے ہی پاتے تھے کہ حضرت پر بے اختیارانہ طور پر عالمِ غنودگی طاری ہونے لگتا تھا۔ بس گویا اس شعر کا منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا ؎

اُف وہ پروانے کہ مٹتے ہی چلے جاتے ہیں
ہائے وہ شمع کہ خاموش ہوئی جاتی ہے

مگر اس حال میں بھی کیا مجال کہ انتظامی شان میں فرق آجائے۔ با قاعدہ پرچے نو واردین و مقیمین کے پیش کیے جاتے اور ہر ایک پر بذاتِ خود بوسائط حسب معمول سوال و جواب ہوتے۔ پھر کسی پر منظوری۔ کسی پر نا منظوری۔ کسی پر بشرائط و قیود منظوری دی جاتی۔ یہاں تک کہ کس کو کہاں بٹھایا جائے۔ اس پر حسبِ عادت پوری نظر تھی۔ ایک بار چند خاص خاص اہلِ علم حضرات وفات سے چند یوم پہلے مکرر مع رفقاء کے حاضر ہوئے۔ تو برآمدہ میں جگہ کم تھی۔ اس لیے حاضرین سے فرمایا کہ کچھ لوگ باہر تخت پر جا بیٹھیں۔ تاکہ جگہ ہو جائے۔ ہم لوگ بطور خود وہاں جا بیٹھے۔ بعض بدستور بیٹھے رہے۔ اس پر جائزہ لیا اور دریافت فرمایا کہ کون کون باہر بیٹھے ہیں اور کون کون اندر ہیں۔ پھر ان میں سے بعض کو اندر بٹھایا۔ بعض

کو باھر۔ ہر ایک کا نام خود پوچھتے تھے۔ کیونکہ سر اُٹھا کر خود دیکھنے کی سکت ہی کہاں تھی اور جس

تھے۔ کیونکہ سر اُٹھا کر خود دیکھنے کی سکت ہی کہاں تھی اور جس

کے لیے جو جگہ مناسب تھی۔ اس کو وہاں بٹھانے کے لیے فرماتے جاتے تھے جب سب تجویز فرمودہ جگہوں پر بیٹھ چکے۔ تو فرمایا کہ ترجیح بلا مرجح کا کوئی شبہ نہ کریں۔ کیونکہ علاوہ فضل و کمال کے دیگر وجوہ بھی کسی کو اندر کسی کو باہر بٹھانے کے ہیں۔ پھر یہ بھی پوچھوایا کہ کسی صاحب کو گوارا تو نہیں ہوا۔ اس پر سب نے عرض کیا کہ جی نہیں۔ تو ان سے فرمایا کہ اب تو یہ حالتِ مرض مستقل سی ہو گئی ہے۔ لہذا بار بار تشریف لانے کی بجائے وہیں سے دُعائیں یاد فرمایا کریں۔" (خاتمۃ السوانح ص۳۱)

غرضیکہ بقول سید سلیمان ندوی ؒ

"اس ضعف و اضمحلال کی حالت میں بھی مجلس کا وقار۔ م و ضبط اور اصول و قواعد کی پابندی بدستور جاری تھی۔ اور آخیر لمحۂ حیات تک اس میں فرق نہیں آیا۔" (یادرفتگاں ص۲۸۹)

آمادگیِ سفرِ آخرت

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

"حضرت گو ضبط۔ صبر اور استقامت سے اپنی تکالیف ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ اور نہ آئندہ کے خطروں کو زبان پر لاتے تھے کہ دوسروں کو بے صبری نہ ہو۔ مگر بات بات سے سفر کی آمادگی ظاہر ہوتی تھی۔ گو ان کی زندگی اور طرزِ زندگی جس صفائی اور باقاعدگی کی عادی تھی۔ اس کا اثر یہ تھا کہ وقت اخیر کے لیے کوئی کام اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ کہ سالک

ہر لمحہ کو ہر لمحۂ اخیر سمجھتا ہے۔ اور اسی کی تیاری رکھتا ہے۔ یہی حال حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تھا۔ کوئی چیز کرنی باقی نہ تھی تمام انتظامات اور حساب کتاب اور وصایا سے پوری پوری فراغت تھی۔ عادت شریف تھی کہ آج کا کام کبھی کل پر اٹھا کر نہیں رکھا۔ گویا ہر وقت آمادۂ سفر تھے۔" (یادِ رفتگان ص۲۹۴)

تعیینِ آرام گاہ

صرف یہی نہیں بلکہ :-

"ایک زمین لے کر اس کو تکیہ یا قبرستان خاص بنا کر وقف کر دیا تھا۔ ایک مختصر سے احاطہ کے اندر ایک زمین گھیر دی گئی تھی۔ جس میں کچھ درخت بھی لگا دیئے گئے تھے۔ چھوٹی سی مسجد اور ایک مختصر سا سائبان بھی اس میں ہے۔ اس میں دوسرے اعزہ اور خدام بھی آسودہ ہیں۔ اس کے بیچ میں اس مخدوم کی استراحتِ ابدی کے لیے زمین چُنی گئی۔" (الیضاً ص۲۹۸)

اور اسی گورستان میں آپ کی پیشوائی کے لیے آپ کے خدامِ خاص حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری میرٹھی اور جناب وصل بلگرامیؒ صاحب پہلے سے پہنچ کر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

آخری تقریر

کانگرس کی تخریبی کارروائیوں کا فتنہ مرضِ وفات کے ایام میں زوروں پر تھا۔ اتفاقاً انہی دنوں مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند حاضرِ خدمت ہوئے۔ تو طولِ مرض اور ضعفِ شدید کے باوجود آپ نے چھوٹے گھر سے باہر چھتہ کے اندر چارپائی پر بیٹھے ہوئے ان کے سامنے گھنٹہ

پھر ایک مفصل تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:-

"میں نے قرآن و سنت اور عمر بھر کے تجربہ نیز جن لوگوں کی خدمت کا شرف حاصل ہوا۔ ان سب کے طرزِ عمل سے مدرسہ کے بارہ میں جو کچھ اصلح سمجھا وہ یہ ہے مدارس اور ان کے متعلقین کو سیاسیات حاضرہ سے بالکل مجتنب رہنا چاہیئے اور صرف سیاسیات ہی سے نہیں بلکہ ہر اس کام سے جو تعلیمی مشاغل میں خلل انداز ہو۔ اگرچہ وہ نام فی نفسہٖ کیسا ہی محمود اور مفید کیوں نہ ہو۔ ہمارے بزرگوں نے طلباء کو بیعت کرنے اور سلوک میں مشغول ہونے سے بھی باوجود اس کے اہم سمجھنے کے طالبعلمی کے زمانہ میں ہمیشہ منع فرمایا ہے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ بھی کسی طالب علم کو فراغت سے پہلے بیعت نہ فرماتے تھے۔ پھر کسی سیاسی اور ملکی تحریک میں شرکت کیسے گوارا کی جا سکتی ہے۔"

(خاتمۃ السوانح صہ ۲۵)

حضرت مہتمم صاحب نے اس تقریر کو حرف بحرف تسلیم کیا اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کا اظہار فرمایا جس سے حضرت بہت مسرور ہوئے اور دعائیں دیں۔

آخری نصیحت

۲۹ جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ کو یعنی وفات سے قریباً اٹھارہ یوم قبل حضرت قاری محمد طیب صاحب دوبارہ حاضرِ خدمت ہوئے۔ تو آپ نے آخری نصیحت فرمانے کے مولانا شبیر علی صاحب۔ مولانا جمیل احمد صاحب۔ ڈپٹی علی سجاد صاحب اور خواجہ عزیز الحسن صاحب کو خاص طور پر مجلس میں طلب کیا۔ اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ مدرسہ دیوبند کے بارہ میں اپنی آخری

اور مختتم رائے آپ سب حضرات کے سامنے ذکر کر دوں تاکہ بعد میں غلط انتساب کا احتمال نہ ہو۔

وقت مقررہ پر قاری صاحب اور متذکرہ بالا حضرات حاضرِ خدمت اقدس ہوئے۔ غایت نصیحت کی وجہ سے آواز بہت پست تھی۔ اس لیے حاضرین کو قریب بُلا لیا۔ تاکہ وہ آپ کی آخری نصیحت گوش ہوش سے سن سکیں۔ آپ نے احتیاطاً حاضرین سے دریافت بھی فرما لیا کہ وہ تقریر سن رہے ہیں یا نہ۔ جب اُنھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو آپ نے کوئی سوا گھنٹہ بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے نہایت مؤثر انداز میں ایک مفصل مدلل۔ مکمل اور مسلسل تقریر مع تمہید فرمائی۔ جیسے کوئی تصنیف شدہ رسالہ سُنا رہے ہوں۔ اس آخری نصیحت میں آپ نے آفرمایا:-

"مَیں عرصہ سے بیمار ہوں۔ حیات کا اعتبار نہیں۔ اس وقت پھر مدرسہ دیوبند کے متعلق اپنا خیال صاف صاف ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مدرسہ دیوبند ایسی چیز نہیں کہ جس کے متعلق میں اپنی مختتم رائے ظاہر کیے بغیر چلا جاؤں۔ تاکہ بعد میں ہر فریق کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ وہ ہمارے موافق تھا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔

ترجمہ:- وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں۔ تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اس سے واضح ہے کہ دیانات مقصود بالذات ہیں اور سیاسیات وجہاد مقصود اصلی نہیں بلکہ اقامت و دیانت کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور سب کو دیئے گئے اور سیاسیات وجہاد سب کو نہیں دیا گیا۔ بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی۔ دی گئی۔ ورنہ نہیں۔ وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ بقدر ضرورت ہی لیے جاتے ہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیت میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور تمکین فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آ رہا ہے اور وہ یہ ہے :-

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم۔

ترجمہ :- تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائیگا۔ جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اللہ نے انکے لیے پسند کیا ہے۔ اس کو ان کے لیے قوت دے گا۔

یہاں ایمان وعمل صالح کو شرط قرار دیا جا رہا ہے۔ تمکین فی الارض کی۔ جس سے تمکین وسیاست کا مقصود اصلی ہونا لازم آتا ہے۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین وشوکت کا وعدہ کیا گیا ہے اور بطور خاصیت کے شوکت کا دین پر مترتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پس دین پر سیاست وقوت موعود ہوئی۔ لیکن ہر موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ ورنہ آیت کریمہ :-

ولو انھم اقاموا التوراة والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم۔

ترجمہ:۔ اور اگر یہ لوگ تورات کی اور انجیل کی۔ اور جو کتاب ان کے
پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی ہے (قرآن مجید)
اس کی پوری پابندی کرتے۔ تو یہ لوگ اُوپر سے اور نیچے
سے خوب فراغت سے کھاتے۔

میں جس میں اقامت تورات و انجیل و قرآن یعنی عمل بالقرآن پر وسعتِ رزق کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے۔ بلکہ دین پر موعود ہے کہ دین دار بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا۔ پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ یہاں بھی ایمان و عمل صالح پر شوکت و قوت اور سیاست و دیانت میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجہ میں بھی مطلوب نہیں۔ بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے۔ کہ وہ خود مقصود اصلی نہیں۔ اور دیانت خود مقصود اصلی ہے۔ اسی بناء پر میرا خیال یہ ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی رہنی چاہیئے۔ جو خالص حفاظت دیانت اور تعلیم دین میں مشغول رہے اور وہ جماعت اہل مدارس ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس لیے میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلبہ کو سیاسیات میں مبتلا نہ کیا جائے۔ طلباء اگر ان قصّوں میں پڑ گئے تو وہ تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے اور تربیت بھی ان کی نہ ہو گی۔ چنانچہ جب سے طلبہ کو اس سلسلہ میں ڈال دیا گیا ہے ان میں آزادی پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ لوگ ہر وقت ان کی طرف سے متفکر اور خائف رہتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار یہ کہا اور اب بھی کہہ رہا ہوں لیکن میں اس کے قبول کے آثار نہیں دیکھتا۔ چنانچہ اب جو مضمون (مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے جواب میں) آپ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی بحق مدرسہ سیاسیات سے کوئی تبری نہیں کی گئی۔ بلکہ اثبات معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس بیان میں مناظرانہ

صورت پیدا ہو گئی ہے۔ جس سے ذات البین پر بُرا اثر پڑتا ہے۔
میں نے جو کچھ کہا ہے۔ آپ کو مجبور کرنے کے لیے نہیں۔ بلکہ خود مجبور ہو کر کہا ہے تاکہ میرا طریق اور میری رائے تلبیس میں نہ پڑ جائے۔ کہ میں نے ہمیشہ اس کی حفاظت کی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے بزرگ و مشفق استاد حضرت مولانا (محمود الحسن) دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی اپنی رائے کے اخفا کو خیانت سمجھ کر ظاہر کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر میں تلبیس کو گوارا کرتا۔ تو اس وقت حضرت کے لیے کرتا۔ اب اس کی کوئی وجہ نہیں۔
اگر آپ کو اس طرزِ عمل کی تنقید پر دار العلوم میں قدرت نہیں ہے تو کم از کم اپنی رائے کا اعلان صاف طور پر کر دینا چاہیئے۔"

مہتمم صاحب نے اس کا وعدہ فرمایا۔ حضرت نے مسرت و شفقت کا اظہار فرمایا۔ اور یہ مجلس ختم ہو گئی۔ اس تقریر کے دوران میں آپ کو سخت تکلیف ہوئی۔ بار بار رخسار مبارک تکیہ پر رکھ دیتے تھے۔

آخری عطیہ

آپ کی آخری تصنیف لطیف بوادر النوادر کے ۲۵۰ نسخے آپ کی وفات سے چند روز قبل ہی جناب عبد الکریم صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج نے اپنے مصرف سے طبع کرا کر حضرت کی خدمت میں بھیجے۔ حضرت نے اسی وقت بعض خاص مقربین کی فہرست تیار کرائی۔ جو غالباً ۱۱ تھے اور ہر ایک کو بوادر النوادر کا ایک ایک نسخہ دینے کی ہدایت کی۔ مولوی سید سلیمان ندوی رح بھی اس وقت خانقاہ میں موجود تھے چونکہ ان کا نام بھی اس فہرست میں موجود تھا۔ اس لیے مولانا جمیل احمد صاحب نے حضرت کا یہ عطیہ وہیں ان کے حوالے

فرمایا۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے

"حضرت کا یہ ارشاد سامی پہنچایا کہ میرے مضامین سے اقتباسات جمع کر کے شائع کرو۔ اس حکم کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا نسخہ سمجھ کر اپنی سعادت کا اظہار کیا۔ دوسرے دن حاضری کے موقع پر حضرت نے اپنی زبان مُبارک سے خود یہ ارشاد فرمانا چاہا تو خاکسار نے حضرت کی زحمت تکلم کے خیال سے عرض کیا کہ یہ ارشاد مبارک مولانا جمیل احمد صاحب کے ذریعہ پہنچ چکا ہے مگر وہاں سے اُٹھنے کے بعد مولانا جمیل صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ حضرت کا مقصود کیا ہے۔ یعنی اس کتاب بوادر سے اقتباس یا عام کتابوں سے اُنھوں نے فرمایا۔ اس کو اچھی طرح میں نے خود بھی نہیں سمجھا۔ بعد کی حاضری میں موقع پاکر میں نے تفصیل چاہی۔ تو ارشاد ہوا۔ عام کتابوں میں جو مضمون مفید نظر آئیں۔ ان کو یکجا کر لیا کرو۔" (یاد رفتگاں صفحہ ۲۹)

اس فہرست میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کا نام نامی بھی تھا۔ اس آخری تقسیم سے جو کتابیں بچ رہیں ان کے متعلق فرمایا کہ وہ سب بھیجنے والے سشن جج صاحب کو واپس کردو۔ چنانچہ اسی طرح کیا گیا۔

آخری ملفوظ

۷۔ جولائی ۱۹۴۳ء سے حضرت پر غنودگی طاری رہنے لگی۔ اور استماع ملفوظات سے حاضرین محروم رہنے لگے۔ وفات سے دو چار روز قبل خواجہ عزیز الحسن صاحب سے مصروف قیل و قال رہے۔ بہت ہی عجیب و غریب مضامین بیان فرماتے رہے اور بالآخر فرمایا کہ:۔

"خواجہ صاحب یہ باتیں ہیں لکھنے کی۔ خواجہ صاحب پھر یہ باتیں سننے میں نہ آئیں گی کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں اس کا اہتمام نہیں۔"

پھر مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کا یہ مصرع پڑھا ؎

رانڈ ہو جائیں گے قانون و شفا میرے بعد

پھر مولانا عبدالسمیع صاحب بیدل کا یہ شعر پڑھا ؎

بیدل خستہ کو پاؤ گے کہاں
کر لو اس کی مہمانی چند روز

وہاں سے صرف ایک روز قبل عصر کے قریب انتہائی نقاہت کے باوجود ملفوظات کا سلسلہ یکایک شروع فرمادیا۔ گو آواز بمشکل نکلتی تھی۔ اور تقریر نہایت آہستہ آہستہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زبان فیض ترجمان سے صادر ہوتی تھیں۔ اس حالت میں آپ نے فرمایا کہ :۔

"میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ میرے اعزہ مجھ سے لاکھ درجے بڑھ جائیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک کوئی بڑھا نہیں۔ میں نے تو ہمیشہ اپنے کو مویشیوں سے بھی بدتر اور کمتر سمجھا۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کی جوتیوں کی برکت سے مجھے اوّل یوم ہی وہ بات نصیب ہو گئی۔ حضرت نے ایک ایسی بشارت دی۔ جس کو میں نے اس لیے کبھی ظاہر نہیں کیا۔ کہ گالیاں پڑیں گی۔ بڑے بڑے اکابر کا نام لے کر فرمایا۔ جن کی جوتیوں کی خاک کے برابر بھی میں اپنے آپ کو نہیں سمجھتا کہ یہ اب ان سے بڑھ چلے ہیں۔ میں ہمیشہ اس کو آئندہ کے لیے بشارت سمجھا کیونکہ اب تک تو میری حالت اس قابل کبھی نہیں ہوئی۔"

آخری فکر

جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات الصلوٰۃ وما ملکت ایمانھم تھے۔ اسی طرح حضرت تھانویؒ کو بھی آخری فکر نماز اور حقوق کی تھی خواجہ صاحب سے آخری ایام میں فرماتے تھے کہ

"مجھے دو چیزوں کا بہت خیال ہے نماز کا اور حقوق کا"

بالآخر جب سر کنے کی بھی سکت باقی نہ رہی تھی۔ تو لیٹے لیٹے تیمم اور اشاروں سے نماز ادا فرمانے لگے۔ اور اخیر وقت تک ایک نماز بھی قضا نہ کی۔ یہاں تک کہ آخری غشی اور انتقال سے تھوڑی ہی دیر پہلے دریافت فرمایا کہ مغرب میں کیا دیر ہے۔ عرض کیا گیا کہ دس منٹ ہیں۔ فوراً مکرر استفسار فرمایا کہ وقت کے آنے میں یا وقت کے جانے میں۔ آخری وقت میں بھی اس شانِ تدقیق نے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

آخر وقت میں مولانا شبیر علی صاحب کو یاد فرمایا۔ وہ سہارن پور دوائی لینے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ جس پر بہت افسوس فرمایا کہ مجھے خانقاہ کے متعلق ان سے کچھ کام تھا۔ اس پر بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ مجھ سے فرما دیجئے تو فرمایا کہ تمھاری سمجھ میں نہ آوے گا۔ اور پھر ان کی عدم موجودگی پر افسوس فرمانے لگے۔ اس پر انھوں نے اصرار فرمایا کہ حاضرین میں سے کسی کو سمجھا دیا جائے تو اس پر خاموشی اختیار فرمائی۔

آپ کی الجھن دور کرنے کے لیے بیگم صاحبہ نے مولوی جمیل احمد صاحب کو پیش کیا کہ ان کو سمجھا دیا جائے۔ تو حضرت نے ان کی توجہ کو دوسری طرف مبذول کرنے کے لیے امانتوں کا صندوقچہ طلب فرمایا۔ بیگم صاحبہ بھی ماشاءاللہ بڑی فہمیدہ تھیں۔ وہ بات سمجھ گئیں۔ اور انھوں نے پھر عرض کیا کہ مولوی جمیل اور مولوی ظفر کو سمجھا دیجئے۔ اس پر بھی خاموش رہے۔ دراصل یہ

کوئی ایسے رازو اسرار کی بات تھی۔ جو مولانا شبیر علی کے سوا کسی اور کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔ چونکہ اس سعادت سے بہرہ ور ہونا عند اللہ مطلوب نہ تھا۔ اس لیے مولانا شبیر علی صاحب بروقت نہ پہنچ سکے۔

یہ باتیں سن کر گھر کی لڑکیاں رونے لگیں۔ چھوٹی بیگم صاحبہ نے عرض کیا کہ دیکھئے! لڑکیاں رو رہی ہیں ایسی مایوس کن باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ ایسی کیا جلدی ہے۔ صبح جب سانس کی تکلیف جاتی رہے۔ اس وقت سمجھا دیجئے۔ فرمایا رونے والی تو باؤلی ہیں۔ میں مایوسی سے تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ حقوق العباد کا معاملہ ہے اور اللہ کا حکم ہے۔ اس لیے سب امانتوں کا سمجھا دینا ضروری ہے۔ پھر چھوٹی بیگم صاحبہ سے نماز مغرب ادا فرمانے کے بعد پوچھا کہ میں دونوں کو ماہوار خرچ دے چکا ہوں۔ انھوں نے تسلی دی۔ کہ ہمیں بہت کچھ مل چکا ہے۔ ہمارے پاس خرچ کے لیے بہت کافی موجود ہے۔ آپ دے چکے ہیں۔ بے فکر رہیں۔ پھر لفافوں میں سے امانتوں کی تھیں نکلوائیں۔ ایک میں چودہ آنے نکلے۔ فرمایا پندرہ آنے ہوں گے۔ مکرر دیکھنے پر اکنی اور اسی لفافہ سے برآمد ہوئی۔ دوسرے لفافہ سے رقم نکالی گئی پانچ روپے کے چھ نوٹ نکلے۔ اور کچھ ریزگاری تھیں۔ ان نوٹوں کو خود ہاتھ میں لے کر گننے کی کوشش کی۔ اور کچھ کہا بھی۔ مگر زبان لڑکھڑا چکی تھی۔ کچھ سمجھ میں آیا۔ اتنے میں غش طاری ہو گئی۔ اور نوٹ سینے پر بکھر گئے۔

آخری ڈاک

بقول خواجہ عزیز الحسن مجذوب حضرت کو کام جلد سے جلد پورا کرنے کا بہت ہی اہتمام تھا۔ یہاں تک کہ آخری روز بھی ڈاک گھر والوں سے کہہ کر ڈبہ میں سے نکلوائی اور اپنے سامنے رکھوالی۔ پھر پتے دیکھ کر فرمایا

کہ اُٹھالو۔ کسی اپنے خاص جاننے والے کا کوئی خط نہیں ہے۔ ایک اہل خصوصیت کا دستی لفافہ آیا۔ غنودگی اور ضعف بے انتہا تھا۔ مگر اس کو خود اپنے دستِ مبارک سے حسب معمول اس طرح کھولا کہ چپکا ہوا پرت پھٹنے نہ پائے۔ گو اس طرح کھولنے میں خاصی دیر لگی۔ کیونکہ ناتواں انگلیاں اچھی طرح کام ہی نہیں دیتی تھیں۔ اور کچھ غنودگی کا اثر بھی تھا۔ پاس بیٹھنے والے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ کہ خود کھول دیں۔ اور حضرت اقدس اس تعب سے بچ جادیں لیکن کسی کی مجال نہ تھی۔ کیونکہ حضرت اقدس کسی کی اعانت کسی کام میں حتی الامکان نہ لیتے تھے۔ اگر کوئی سبقت کرتا تو ناگواری کے ساتھ منع فرما دیتے۔

غرضیکہ آپ کا آخری عمل ڈاک کا ملاحظہ۔ خطوط کا جواب دینے کی کوشش۔ اور امانتوں کی سپردگی تھا۔ چونکہ طبیعت میں حقوق العباد کا غایت درجہ اہتمام تھا۔ اس لیے آخری وقت بھی اس کا خیال غالب رہا۔

آخری بشاشت

دوشنبہ (۱۹ رجولائی ۱۹۴۳ء) کو کھل کر اجابت آجانے کی وجہ سے طبیعت ذرا اچھی ہو گئی تھی۔ بعد ظہر جب حکیم عبد المجید صاحب لکھنوی دیکھنے آئے تو حضرت نے خود نہایت تسلسل اور انشراح و قوت کے ساتھ اپنے حالات بیان فرمائے تو انھوں نے اظہار اطمینان فرمایا کہ دست حضرت کے لیے نافع ثابت ہوئے۔ غنودگی بالکل نہیں رہی۔ دماغ کھل گیا۔ اور کلام بالکل مسلسل ہے۔ نبض میں بھی بجائے ضعف کے قوت پیدا ہو گئی ہے اور واقعی حضرت کافی دیر تک حکیم صاحب سے بھی اور خدام سے بھی مرض و علاج کے متعلق تندرستوں کی طرح گفتگو فرماتے رہے اور دوا پینے کے متعلق فرماتے رہے کہ ؏

پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

غرضیکہ اس روز اس قسم کی گفتگو سے سب کو افاقہ کا دھوکا رہا۔

یوم وفات

۱۶ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء یوم سہ شنبہ کو صبح سے حضرت اقدس فرمانے لگے کہ آج تو ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔ ظہر کے بعد سوءِ تنفس پیدا ہوگیا۔ فرمایا کہ اتنی شدید تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی۔ مگر کراہنے کی بجائے لفظ اللہ اسی انداز سے فرمایا کہ سب کو کچھ تشویش سی ہوگئی۔ مگر گھبراہٹ کے آثار قطعاً نہیں پائے جاتے تھے۔ اسی وقت کیا۔ تمام بیماری کے دوران میں کوہ استقلال بنے رہے۔ اور اتنی شدید و مدید علالت کی ساری تکالیف کو مردانہ وار نہایت صبر و سکون سے برداشت فرماتے رہے۔ غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت اقدس کو یہ محسوس ہوگیا تھا کہ یہ میرا آخری دن ہے۔ آپ کو تبلایا گیا کہ حکیموں نے شام کو چوزوں کی یخنی میں چاول ڈالنے کی اجازت دے دی ہے۔ تو فرمایا کہ چاہے میں اس وقت ہوں ہی نہیں۔ اسی طرح چھوٹی پیرانہ صاحبہ سے فرمایا کہ آج تو ہم جا رہے ہیں۔ اُنھوں نے پوچھا کہاں؟ فرمایا کیا تم نہیں جانتی۔

آخری غشی سوا گھنٹہ طاری رہی اس کے بعد آخیر تک ہوش نہ آیا۔ البتہ سانس تیزی سے اور آواز کے ساتھ چلتا رہا۔ مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی یٰسین شریف پڑھتے رہے اور آبِ زمزم چمچہ سے دہن مبارک میں ڈالتے رہے۔ خسروِ دربار اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن و دیگر حضرات نہایت حسرت سے حضرت کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا نظارہ بے بسی کے عالم میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ کہ مستورات نے پردہ چاہا۔ اعزہ اندر رہے۔ اور باقی حضرات نماز عشا ادا کرنے چلے گئے۔

"کسے خبر تھی کہ ساعت موعود اتنی قریب آگئی تھی۔ آفتاب علم و عرفان کی آخری کرنیں بھی روپوش ہونے کو تھیں۔ اللہ کی رحمت نا اہلوں اور ناقدرے لوگوں سے واپس لی جارہی تھی۔ رسول

اسلام کا ایک سچّا جانشین اپنے مالک و مولا کے دربار میں حضوری کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ لشکرِ اسلام کا سب سے بڑا جرنیل۔ دین کے ہر ہر محاذ۔ ہر ہر معرکہ۔ ہر ہر مورچہ کا دلاور اپنے جسم کا پورا پورا دین کی راہ میں چُور چُور کیے ہوئے قلبِ خاشع۔ نفسِ مطمئنہ کے ساتھ عالمِ ناسوت کی بالکل آخری منزلوں سے گزر رہا تھا۔" (حکیم الامت ص۶۰۵)

وہ ابھی نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ آپ نے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تغیرِ عظیم

خواجہ عزیز الحسن صاحب جو حضرت کے خاصانِ خاص میں سے تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

"میں وتر کی نماز کے تشہد میں تھا کہ دفعتًہ مجھے اپنے قلب میں ایک تغیّرِ عظیم محسوس ہُوا۔ جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بالکل کورا ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ وہی بات تو نہیں ہے۔ جو حضرت اقدس فرمایا کرتے تھے کہ جب قطب الارشاد کی وفات ہوتی ہے تو اس وقت اہلِ احساس کو اپنے قلوب میں تغیّر محسوس ہوتا ہے اور کیفیات میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا فیض عام ہوتا ہے۔ سب کو پہنچتا ہے۔ چاہے فیض پانے والے کو بھی یہ خبر نہ ہو کہ یہ فیض خاص کدھر سے آ رہا ہے۔ بلکہ خود قطب الارشاد کو بھی کسی کی طرف سے فیض منتقل ہونے کا علم ہونا ضروری نہیں۔ جیسے آفتاب کی روشنی بلا اس کے قصد کے سب کو پہنچتی ہے۔"

اس عجیب واقعہ کی ایک اہل علم اور صاحبِ ذوق خادم و مجاز حضرت اقدس نے یہ توجیہہ کی کہ یہ نور اس وجہ سے ظاہر ہوا کہ انہی دو انگلیوں سے بڑے بڑے علوم و دقائق اور معارف و حقائق ایک طویل مدّت تک معرضِ تحریر میں آتے رہے۔ یہ نور اس کا ہے۔ و اللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

تجہیز و تکفین

انتقال کے تھوڑی دیر بعد مولانا شبیر علی صاحب سہارنپور سے دوائیں لے کر واپس خانقاہ پہنچے۔ مگر اب نہ مرض باقی رہا تھا اور نہ مریض۔ مولانا نے فوراً گرد و نواح کے صرف اہل خصوصیت اور اعزہ ہی کو آدمی بھیج کر اطّلاع کی۔ مگر یہ خبر وحشت اثر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔

تجہیز و تکفین کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ صبح کو ہو۔ صبح کو ہی خبر کے لیے دو آدمی سہارنپور بھیجے گئے۔ ایک مدرسہ مظاہر العلوم میں۔ جس سے حضرت کو بہت روحانی تعلق تھا۔ دوسرا سہارنپور کے احباب کے پاس۔ اس صبح والی گاڑی کے جانے اور دوسری گاڑی کے آنے میں آدھ گھنٹہ کا فصل ہوتا تھا۔ اس لیے لوگ یہ خبر سنتے ہی جس حال میں تھے۔ اسی حال میں چل پڑے۔

سپیشل گاڑی

پہلی گاڑی سے جو لوگ بچ گئے ان کے لیے محکمہ ریلوے نے فوراً ایک سپیشل گاڑی سہارنپور سے تھانہ بھون کے لیے چلائی۔ اس طرح ہزاروں لوگ شمولیتِ جنازہ کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ ادھر مولانا شبیر علی صاحب کی زیرِ نگرانی متعدد علماء صلحاء اچھی طرح مطابق سنت حضرت کو غسل دے چکے تھے اور جنازہ تیار کر کے باہر لانے لگے۔

یہ ارشاد یاد آگر گمان تو ضرور ہوا کہ اس تغیر کا سبب یہی ہے کہ حضرت اقدس عالمِ نزع میں ہی ہوں گے۔ پھر خیال ہوا کہ ابھی تو زندہ ہیں۔ گو عالم نزع میں سہی۔ یہ پہلے سے ہی اثر کیوں شروع ہو گیا۔ اس اشکال کا جواب ذہن میں یہ آیا کہ گو ابھی رحلت نہیں فرمائی۔ لیکن نزاع میں اس عالم سے چونکہ بے توجہی ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے اس کا اثر مثل وفات ہی کے ہو۔ لیکن جب میں نماز سے فارغ ہو کر در دولت پر واپس آگیا۔ تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی پانچ منٹ ہوئے رحلت فرما گئے ہیں۔ اس وقت مجھے گمان غالب ہوا کہ وہ جو ایک تغیر خاص مجھے وتر کے تشہد کے وقت محسوس ہوا تھا۔ عجب نہیں عین پرواز روح مقدس کے کے وقت ہی ہوا ہو۔ کیونکہ فارغ ہو کر درِ دولت تک پہنچنے میں تقریباً اتنا ہی وقت صرف ہوا ہو گا۔ وہ تغیر مجھے اس درجہ کا محسوس ہوا تھا کہ سلام پھیرنے کے بعد میں سخت پریشان ہو کر باآواز کہنے لگا کہ یا اللہ اگر حضرت اقدس کے بعد میری یہی حالت رہی تو میرا ایمان کیسے سلامت رہے گا۔ (خاتمۃ السوانح صنہ۶)

نور کی کرنیں

چھوٹی بیگم صاحبہ نے بوقت نزع یہ دیکھا کہ جب سانس زور سے اُوپر کو آتا تھا۔ تو داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت اور بیچ کی اُنگلی کے درمیان پشت کی طرف گھاٹی میں ایک ایسی تیز چمک جگنو کی سی پیدا ہو جاتی تھی کہ باوجود اس کے کہ بجلی کے دو قمقمے اس وقت روشن تھے۔ پھر بھی اس کی چمک غائب ہو جاتی تھی۔ پہلے تو وہ یہ سمجھیں کہ کوئی جگنو آ بیٹھا ہے۔ لیکن جب دیر تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ تو پھر اُنھوں نے دوسری مستورات کو بھی جو اس وقت ان کے قریب موجود تھی دکھایا کہ مجھے دھوکا ہو رہا ہے یا تمھیں بھی یہ چمک نظر آرہی ہے؟ چنانچہ ان سب نے دیکھ کر اس کی تصدیق کی۔ سانس بند ہو جانے کے بعد وہ چمک بھی بند ہو گئی۔ اور پھر نظر نہ آئی۔

بارانِ رحمت

اس وقت عجیب کہرام مچا ہوا تھا۔ کوئی رو رہا تھا۔ کوئی چیخیں مار رہا تھا۔ ایک عجیب رقت انگیز نظارہ تھا۔ جس سے آسمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور جونہی جنازہ گھر سے باہر نکلا۔ اس نے بھی ترشح کے ذریعہ اس مجدد الملت کو آخری خراج تحسین ادا کیا۔ دفن تک بادل چھائے رہے اور تمام راستہ میں ترشح سے خوب چھڑکاؤ سا ہو گیا۔

نمازِ جنازہ

بے پناہ ہجوم کے پیشِ نظر چارپائی کے ساتھ دو لمبے بانس باندھ دیئے گئے اور چارپائی اُٹھانے پر تو مستقل آدمی تعینات کر دیئے گئے اور لوگوں کو بانسوں کی مدد سے کندھا دینے کی ہدایت کی گئی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے جنھیں نمازِ جنازہ پڑھانے کی پہلے سے بشارت ہو چکی تھی۔ نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت کو "قبرستانِ عشقبازاں" کے وسط میں آخری نیند سلا دیا گیا۔ جو حضرت نے خود زمین خرید کر وقف کیا تھا۔

مقامِ شہداء

نظامِ تکوینی کے ماتحت جب کسی آفتاب علم کے غروب کا وقت قریب آتا ہے تو صالحین کو عالمِ خواب میں قبل از وقت مطلع کر دیا جاتا ہے اور بغرض ترغیب بعض اوقات ان کے انجام کی بھی خبر دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرتؒ کی وفات سے چھ ماہ قبل ایک خادمہ رئیسہ کو عالمِ رویاء میں معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"مولانا اشرف علی کو غروب ہوتا ہوا آفتاب سمجھو۔" (اصدق الرؤیا)

اس کے پورے چھ ماہ بعد حضرت کا انتقال ہُوا۔ اس طرح اور بھی بہت سے نیک لوگوں کو عالمِ رؤیا میں مختلف طریق سے اس امر کی اطلاع ہوئی۔ اس رات کو حضرت کے ایک مجاز بیعت نے جن کو خوابوں سے خاص مناسبت ہے۔ بعد نصف شب کے حضرتؒ کو خواب میں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ :۔

"مجھے مردہ نہ سمجھو۔ مَیں زندہ ہوں۔ جس طرح میری حیات میں مجھ سے فیض لیتے رہتے تھے۔ فیض لیتے رہنا۔ فیض ہوتا رہے گا۔ اور مجھے مقامِ شہدا نصیب ہُوا ہے کہہ دیا جاوے۔"

وفات کے آٹھویں روز صبح صادق کے قریب انھیں پھر ایسا خواب آیا۔ جس میں تاکید کی گئی کہ

"یہ خبر چھوٹی پیرانی صاحبہ کو پہنچا دو۔"

چنانچہ اُنھوں نے صبح پرچہ لکھ کر حضرت مخدومہ محترمہ چھوٹی بیگم صاحبہ کی خدمت میں دونوں خواب پہنچا دیئے۔

ان رویائے صادقہ کی تائید دو حدیثوں سے بھی ہوتی ہے کہ پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے اور حضرت کی وفات مرض اسہال سے ہوئی تھی۔ دوسرے فتنوں کے زمانہ میں سنت کو زندہ کرنے والے کے لیے بھی مخبرِ صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شہادت کی بشارت دی ہے اور حضرت کی ساری عمر احیائے سنت میں گزری۔

مزارِ مبارک

حضرت تھانوی کے لیے دوسرے بزرگانِ دین کی طرح کوئی بڑا پُرشکوہ مزار تعمیر نہ کیا گیا اور نہ ایسا ہو سکتا تھا۔ کہ جس نے ساری عمر ردِ بدعات و رسومات میں گزاری ہو۔ اس کی وفات کے بعد ان کا آغاز ان کے مزار کی تعمیر سے

کیا جاتا۔ حضرت کا مزار کس نوعیت کا ہے۔ اس کی تفصیل مولانا عبد الماجد صاحب کے بیان کے مطابق یہ ہے:۔

"اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا۔ پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں اور مزار، آہ مزار! نہ کوئی بلند گنبد۔ نہ کوئی کلس دار قبہ۔ نہ چار دیواری۔ "نہ آستانہ" نہ جنگلہ۔ نہ کٹہرا۔ ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ۔ ایک سمت میں ایک مختصر پُر فضا عمارت وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مطلح تختہ۔ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ! نہ شامیانہ۔ نہ چھت۔ صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت! سادگی کی تصویر!! صاحبِ قبر کی بے نفسی کا آئینہ۔ نہ لوح۔ نہ کتبہ۔ نہ پھول۔ نہ چادر۔ چند قدم کے فاصلے پر وصل بلگرامی مرحوم اور دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے ہی سے پہنچے ہوئے۔ شیخ کی قبر ان سب قبروں سے بھی پست! زندگی میں بھی تو اپنے کو اپنے متوسلین سے پیچھے رکھتے تھے۔"

(حکیم الامت صـ۱۱-۶۱۰)

خراجِ تحسین

غرضیکہ بقول مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی رحؒ:۔

"اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا۔ جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی یادگار تھا۔ اور جس کی ذات میں حضرت چشت حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا

نہیں۔ جس کا سینہ چشتی ذوق عشق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا۔ جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی۔ جس کے قلم نے فقہ و تصوف کی ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا۔ اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا۔ اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمتِ ربانی کو فاش کیا تھا۔ اور اسی لیے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرفِ زمانہ کے لیے یہ خطاب عین حقیقت تھا۔" (یادِ رفتگاں صلا ۲۸۳-)

اعترافِ عظمت

صفِ ماتم

اشرف العلماء اشرف الاولیاء۔ قطب الارشاد۔ حکیم الامت۔ مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو چودھویں صدی کے نصف اول میں صحابہ کرام کے زندہ نمونہ تھے۔ بالآخر اس سرائے فانی میں بیاسی (۸۲) سال تین (۳) ماہ گیارہ (۱۱) دن گزار کر اپنی ابدی قیام گاہ کو واپس تشریف لے گئے۔ اسی سانحہ ارتحال کی خبر ملک کے

طول وعرض میں اور ہر طبقہ خیال میں انتہائی رنج وغم کے ساتھ سنی گئی۔ ملک کی سب جماعتوں نے جن میں حضرت کے سیاسی اور مشربی مخالفین بھی شامل تھے اس خسارہ کو خسارۂ عظمیٰ قرار دیا۔ اور یہ خبر سب سے پہلے ایک غیر مسلم اخبار نے نہایت احترام اور بہت ہی اچھے عنوان سے شائع کی۔ اخبارات نے سیاہ حاشیوں میں وفات کی خبر شائع کی۔ تعزیتی مقالے لکھے۔ اکابر قوم نے اپنے اپنے بیانات میں آپ کو آخری خراج تحسین پیش کیا اس موقع پر قائد اعظم نے بھی اپنے اس روحانی محسن کے متعلق ایک بیان "اظہار غم" دیا۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ تعزیتی قراردادیں پاس کی گئیں۔ مدارس بند کر دیئے گئے۔ بعض لوگوں نے وفور غم میں دکانیں بھی بند کر دیں۔ فاتحہ خوانی شروع ہوگئی۔ حضرت سے تعلق رکھنے والا ہر شخص خود کو تعزیت کا مستحق سمجھنے لگا۔

تاثر ماجدی

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ :-

"آہ! طبیبوں کی اٹکل پر قائم کی ہوئی امیدوں کی بنیاد کیسی ریت پر نکلی بشری تدبیر نے خداوندی تقدیر کے مقابلہ میں کس بری طرح شکست کھائی۔ مولانا میرے استاد تھے۔ مقتدا تھے۔ سردار تھے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرے محبوب تھے۔ آہ!! کہ عقیدت۔ عظمت اور محبت تینوں ایک ہی وقت میں کچل کر رہ گئیں۔ تعزیت کا مستحق میں خود ہوں۔ کسی دوسرے سے کیا تعزیت کروں۔ اللہ نے ان کی ذات میں نور حق کی ایک جھلک دکھا دی تھی۔ ولی کامل کا نمونہ اس بیسویں صدی عیسوی میں دکھایا تھا۔

ما شمارا نور مطلق دیدہ ایم
نور مطلق را ہمہ حق دیدہ ایم

دین کے خادم اور بزرگ اور بھی اس وقت اچھے اچھے موجود ہیں۔
پر وہ ایک ہستی ان سے نرالی۔ ان سب سے انوکھی۔ اپنی نظیر
بس آپ تھی۔ عالمِ اسلامی میں اس سے بڑھ کر قیامت خیز حادثہ
اس وقت اور کیا ہو سکتا ہے۔ دنیائے اسلام میں سناٹا ہو گیا۔
وقت کا سب سے بڑا عالم۔ سب سے بڑا عارف محمدؐ کی فوج
کا سب سے بڑا کارگزار اور وفادار جرنیل رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا۔
ہم بدبخت ایسی نعمت کے اہل ہی کب تھے؟ حیرت اس
پر نہیں کہ یہ نعمتِ عظمیٰ اپنے وقت پر واپس لے لی گئی۔ حیرت
اس پر ہے کہ اتنے دنوں ہم میں رہی کیسے؟

ع تو بہارِ عالمِ دیگری زکجا ایں چمن آمدی"

اعترافِ "برہان"

یوں تو ملک کے قریباً تمام مؤقر جرائد نے حضرت تھانوی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مگر ذیل میں ہم صرف ان چند جرائد کی آرا پیش کرتے ہیں جو سیاسی اور مشربی لحاظ سے حضرت تھانویؒ کے مخالف تھے۔ دہلی کے مشہور رسالہ "البرہان" اپنے اگست ۱۹۴۳ء کے شمارہ میں حضرتؒ کے متعلق لکھا کہ:

"یوں تو موت اس عالمِ آب و گل کی ہر اس چیز کے لیے ہی مقدر ہے۔ جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساطِ ہستی پر نمودار ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک کی موت بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ جو صرف وہ افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی عمارتِ حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے۔ جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت و ارادت سے

وابستہ ہوتے ہیں۔ پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہ ہائے اشک سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ہزاروں دلوں کی پرسکون آبادیاں ایک مستقل غم کدۂ آمال وامانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ اُمیدوں اور ولولوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ نشاط و کامرانی حیات کے آتش کدے سرد ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثۂ جانکاہ نے کائناتِ عالم کی ہر چیز کو اداس اور غمگین بنا دیا ہے۔ اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا ؎

وَمَا کان قیسٌ هلکه هلك واحد

قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں ہے

ولکنه بنیان قومٍ تهدّما

بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا جو منہدم ہو گئی

گذشتہ ماہ جولائی کی ۱۹ اور ۲۰ کی درمیانی شب کو تقریباً دس بجے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا جو سانحہ ارتحال پیش آیا وہ اسی قسم کا سانحہ تھا۔ حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے۔ طریقت اور سلوک میں بھی مقامِ رفیع کے مالک تھے۔ ان کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی۔ علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔ تحریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے اور کرتے تھے۔ اور اس میں انھیں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گوشہ نشین تھے۔ مگر ان کا آستانہ بڑے بڑے اربابِ ثروت و دولت اور اصحابِ علم و فضل

کی عقیدت گاہ تھا۔ جو بات اور جو عمل تھا۔ اخلاص اور دیانت کے ساتھ تھا۔ دنیوی وجاہت و شہرت اور مالی حرص آز ما کا خدشہ دل کے آس پاس بھی کہیں گزر نہ ہوا تھا۔ اپنے اصول اور اپنے عقیدہ و خیال پر اس مضبوطی اور پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کر سکتی تھی۔ حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک چشمہ صافی تھا۔ کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب ہو کر جاتے تھے۔ اور جن کی زندگیاں معصیت کوشی اور عصیاں آلودگی میں بسر ہوتی تھیں۔ یہاں سے پاک صاف ہو کر اور گوہر مقصود سے دامانِ آرزو بھر کر واپس لوٹتے تھے۔ ان کی زندگی اتباعِ سنت کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموز طریقت کا دفتر گرانمایہ تھی۔ بعض مسائل میں علماء ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ لیکن تقویٰ و طہارت تفقہ فی الدین شرعی علوم میں مہارت و بصیرت۔ راست گفتاری اور مخلصانہ عمل کوشی۔ انابت الی اللہ۔ بے لوث خدمتِ دین۔ بیغرضانہ تلقینِ رشد و ہدایت۔ حضرت مرحوم کے یہ وہ اوصافِ عالیہ اور فضائلِ حمیدہ تھے۔ جو ہر موافق اور مخالف کے نزدیک برابر مسلم رہے۔ بعض عوارض و اسقام کی بناء پر گوشہ نشین ہونے سے قبل اپنے مواعظِ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ حضرتِ مرحوم نے اصلاح عقائد و اعمال اور ابطالِ رسوم و بدعات کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا واحد طغرائے امتیاز ہے قوم نے ان کو حکیم الامّت کا خطاب دیا۔ اور بالکل بجا دیا تھا۔ حقیقت

یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا کہ جو خزف ریزے تھے۔ وہ گوہرِ آبدار بن گئے اور جو صرف پیتل تھے۔ وہ زرِ خالص ہو گئے۔"

خراج "مدینہ"

حضرت کے مخالف کانگریس کے ترجمان اخبار "مدینہ" بجنور نے یکم اگست ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں لکھا کہ:۔

"حکیم الامّت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے۔ جو اگرچہ اس کارگاہِ ہست و بود میں بالکل فطری ہے۔ لیکن جس پر ماتم کرنے والی آنکھ کبھی خشک نہیں ہو سکتی۔ حکیم ثنائیؒ کے قول کے بموجب ایک مردِ کامل کو پیدا ہونے میں صدیاں نہیں صدیوں سے بھی زیادہ ہی کا زمانہ درکار ہوتا ہے۔ پھر جب ایسا گوہرِ نایاب دنیا کو خوش قسمتی سے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ تو اس کی جدائی جتنی بھی شاق گزرے کم ہے۔ خدا کے فضل سے مولانا تھانوی کی عمر بہت کافی ہوئی۔ اسّی اور نوّے ۹۰ سال کے بیچ عمر کے عدد کا پہنچ جانا آج کل کے بڑا زآلام و امراض زمانہ میں بہت بڑی بات ہے۔ پھر قدرت کی عنایت سے آپ کی صحت بھی اتنی اچھی رہی کہ سینکڑوں ہی کتابیں لکھ ڈالیں۔ لیکن پھر بھی آپ کی جدائی کا تصوّر آنکھوں کو اشکبار ہونے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

دل کے جانے کا شہید کی حادثہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

مولانا کی سیاسی رائے سے ہمیں کبھی اتفاق نہ ہوا۔ لیکن بایں ہمہ مولانا تھانوی ؒ کی علمی برتری اور ان کے طہارت و تقوی کی بلندی کے آگے ہمارا سر نیاز ہمیشہ جھکا رہا۔ مولانا ایک بے مثال فقیہہ تھے۔ ایک عدیم النظیر مفسر تھے۔ بے مثال متکلم اور بلند پایہ محدث تھے پھر خوش قسمتی سے علم و فضل کی اس نعمت کے ساتھ ساتھ تصوف و طریقت کے میدان کے بھی شہسوار تھے۔ آپ کی خانقاہ اس ضلالت و گمراہی کے دور میں طالبانِ حق کے لیے روشنی کا مینارہ تھی۔ آپ کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا دل دشمن سے بھی انتقام کا روادار نہ تھا۔ چنانچہ آپ اپنے مخالفوں کے خلاف شاذ و نادر ہی کبھی کوئی لفظ زبان سے نکالتے تھے۔ آپ کی زندگی باقاعدہ تھی۔ کھانے پینے۔ سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کے تمام اوقات مقرر تھے۔ جن پر سختی سے عمل فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی صحت آخر وقت تک قابلِ رشک طور پر اچھی رہی۔ ان تمام خصوصیات کے پیشِ نظر دعویٰ سے کہا جاسکتا ہے کہ ایسی جامع شخصیت اب دنیا بمشکل ہی پیدا کر سکے گی۔ غرض مولانا کی شخصیت ایک بلند و ممتاز حیثیت کی مالک تھی۔ آپ کے ارادت مندوں کی تعداد ملک میں کافی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس تعداد میں اچھے اچھے علماء و فضلاء اور بڑے بڑے اہل علم و بصیرت لوگ شامل ہیں۔"

سیاسی بصیرت

ایک اور سیاسی جریدہ رقم طراز ہے کہ:۔

"۱۹، ۲۰ جولائی کی درمیانی شب میں مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ ۸۲ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا کی حکمت۔ تقویٰ اور ذہانت نے مسلمانوں کے ہر طبقہ کو متاثر کیا۔ تصنیفات کے اعتبار سے مولانا کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ معاشرت اسلامی پر آپ کی مبسوط کتاب "بہشتی زیور" بہت معروف ہے۔ اس کتاب سے لاکھوں عورتوں کو اسلام کی تعلیمات سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اور عام طور پر طبقہ نسواں کی تعلیم میں اضافہ ہوا۔ خواص کے لیے شرح مثنوی مولانا روم اور بیان القرآن کی جید تصانیف ہمیشہ آپ کی یادگار رہیں گی۔ عام رسائل اور کتابیں اس درجہ مقبول ومطبوع ہوئیں کہ بقولِ ان کتابوں کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ روپے سے کسی صورت میں کم نہیں۔ اس عام مقبولیت کے باوجود کسی ایک کتاب کا حق بھی مولانا نے اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ طبع واشاعت کی عام اجازت رہی۔ اس سے مولانا کے اخلاص اور سیر چشمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تازہ ترین شمار کے مطابق مولانا مرحوم کی کل تصانیف کی تعداد آٹھ سو تین ہے۔ عملی سیاسیات سے اگرچہ مولانا موصوف ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ لیکن سیاسیات میں بصیرت تامہ رکھتے تھے۔ آپ اس کے کبھی مؤید نہیں رہے کہ مسلمان کانگرس میں شریک ہوں اس بنا پر کہ مسلم لیگ بہرحال مسلمانوں کی جماعت ہے۔ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی حامی ہے۔ اسلامی طریقہ پر مسلمانوں کی اصلاح وترقی کی دعویٰ دار ہے آپ اس کے مؤید تھے کہ سیاسی جماعت کے طور پر مسلمانوں کو اس میں شامل ہونا چاہیئے۔"

مولانا واعظ کی حیثیت سے بھی ہندوستان میں بہت مشہور تھے۔ ہندوستان میں وسعت کے ساتھ آپ نے دورے کیے۔ آپ کے وعظوں میں ہزارہا مسلمانوں کا مجمع ہوتا تھا اور وہ متاثر ہو کر جاتے تھے۔ آپ کے مریدین کی تعداد بہت کثیر ہے۔ تحریر و تقریر اور ذاتی مثال کے ذریعہ چودھویں صدی کے اس نصف اول میں آپ نے وسعت کے ساتھ اسلامیت کی تبلیغ فرمائی۔ کہن سالی اور ضعف کے باوجود آخر وقت تک آپ مسلمانوں کی خدمت میں مصروف رہے۔ ذاتی حیثیت سے تقوی اور عمل کے معاملہ میں آپ کا خاص مرتبہ تھا۔ اس کے باوجود کہ مولانا نے پوری عمر پائی۔ لیکن پھر بھی افسوس ہے کہ یہ شمع علم و ہدایت بجھ گئی۔ اور مسلمانوں کی محفل سونی ہو گئی"۔

حرف آخر

غرضیکہ بطور اعترافِ حقیقت اس آفتابِ علم کے غروب ہونے پر جرائد و دفتر نے جس قدر مقالے لکھے اور بیان دیئے۔ ان کے لیے ایک الگ دفتر کی ضرورت ہے۔ جس ہستی کی ہر ساعت اعلائے کلمۃ الحق میں گزری ہو۔ جس کا ہر نفس احیائے سنت اور تبلیغ شریعت میں صرف ہوا ہو۔ اس کی خدمت کا کیا اندازہ اور شمار ہو سکتا ہے۔

وصفِ او ہرگز نیاید در کلام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

ماخذات

سیرت ہذا کی تیاری کے سلسلہ میں حسب ذیل کتب سے امداد لی گئی ہے۔

(ا)

۱۔ اشرف السوانح ہر سہ حصہ	خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ
۲۔ خاتمۃ السوانح	״
۳۔ حسن العزیز	״
۴۔ حکیم الامت	مولانا عبدالماجد دریابادی
۵۔ سفرنامہ پاکستان	״
۶۔ حیاتِ اشرف	مسٹر غلام محمد عثمانیہ
۷۔ طبقاتِ کبریٰ	شیخ ابومدین مغربی
۸۔ فتوحات	شیخ ابن عربیؒ
۹۔ انوار القلوب	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
۱۰۔ الاعتدال فی مراتب الرجال	مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ
۱۱۔ جامع المجددین	مولانا عبدالباری ندویؒ
۱۲۔ تجدید تصوف وسلوک	״
۱۳۔ یادِ رفتگاں	مولانا سید سلیمان ندویؒ
۱۴۔ مکتوبات امدادیہ	مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

۱۵- المہند علی المفند	مولانا خلیل احمد مہاجر مدنیؒ
۱۶- الشہاب الثاقب	مولانا حسین احمد مدنی
۱۷- نقش حیات	"
۱۸- ہزار سال پہلے	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۱۹- وقایۃ المسلمین	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
۲۰- آداب الشیخ والمرید	"
۲۱- افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ	"
۲۲- اشرف الافادات "	مولانا عبدالاحد سورتی
۲۳- کمالاتِ اشرفیہ	مولانا محمد عیسٰے الہ آبادی
۲۴- معمولاتِ اشرفیہ	منشی علی محمد لاہوری
۲۵- اشرف المعمولات	"
۲۶- تالیفات اشرفیہ	مولوی عبدالحق فتحپوری ہسوی
۲۷- مزید المجید	مولانا عبدالمجید بچھڑایونی
۲۸- آثارِ رحمت	مولانا جلیل احمد علی گڑھی
۲۹- القول الجلیل	"
۳۰- بزمِ جمشید	مولانا وصل گرامی
۳۱- ارمغانِ جاوداں	"
۳۲- معمولاتِ سفر	مولانا حکیم محمد مصطفٰے بجنوری
۳۳- حسام الحرمین	مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ
۳۴- "معارف" سلیمان نمبر	مولانا شاہ معین الدین
۳۵- حرف اقبال	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

۳۶۔ ملفوظاتِ اقبال — مسٹر محمود نظامی

۳۷۔ حیاتِ قائدِ اعظمؒ — چوہدری سردار محمد

۳۸۔ مشاہداتِ واردات — مؤلف سیرت ہذا

۳۹۔ تعمیرِ پاکستان اور علما ربانی — ”

۴۰۔ ملفوظات — حافظ صغیر احمد مظفر نگری

۴۱۔ کلمۃ الحق — حکیم عبد الحق کوٹی

۴۲۔ امپیریل گزٹ

.....

(۲)

متذکرہ صدر کتب کے علاوہ صاحبِ سیرت حضرت تھانویؒ کی مندرجہ ذیل تصنیفات و تالیفات و خطبات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۴۳۔ نشر الطیب

۴۴۔ حیات المسلمین

۴۵۔ معاملۃ المسلمین

۴۶۔ صیانۃ المسلمین

۴۷۔ بوادر النوادر

۴۸۔ قصد السبیل

۴۹۔ تعلیم الدین

۵۰۔ زادِ السعید

۵۱۔ آدابِ معاشرت

۵۲۔ اصلاح انقلاب

۵۳۔ اصلاح الخیال

۵۴۔ موائد العوائد

۵۵۔ الصدق الرویا

۵۶۔ خوانِ خلیل

۵۷۔ ذکرِ محمودؒ

۵۸۔ حفظ الایمان

۵۹۔ بسط البنان

۶۰۔ حکایات الشکایات

۶۱۔ الافاضات الیومیہ

۶۲۔ مقالاتِ حکمت

۶۳۔ خبر العبود
۶۴۔ الحج المبرور
۶۵۔ ہفت اختر
۶۶۔ راحت القلوب
۶۷۔ تجارتِ آخرت
۶۸۔ کلمۃ الحق
۶۹۔ ملتِ ابراہیم
۷۰۔ حقیقتِ تصوف
۷۱۔ دعواتِ عبدیت
۷۲۔ الاسعاد والابعاد
۷۳۔ ذم النسیان
۷۴۔ ایوار الیتامی
۷۵۔ مواعظ تبلیغ
۷۶۔ مواعظِ اشرفیہ
۷۷۔ التشرف
۷۸۔ الباطن
۷۹۔ الاسراف
۸۰۔ الخضوع

نشانِ حیدر ——— از میاں محمد مسعود الزمان

افواجِ پاکستان کا سب سے بڑا اور اعلیٰ اعزاز "نشانِ حیدر" پانے والے اُن جیالے اور بہادر جوانوں کی داستانِ حیات، جنھوں نے سرزمینِ پاک کی حفاظت میں اپنی جانیں جان آفرین کے سپرد کر دیں اور اپنے لہو سے پاک سرزمین کی آبیاری کی۔

تلاشِ حق

محمد بخش خان مرحوم کی بے مثال تحقیق اور اپنے موضوع پر لافانی کتاب جس میں عقیدہ کی صحیح تلاش اور عقائد کی بحث تاریخی حوالوں سے کی گئی ہے۔

حدیثِ دل ——— از ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان

یہ بدیہی ہے کہ موجودہ دَور سائنس کا دَور ہے۔ مغرب کی حیرت انگیز ترقی زیادہ تر سائنسی علوم کی ترقی سے عبارت ہے۔ نت نئی ایجادوں نے زمان و مکان کی طنابیں کھینچ لی ہیں۔ اور اس کرہ ارض کے ہر حصہ کو اُس کے دُوسرے حصوں سے مربُوط کر دیا ہے۔ عہدِ حاضر نے بحر و بر کو مسخر کر کے اب فضائے بیکراں کو بھی مکمل طور پر زیرِ نگیں کرنے کی ٹھانی ہے۔ جوہری توانائی کی وسعتوں کو احاطہ کر لینے کا حوصلہ بھی انسان میں بیدار ہو چکا ہے، لیکن ـــــ

① کیا مشینوں کی اس افراط میں ستاروں کی گذرگاہوں کا پتہ چلانے والے انسان نے اپنی منزل کا نشان بھی پایا ہے؟
② درخشندہ فلزات کے انباروں اور برق و بخارات کے کرشموں کے درمیان کیا انسانی رُوح ساکت و صامت مگر بے چین نظر نہیں آتی؟
③ زمانہ حال میں دُنیا جس عالمی بے چینی و اضطراب میں گرفتار ہے۔ ان کا حل کیا ہے؟
④ زندگی کی وہ راہیں جو فوز و فلاح کی منزل تک پہنچاتی ہیں۔ کیا ہیں؟
⑤ زندگی کی تاریک راہوں کو منور کرنے والی بلند اقدار کیا ہیں؟
⑥ قومی امراض جن میں اس وقت ساری قوم مبتلا ہے۔ ان کا مؤثر علاج کیا ہے؟
⑦ روزمرہ کے نئے مسائل و مشکلات کو سلجھانے کا ایسا طریقہ کونسا ہے جس سے شریعت کا رُوپ اور دین کی رُوح برقرار رہے۔
⑧ پاکستان کو معرضِ وجود میں لانے کا باعث کون سے اسباب و علل ہیں؟
⑨ پاکستان کی تعمیرِ نو اور اُس کی بقا و سلامتی کے لیے کن اسلامی اصولوں کو اختیار کرنا اشد ضروری ہے؟

ایک مُسلمان کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ہر مشکل کا حل ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں تلاش کرے۔ ہمارا دین زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ ہمارا مذہب ذات ایزدی سے محض ایک شخصی اور انفرادی تعلق سے عبارت نہیں، بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے۔

جناب ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان صاحب ریٹائرڈ جج سپریم کورٹ پاکستان کے علمی و ادبی اور اسلامی مجالس میں دیئے گئے مختلف خطبات کا حسین مجمُوعہ جو اہلِ فکر و نظر کے لیے جدید علوم و فنون اور اسلامی حقائق و معارف پر ایک معرکۃ الآرا پیش کش ہے اور جن کی ترتیب و تہذیب صاحبِ نظر روشناس قلم منشی عبدالرحمان خان نے جدید عصری تقاضوں کے مطابق کی ہے۔

کتابت دل آویز، طباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ، مضبُوط جلد بندی اور حسین گرد پوش سے آراستہ و پیراستہ ایک منفرد کتاب۔

تعمیرِ پاکستان اور عُلمائے ربّانی ——— از، منشی عبدالرحمان خان

"قومی اعزاز کی حامل ایک لاجواب کتاب"

- جواز و محرکات پاکستان کیا ہیں نیز تجویز و خاکہ پاکستان پہلے کس نے پیش کیا؟
- کن عُلمائے کرام نے قائدِ اعظم اور مُسلم لیگ کی دینی رہنمائی فرمائی؟
- مُسلم لیگ نے کیا راہِ عمل اختیار کیا اور پاکستان کی نشاۃ ثانیہ کو کیوں اپنی منزل قرار دیا؟
- مقام قائدِ اعظم کیا ہے نیز قائدِ اعظم نے کس کو خراج عقیدت پیش کیا؟
- تعمیرِ پاکستان میں کن کن علماء و اکابرین نے حصہ لیا اور کن لوگوں نے مخالفت کی؟
- دستورِ پاکستان کا خاکہ کیا تھا؟ تدوینِ آئین میں قائدِ اعظم کی مدد کن علماءِ کرام نے کی نیز علماءِ کرام کو اس مسئلہ میں کن کن مشکلات و مصائب سے دوچار ہونا پڑا؟

کردارِ قائدِ اعظم (منشی عبدالرحمان خان)

معمارِ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے کون واقف نہیں۔ آپ نے جس لگن، محنت، دیانتداری اور اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دن رات پاکستان کی تعمیر میں اپنی جان قربان کر دی۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اُسی "بانیٔ پاکستان" کے "قول و کردار" کے متعلق حسن ترتیب سے جمع کردہ بے شمار بصیرت افروز ایسی معلومات جو آپکو کسی اور کتاب میں بھی نہیں ملیں گی، بلکہ ایسے حالات اس کتاب میں بھی موجود نہیں ہیں جو سرکاری طور پر دو لاکھ تینتالیس ہزار روپیہ کی لاگت کے عوض "مسٹر بولیتھو" سے لکھوائی گئی۔

بے شمار چونکا دینے والے ایسے واقعات پر مشتمل ایک حسین و لاجواب مجموعہ جو پہلی دفعہ منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ دلکش کتابت و طباعت۔ خوبصورت سنہری ڈائیدار مضبوط جلد سے مزین ایک یادگار کتاب

جہاد کی طرف ایک قدم (سارجنٹ اقبال محمد دیوانہ)

درسِ قرآن اگر ہم نے نہ بھلایا ہوتا
یہ زمانہ نہ زمانے نے دکھلایا ہوتا

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنی نوعیت کی لاجواب کتاب ہے جس میں مسکہ جہاد فی الفکر دوستی و دشمنی بالکفر، جہاد فی النفس و جسم، جہاد فی التمدن، کردار مجاہد، مومن کیلئے اللہ کی خوشخبری، شہدائے کرام کے درجات اور جہاد کے بارے میں مختلف دعاؤں کا ذکر و اہمیت جیسے موضوعات کو قرآن مجید اور احادیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بالصراحت پیش کیا گیا ہے۔

اقبال محمد دیوانہ سارجنٹ (ریٹائرڈ) پاکستان ایئر فورس کی ذہنی فکر اور علمی کاوش کا نادر نمونہ۔ اعلیٰ کتابت و طباعت سے مزین۔

احکامِ قرآنی (منشی عبدالرحمان خان)

۱۔ اخلاقِ حسنہ کسے کہتے ہیں؟
۲۔ معاشرہ کیا ہے؟ اور آج کے زمانہ میں انسان کی معاشرت کیا ہونا چاہیئے؟
۳۔ عبادات کسے کہتے ہیں اور ان کی ادائیگی کا صحیح طریقہ کیا ہے؟
۴۔ تمدن کسے کہتے ہیں اور باہمی لین دین کیسے ہونا چاہیئے؟
۵۔ سیاست کسے کہتے ہیں اور کسی ملک کا دستورِ حیات کیا ہونا چاہیئے؟

ان تمام باتوں کے جواب کے لیے منشی عبدالرحمان خان صاحب روشناس قلم کے بہترین علمی شہ پارے "احکامِ قرآنی" کا مطالعہ کیجئے۔

جس میں قرآن پاک کے ایسے احکام کو اختصار و خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو ہر انسان کے لیے دستورِ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن پر اخلاق و آداب، معاملات، عبادات، معاشرت، سیاست، تمدن اور انتظام سلطنت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اپنی نوعیت کی منفرد اور لاجواب کتاب جو حسین گرد پوش، اعلیٰ کتابت و طباعت اور مضبوط جلد بندی سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

معمارانِ پاکستان (منشی عبدالرحمان خان)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شروع سے متحدہ ہندوستان میں مخاصمت و مخالفت چلے آ رہے تھے۔ کیونکہ ہندو بت پرست تھے اور مسلمان بت شکن تھے۔ ہندو گائے کو معبود سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے اور مسلمان اسے کاٹ کر کھا جاتے تھے۔ ہندو اچھوتوں کو انسانیت سے خارج سمجھتے تھے اور مسلمان انھیں دائرہ اسلام میں آنے کے بعد سینے سے لگا لیتے تھے۔ آئے دن کے ان فسادات کو ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے ۱۱۹۲ء میں سلطان محمد غوری نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی جسے ہندوؤں نے تسلیم نہ کرنے کی سزا بھگتی۔ اس کے بعد ۱۷۰۷ء سے ۱۹۳۰ء تک مختلف اکابرین علمائے ہند اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اس گاڑی کو چلاتے رہے۔ ان کے بعد مسلم لیگ نے حضرت قائدِ اعظمؒ کی زیرِ قیادت اس گاڑی کو منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ اس طرح تقریباً دو سو سال کی جد و جہد کے بعد "پاکستان" کا "تاج محل" تیار ہوا۔ اس کی تعمیر میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر حضرت قائدِ اعظمؒ تک جن اکابرین نے بنیادی کام کیا اور اپنے فکر و عمل سے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ ان کے نظریات اور ان کی پاکیزہ سیرت و کردار کو ایسے دل نشیں انداز میں "منشی عبدالرحمان خان صاحب" نے پیش کیا ہے کہ یہ کتاب ہمارے لیے چراغِ راہ کی حیثیت اختیار کر گئی۔

خوبصورت کتابت و طباعت، مضبوط سنہری ڈائیدار جلد سے آراستہ و پیراستہ۔

ہماری مطبوعات

مآثرِ عالمگیری	محمد ساقی مستعد خان ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب
سیرتِ اشرف حصہ اوّل	منشی عبدالرحمٰن خان
" " " دوم	"
معمارانِ پاکستان	"
کردار قائدِ اعظم	"
نقوش قائدِ اعظم	پروفیسر رحیم بخش شاہین
تعمیرِ پاکستان اور علماءِ ربانی	منشی عبدالرحمٰن خان
تلاشِ حق	محمد بخش بلوچ
کشف المحجوب	داتا گنج بخشؒ ترجمہ ابوالحسنات قادری
حدیثِ دل	جسٹس ایس اے رحمان
تعارفِ قرآنی	منشی عبدالرحمٰن خان
بصائرِ قرآنی	"
احکامِ قرآنی	"
تذکرۃ الاولیاء	فرید الدین عطار
یہ تیرے مومن بندے	محمد اقبال قادری
نشانِ حیدر	محمد مسعود الزمان
حبیبِ خداؐ	مولانا اشرف علی تھانوی
ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد
بنات النعش	"
توبۃ النصوح	"
مراۃ العروس	"
فسانہ مبتلا	"
حقیقتوں کے چراغ	منشی عبدالرحمٰن خان
تذکرہ	ابوالکلام آزاد
ذوالقرنین	"
مساجدِ [illegible]	
فضائلِ رمضان المبارک	
عورت انسانیت کے آئینہ میں	منشی عبدالرحمٰن خان
جہاد کی طرف ایک قدم	محمد اقبال

مواعظِ اشرفیہ (تیس جلدوں میں)

از: مولانا اشرف علی تھانوی

ترتیبِ نو: منشی عبدالرحمٰن خان

۱- دُنیا و آخرت	۲- علم و عمل	۳- دین و دُنیا
۴- حقوق و فرائض	۵- عیدِ میلاد النبیؐ	۶- نظامِ شریعت
۷- حقیقتِ عبادت	۸- حقیقتِ مال و جاہ	۹- فضائلِ صبر و شکر
۱۰- فضائلِ صوم و صلوٰۃ	۱۱- تصوّف و تقویٰ	۱۲- تسلیم و رضا
۱۳- اصلاحِ اعمال	۱۴- برکاتِ رمضان	۱۵- محاسنِ اسلام
۱۶- حدود و قیود	۱۷- اصلاحِ باطن	۱۸- موت و حیات
۱۹- جزا و سزا	۲۰- آدابِ انسانیت	۲۱- سُنّتِ ابراہیمؑ
۲۲- ذکر و فکر	۲۳- آدابِ دین	۲۴- فضائلِ علم
۲۵- تدبیر و توکل	۲۶- حقوق الزوجین	۲۷- مفاسدِ گناہ
۲۸- راہِ نجات	۲۹- زیرِ ترتیب	۳۰- زیرِ ترتیب

مدحت	عاصی کرنالی
اصحابِ بدر	محمد سلیمان منصور پوری
ولادتِ نبویؐ	ابوالکلام آزاد
آدابِ علم و اخلاق	منشی عبدالرحمٰن خان
آدابِ حقوق العبادات	"
عورتوں کی آزادی و فرائض	ابوالکلام آزاد
کاروان خیال	"
میں کون ہوں	امام غزالیؒ
معجزاتِ انبیاء	امام ابن حلبیؒ
حکایات و اقوال گنج بخشؒ	محمد جاوید
مقدمۃ القرآن	عزیز الحسن بقائی
مسدس حالی	خواجہ الطاف حسین حالی
شکوہ جواب شکوہ	علامہ محمد اقبال
مشعلِ نبوت	ایاز احمد